بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

نومبر 2020

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

واٹس ایپ

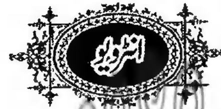
0317 2266944

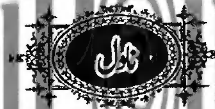
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

MEMBER APNS CPNE




انٹرویو


ناول


مکمل ناول


ناولٹ


افسانے


نظمیں غزلیں





نومبر 2020
جلد 35 شمارہ 03
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا -

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی شعاع

نومبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
اسلامی کیلنڈر کے تیسرے مہینے ربیع الاول کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس ماہ مبارک میں کائنات کی افضل ترین ہستی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے۔
نبی آخرالزماں خاتم الانبیاء جن کا ذکر خود خالق ارض وسما نے بلند کیا جن کا نام اور تعلیمات ساڑھے چودہ سو سال سے دہر میں اجالا کر رہی ہیں، ان کی رفعتوں کا کیا شمار ہو سکتا ہے۔
ربیع الاول کا آغاز ہوتے ہی گھر، گلی، محلوں اور بازاروں میں روشنیاں جگمگانے لگتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال صفات کے بیان اور آپ کی مدح کے لیے گھر گھر محفلیں منعقد کی جاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے اظہار کے لیے جلسے، جلوس نکالے جاتے ہیں۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا صرف یہ اظہار کافی نہیں۔ ان تعلیمات پر بھی غور کریں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو کسی خاص خطے، قوم یا زبان والوں کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ آپ کو تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے نور سے پوری انسانیت منور ہوئی۔
دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔

نورالقلوب

''شہر تمنا'' اختتام کو پہنچا۔ اس ماہ سے بہن تنزیلہ ریاض کا ناول ''نورالقلوب'' شروع کیا جا رہا ہے۔
تنزیلہ ریاض نے جب بھی لکھا، قارئین کو چونکایا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی تحریروں کے فکر انگیز موضوعات اور حقیقت پسندی ہے، ان کی کہانیوں میں زندگی مختلف شکلوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کہانی اپنے فطری بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ ان کے کردار فرشتہ یا شیطان نہیں انسان ہوتے ہیں۔ تنزیلہ زندگی کی حقیقتوں سے پردہ کشائی کرتے ہوئے ان کا تجزیہ بھی کرتی ہیں اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے کہ وہ کہیں بھی انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوتیں، نہ ہی کہانی میں دلچسپی کا عنصر کم ہوتا ہے۔
ناول کی پہلی قسط پڑھ کر ہمیں ضرور بتائیے گا کہ آپ اس کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہیں۔

اس شمارے میں

☆ صدف ریحان گیلانی کا مکمل ناول......عناد۔ ☆ نعیمہ ناز کے ناول ''شہر تمنا'' کی آخری قسط۔
☆ رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے ناول۔ ☆ فرح بخاری کے ناولٹ ''وہ نازنین'' کی آخری قسط۔
☆ میمونہ صدف کا ناولٹ......قوام۔
☆ شازیہ جمال طارق، عندلیب زہرا اور نور نظر کے افسانے۔
☆ ماڈل اور اداکارہ......اذیکا ڈینیل سے ملاقات۔ ☆ معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ......دستک۔
☆ بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا......آمنہ زرین کا تبصرہ۔
☆ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں......احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ۔
☆ خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔



حمد باری تعالیٰ

اے ربِ سموٰت تیری ذات ورا ہے
ہیبت سے تیری کوہ گراں کانپ رہا ہے

انسان بے چارہ تجھے کیا جان سکے گا
ادراک کی دُنیا میں تجھے ڈھونڈ رہا ہے

ہیں تیرے ہی انداز غریبی و امیری
دیتا ہے کبھی اور کبھی مانگ رہا ہے

معلوم ہے اتنا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم
جانا ہے کہ کیا جانے گا جو جان گیا ہے

ہر سمت ہے وجہُ اللہ عیاں خالقِ احسن
خود آئینہ خود دیدۂ حیران ہوا ہے

واصف علی واصف



نعت رسولِ مقبولؐ

آئینہ در آئینہ ہے سلسلہ در سلسلہ
نورِ حق جلوہ نما ہے سلسلہ در سلسلہ

ہر کتابِ آسمانی اور صحیفوں میں شہا
آپؐ ہی کا تذکرہ ہے سلسلہ در سلسلہ

اس کی ضو میں منعکس ہے نورِ ختم المرسلین
جو دیا اب تک جلا ہے سلسلہ در سلسلہ

جز تمہارے اے شہہ دنیا و دیں کونین میں
کون محبوبِ خدا ہے سلسلہ در سلسلہ

کیوں نہ ہو بادِ صبا کی ہمسفر خوشبوئے آل
جب درودوں کی صدا ہے سلسلہ در سلسلہ

احمد خیال

ادارہ

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی ان پر درود اور سلام بھیجو۔" (الاحزاب۔56)

فائدہ آیت: صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف ہو تو معنی ہیں۔ رحمت و کرم فرشتوں کی طرف ہو تو استغفار اور انسانوں کی طرف ہو تو دعا کرنا۔ اس میں مسلمانوں کو صلاۃ اور سلام دونوں کا حکم دیا گیا ہے۔

درود

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔" (مسلم)

فائدہ: درود پڑھنے کا مطلب اللھم صلی علی محمد آخر تک پڑھنا ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رحمت اور درجات کی بلندی کی دعا ہے جس کی بڑی فضیلت ہے۔ اس حدیث سے بھی اس کی فضیلت واضح ہے۔

سب سے قریب

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قیامت والے دن میرے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو لوگوں میں سے مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھنے والا ہوگا۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ: سب سے زیادہ قریب کا مطلب، میری شفاعت کا سب سے زیادہ حق دار ہے۔ اس میں بھی کثرت سے درود پڑھنے کی ترغیب ہے۔

افضل دن

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے، چنانچہ تم اس میں کثرت سے مجھ پر درود پڑھا کرو، اس لیے کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا۔"

صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارا درود کس طرح پیش کیا جائے گا جب کہ آپ کا جسم بوسیدہ ہو چکا ہوگا؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہ السلام کے (مبارک) جسموں کو زمین پر حرام کر دیا ہے۔" (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ جسموں کے زمین پر حرام ہونے کا مطلب ہے کہ زمین ان کو نہیں کھاتی اور ان کے جسم بوسیدہ نہیں ہوتے۔

2۔ درود پیش کیے جانے کا مطلب ہے کہ فرشتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک درود پہنچاتے ہیں جیسا کہ دوسری احادیث میں صراحت ہے۔ علاوہ ازیں اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی روح بھی لوٹائی جاتی ہے اور آپ اس کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔

ذلیل و خوار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اس آدمی کی ناک خاک آلود ہو جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل:

ناک خاک آلود ہو، کنایہ ہے ذلت و حقارت سے، یعنی ایسا شخص ذلیل و خوار ہو کہ میرا نام سنے اور پھر درود نہ پڑھے۔

جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر صرف انگوٹھا چوم لیتے ہیں، وہ بھی اس کی زد میں آسکتے ہیں کیونکہ وہ درود نہیں پڑھتے جب کہ حکم درود پڑھنے کا ہے اور انگوٹھا چومنے کا حکم کسی صحیح حدیث میں بیان نہیں ہوا۔ بعض علماء کے نزدیک درود پڑھنے کا یہ حکم وجوب پر محمول ہے اور بعض کے نزدیک استحباب پر۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''تم میری قبر کو عید (میلہ گاہ) مت بناؤ اور مجھ پر درود پڑھو، اس لیے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، تمہارا درود مجھے پہنچ جاتا ہے۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فوائد و مسائل:

عید مت بناؤ کا مطلب، عید کی طرح میری قبر پر اجتماع نہ کرو، جیسے عموماً قبروں پر سالانہ میلے وغیرہ ہوتے ہیں۔

بعض لوگ اس حدیث میں معنوی تحریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ہے کہ تم عید کی طرح میری قبر پر نہ آیا کرو بلکہ جلدی جلدی اور ہر وقت آیا کرو۔ لیکن اس کا مفہوم یہی ہے کہ میری قبر پر جمع ہونے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے تم عید کے موقع پر جمع ہوتے ہو۔ اگلے جملے سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ جمع ہونے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ تم جہاں کہیں سے بھی درود پڑھو گے، مجھے فرشتوں کے ذریعے سے پہنچ جائے گا۔

زندہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ میں اسے جواب دیتا ہوں۔'' (اسے ابوداؤد نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ:

جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح لوٹا دیتا ہے تو ہمیں صرف اس حقیقت پر ایمان رکھنا چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی کیفیت و نوعیت کیا ہے؟ ہمیں اس کا علم نہیں ہے نہ ہی ہو۔ اس ردِ روح کو بھی ان متشابہات میں سے سمجھنا چاہیے جن پر ایمان رکھنا تو ضروری ہے لیکن ان کی پوری حقیقت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ بہر حال اس حدیث میں کثرت سے درود و سلام پڑھنے کی ترغیب ہے تاکہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے زیادہ سے زیادہ بہرہ ور ہوں۔ یہ یقیناً ایک بہت بڑی سعادت ہے جو ہر مسلمان کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بخیل

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ بخل کا مطلب ہے کہ مستحق کو اس کا حق نہ دیا جائے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے لیے دین و دنیا کی سعادت کا ذریعہ ہیں تو ضروری ہے کہ ہر مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں

درود وسلام کی سوغات بھیجتا رہے۔ بالخصوص جب کہ ایسا کرنے میں کچھ خرچ بھی نہیں ہوتا، نہ زیادہ محنت و مشقت ہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سن کر درود نہیں پڑھتا تو یہ شخص یقیناً بخیل ہے۔

2۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر درود پڑھنا چاہیے اور اس کے لیے صلی اللہ علیہ وسلم کہہ لینا بھی کافی ہے کیونکہ اس مختصر سے جملے میں درود اور سلام دونوں موجود ہیں۔

دعا

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو نماز میں دعا مانگتے ہوئے سنا جب کہ اس نے اللہ کی حمد بیان کی نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اس نے جلد بازی کی ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور اس سے یا کسی اور شخص سے (راوی کو شک ہے) فرمایا۔

''جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھے (اور دعا مانگے) تو اسے چاہیے کہ پہلے اپنے رب کی حمد و ثنا کرے، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھے اور پھر اس کے بعد جو چاہے دعا مانگے۔'' (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ:

فی صلاۃ (نماز میں دعا مانگتے ہوئے) کا مطلب ہے کہ نماز کے بعد یا نماز کے آخر میں دعا مانگتے ہوئے سنا۔ ''جب نماز پڑھ کر فارغ ہو جائے اور دعا مانگنے لگے'' یا نماز کے آخری تشہد میں بیٹھ جائے کیونکہ سلام پھیرنے سے قبل تشہد و درود کے بعد بھی دعا مانگنی جائز ہے بلکہ بعض دعائیں پڑھنے کا حکم ہے۔ بہر حال دعا مانگنے سے پہلے حمد و ثنا اور درود پڑھنا ضروری ہے۔

سلام

حضرت ابو محمد کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے تو ہم نے عرض کیا۔

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام پڑھنے کا طریقہ جان لیا ہے، ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود کیسے بھیجیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ پڑھا کرو۔'' ترجمہ۔

''اے اللہ! محمد اور آل محمد پر رحمت نازل فرما، جس طرح تو نے آل ابراہیم پر رحمت نازل کی۔ بے شک تو تعریف کے لائق اور بزرگی والا ہے۔ اے اللہ! محمد اور آل محمد پر برکت نازل فرما، جیسے تو نے آل ابراہیم پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو تعریف کے قابل اور شرف و مجد کا مالک ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کے جس سلام کے پڑھنے کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ سلام ہے جو التحیات میں السلام علیک ایھا النبی پڑھا جاتا ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور حکم ہی سے صحابہ نماز میں پڑھا کرتے تھے۔ جب اللہ نے قرآن کریم میں اہل ایمان کو حکم فرمایا کہ تم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام پڑھو تو ان کے ذہن میں آیا، سلام تو ہم پڑھ لیتے ہیں لیکن درود کون سا پڑھیں۔ آپ نے اس حدیث میں اس کی وضاحت فرما دی۔ گویا حکم قرآنی ہر نماز میں مکمل ہو جاتا ہے اور ایک مسلمان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور سلام دونوں پڑھ لیتا ہے۔

درود

حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہمارے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے جبکہ ہم سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ بشیر بن سعد نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔

''اے اللہ کے رسول ! اللہ نے ہمیں آپ پر درود پڑھنے کا حکم دیا ہے، تو ہم آپ پر کیسے درود پڑھیں؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ ہم نے آرزو کی کہ بشیر بن سعد آپ سے سوال ہی نہ کرتے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ پڑھا کرو: ترجمہ۔

اے اللہ! محمد اور آل محمد پر رحمت نازل فرما، جیسے تو نے آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی۔ اور محمد اور آل محمد پر برکت نازل فرما، جیسے تو نے آل ابراہیم پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو تعریف کے لائق اور بزرگی والا ہے۔ اور سلام (اسی طرح پڑھنا ہے) جیسے تم جانتے ہو۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرما دی ہے کہ سلام کا طریقہ وہی ہے جو پہلے جانتے ہو کیونکہ وہ میرا ہی بتلایا اور سکھلایا ہوا ہے اور وہ ہے التحیات میں السلام علیک ایھا النبی۔

2۔ آل سے مراد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم اور وہ اہل قرابت ہیں جو بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب میں سے مسلمان ہوئے اور بعض کے نزدیک یہ عام ہے اور اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام پیروکار شامل ہیں۔

3۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس بات کا علم نہ ہو، وہ اہل علم سے پوچھ لی جائے۔ اپنی طرف سے کوئی بات اور طریقہ نہ گھڑا جائے۔ اور اہل علم سے مراد بھی وہ اہل علم ہیں جو قرآن و حدیث کے علوم سے بہرہ ور ہوں اور وہ دین سے متعلق سوالات کا جواب قرآن و حدیث سے دیں، نہ کہ محض اپنی سمجھ یا دوسروں کے اقوال سے۔

درود

حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ صحابہ نے پوچھا:

''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپ پر درود کیسے پڑھیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''یہ پڑھا کرو: اے اللہ! محمد اور آپ کی ازواج اور اولاد پر رحمت نازل فرما، جیسے تو نے آل ابراہیم پر رحمت نازل فرمائی۔ اور محمد اور آپ کی ازواج اور اولاد پر برکت نازل فرما، جیسے تو نے آل ابراہیم پر برکت نازل فرمائی۔ بے شک تو تعریف کے قابل اور بزرگی والا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ ازواج، زوج کی جمع ہے، بمعنی جوڑا۔ اسی لیے عربی میں مذکر اور مونث دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ مرد، عورت کا زوج ہے اور عورت، مرد کی زوج ہے۔ بہر حال یہاں اس سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں ہیں۔

2۔ اس حدیث سے پتا چلتا ہے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہما بھی آل میں شامل ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آل ــ میں آپ کی اولاد اور پھر ان کی اولاد شامل ہے۔ بہر حال آپ کی ازواج اور ذریت بھی آپ کی آل میں شامل ہے۔

☆☆☆

کتاب الاذکار

ذکر و اذکار کا بیان

ذکر کی فضیلت اور اس کی ترغیب کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اور اللہ کا ذکر ہر چیز سے بڑا (افضل) ہے۔'' (العنکبوت 45)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد کروں گا۔'' (البقرۃ 152)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

''اپنے رب کو اپنے جی میں صبح و شام گڑگڑاتے ہوئے اور ڈرتے ہوئے یاد کرو، نہ کہ اونچی آواز سے

اور غافلوں میں سے مت ہو۔" (الاعراف 205)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔" (الجمعۃ 10)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں" اللہ تعالیٰ کے اس قول تک کہ "اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔" (الاحزاب 35)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔" (الاحزاب 41-42)

فائدہ آیات:

ان تمام مذکورہ آیات میں اللہ کے ذکر کی تاکید اور حکم ہے۔ ذکر سے مراد ایسے اعمال کی پابندی ہے جن کو اللہ نے انسان کے لیے ضروری قرار دیا ہے یا جن سے اس کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبانی بھی ہے، جیسے اللہ کی تسبیح و تحمید اور اس کی جلالت و عظمت کا ذکر۔ یہ ذکر دل سے بھی ہوتا ہے، یعنی انسان کائنات کے ذرے ذرے میں پھیلی ہوئی ان نشانیوں اور دلائل پر غور و فکر کرے جن سے اللہ کی ذات و صفات کی معرفت اور ان کا ادراک حاصل ہوتا ہے اور یہ ذکر اعضا کے ذریعے سے بھی ہوتا ہے، جیسے انسان اللہ کی اطاعت میں اپنے آپ کو مشغول رکھے، نماز پڑھے، روزے رکھے، حج کرے، زکوٰۃ دے، صدقہ و خیرات کرے وغیرہ۔

سب سے محبوب

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے۔

"سبحان اللہ، والحمدللہ، ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔"

کہنا ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔" (مسلم)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ یہ کلمات جن میں اللہ کی تسبیح و تحمید اور اس کی عظمت و توحید کا بیان ہے، دنیا بھر کی چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں کیونکہ یہ باقیات صالحات میں سے ہیں، ان کا اجر و ثواب ملے گا، جب کہ دنیا اپنے تمام ساز و سامان سمیت فنا سے دوچار ہو جائے گی۔ اس لیے باقی رہنے والی چیز ہی اس لائق ہے کہ انسان اس سے محبت کرے اور اس کو فانی چیزوں پر ترجیح دے۔

سو بار

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جو شخص دن میں سو مرتبہ یہ کلمات کہے۔

لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، لہ الملک ولہ الحمد وھو علی کل شئی قدیر۔

"ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ بادشاہی اسی کی ہے۔ اور تمام تعریفات اسی کے لیے ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

اسے دس غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا، اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کی سو برائیاں مٹا دی جائیں گی۔ اور یہ کلمات اس کے لیے اس دن شام تک شیطان سے بچاؤ کا ذریعہ ہوں گے۔ اور (قیامت والے دن) کوئی شخص اس سے زیادہ فضیلت والا عمل لے کر حاضر نہیں ہوگا، سوائے اس شخص کے جس نے اس سے زیادہ یہ عمل کیا ہوگا۔"

اور (ایک اور حدیث میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے ایک دن میں سو مرتبہ یہ کلمات پڑھے۔ سبحان اللہ وبحمدہ تو اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اگرچہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔" (بخاری و مسلم)



عالمی ادب کے اردو تراجم

عکس ادب

انتخاب و ترجمہ، ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی

کہانی کو کہنے والے کی تلاش رہتی ہے اور کہنے والے کو کہانی کی۔

اور جب ... کہی جاچکے۔ تو اپنے پڑھنے والے تک خود پہنچ جاتی ہے۔۔

تکون صرف محبت کی تھوڑی ہوا کرتی ہے۔

کیا ہے جو کہانی نہیں ہے؟

ہر فرد گزشتہ سے پیوستہ۔ ایک کہانی ہی تو ہے۔

زمانے کی ہر راہ گزر۔ جس پر قدموں کے نشان ہیں۔ کہانی ہے۔

لیکن ہر کہانی کو کہنے والا ملے۔ یہ ضروری نہیں۔

اور جس کہانی کو کہنے والا مل جائے۔ اور ماہ و سال کی قید سے آزاد۔ وہ سرحدیں پار کرتی۔ دوسری زبانوں کے پیراہن اوڑھتی۔ پڑھنے والوں کے فہم تک رسائی حاصل کرتی رہے۔ ایسی کہانیاں امر ہو جانے کی سندر رکھتی ہیں۔

کہانی اور بچپن کا گہرا تعلق ہے۔ جب تصور کی سرزمین پر تحیر کی پھوار برستی ہے۔ اور یہ لطف کو زرخیز کرنے کے ہنر سے آراستہ کرتی ہے اور یہی وہ لطف ہے جو شعور کے مدارج طے کرتے رہنے کے باوجود۔ بچپن کے تحیر کو فراموش نہیں کرتا۔

کہانی کے طلسماتی سفر پر تخیل کے خیرہ کن پنکھ قاری کو حیرت، شوق اور گداز کی وادیوں میں لیے اڑتے ہیں۔ جہاں کی خوش نمائی اس کی روح کو لطافت عطا کرتی ہے۔ تو کبھی درد کے دریا میں بہہ جانے کی آرزو اسے بے قرار رکھتی ہے۔

ڈاکٹر صہبا جمال شاذلی صاحبہ نے اپنے ادبی ذوق کا لطف دوبالا کرنے کے لیے ایسی ہی کچھ عمدہ کہانیوں کا انتخاب اور ترجمہ اردو کے پڑھنے والوں کے لیے پیش کیا ہے۔ جو عالمی ادب کے گلستاں سے چنے گئے خوب صورت گلابوں پر مشتمل ہے کہ جن کی خوشبو آج بھی پڑھنے والوں کے تخیل کو مہکا رہی ہے۔

ادب میں ماورائی حیثیت اختیار کرنے والی تخلیق کا سرچشمہ عمیق مشاہدہ، حساس شعور اور تدبر تھا۔ جس نے فنکار کو بے بدل مقام عطا کیا۔ وہ پھر قدرت کے مظاہر کی توصیف ہو یا لازوال رومانوی شاعری یا دنیا کو اسٹیج کہنے والے ڈرامہ نگار یا پھر سلیقے سے معاشرے کے منافقانہ رویوں سے نقاب اتارنے والے کہانی نگار۔

فرانس سے اس کی ایک نمائندہ مثال موپساں کا نام ہے جن کی کہانی ''مصنوعی زیورات'' اس گلدستے کی پہلی کلی ہے۔

آب رواں کی مثال موپساں کے کے قلم کی روانی پر صادق آتی ہے۔

کہانی کا جادوئی قالین ہمیں فرانس لیے چلتا ہے۔ جہاں گلیوں اور بازاروں کی ایک جھلک ہمیں ٹائم مشین کے سفر جیسا تحیر عطا کرتی ہے۔

سادہ سی محبت اور ملن (جس کا ناممکن ہونا ہی کہانیوں کا دکھ بنتا ہے) کی کہانی۔

خوش باش ازدواجی زندگی کے خمار میں ایسا کیا ہو گیا کہ کسی فریق نے دوسرے کو برا بھلا نہیں کہا دشنام طرازی اور بدنامی کی نوبت بھی نہیں آئی اور

قاری کو معلوم ہو گیا کہ کس نے کس کے ساتھ بے وفائی کی۔

فنکار کو امر کرنے والی کہانیاں دراصل سطح پر موجود بیانیے کے بجائے ایک ان کہی سے لپٹی ہوتی ہیں۔ اور یہی ان کہی اس فنکار کے فن کی معراج ہوا کرتی ہے۔

1923ء ٹی بی کے عارضے مبتلا ہو کر۔ میں اس جہان رنگ و بو کو محض چونتیس سال کی عمر میں الوداع کہنے والی کیتھرین مینسفیلڈ کی حیات تو مختصر رہی۔ مگر ان کی کہانیاں جاوداں ہو گئیں۔

جزئیات نگاری۔ انگریزی ادب کے کینوس پر منی ایچر کا تصور ابھارتی ہے۔ کیتھرین کی کہانیوں میں اس مہارت کا عروج اور بہاؤ کی لطافت اپنے حسین امتزاج کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے۔ جہاں منظر نگاری۔ پرسکون بہاؤ کی نرمی اور دھیرے سے روشن ہوتے کرداروں کو دیکھنا۔ سننا اور ان کے محسوسات میں خود کو شریک سمجھنا۔ ایک جادوئی تجربہ ہے۔

کہانی اگر پڑھنے والے کے لطیف ذوق کی تسکین کا سامان کرتی ہے تو آبیاری بھی اسی کا وصف ہے۔

کیتھرین کی کہانیوں میں طبقاتی تقسیم اور اس بنیاد پر روا رکھے گئے امتیازی اور متعصب رویے کو جس سادگی اور سلیقے سے بیان کیا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ زمانے گزر گئے، مگر اس تقسیم اور تعصب نے آج بھی فرد کی دنیا کو گھیرا ہوا ہے۔ لیکن آج اس کا ظہور بھی پرتشدد ہے اور اظہار بھی۔

''گڑیا گھر'' ایسی ہی ایک کہانی ہے۔ جہاں زندگی کے حساس ترین دور سے گزرتے، معصوم ذہنوں کو درپیش سنگین معاشرتی اونچ نیچ سے گزرتے دکھایا گیا ہے۔ بچے ہی آنے والے دنوں کی بنیاد ہوا کرتے ہیں۔ ماحول اور تربیت ان کی شخصیت کی پرداخت کرتے ہیں۔ جس کا عکس مستقبل کے معاشرے کی صورت گری میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تو ایسے نازک وقت میں ان شفاف سطحوں پر کیا درج کیا جاتا ہے۔ یہی چیز معاشرے کی تصویر دیکھنے کے لیے جام جم کا کام کرتی ہے۔

''گڑیا گھر'' ہمارے نصاب میں شامل تھی۔ اور عمر کے اولین دور کی کہانیوں سے وابستگی کبھی فراموش نہیں ہوتی۔ ان کہانیوں کے دیے ہوئے دکھ۔ زندگی کے دکھوں سے سوا۔ مختلف اور عزیز ہوتے ہیں۔ یہ ہمارے نہیں ہوتے۔ لیکن ہمیں احساس کی شراکت سکھا دیتے ہیں اور شاید یہی ان کا بلند ترین ہدف ہوتا ہے۔

''چائے کی پیالی'' بھی کیتھرین کے ذہن رسا کا موثر اظہار ہے۔ جہاں آپ چند ہی لمحوں میں معاشرے کو تقسیم کرتی حد فاصل کا نظارہ کرنے والے ہیں۔ جس کی ایک جانب امارت کی دلکش رنگینی، نزاکت اور لطافت ہے تو دوسری جانب بھوک سے نڈھال ہو کر، بے ہوش ہونے کے قریب، چائے کی ایک پیالی کی درخواست۔

کہانی میں موجود معاشرے کی دو انتہائیں دریا کے دو کناروں کی طرح بہتی ہیں۔ اس کہانی میں دولت مندوں کی ہمدردی پر لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ جو وہ شہرت یا تفریح طبع کی خاطر، ظاہر کرتے ہیں۔

''کیوں نہ میں اس لڑکی کو اپنے گھر لے جاؤں؟ کیا یہ سنسنی خیز نہ ہوگا؟ اپنے دوستوں کو حیران کر سکتی ہوں کہ، میں بس ایسے ہی اس لڑکی کو گھر لے آئی۔'' پس روزمیری نے لڑکی سے کہا۔ ''میرے گھر چل کر ساتھ میں چائے پیتے ہیں۔''

اس دعوت کی بے یقینی سے یقین تک کا سفر دو انتہاؤں کے بیچوں بیچ طے ہوا۔

لڑکی نے رونا بند کیا اور روزمیری نے میز برابر کی اور ڈھیر سارے کھانے سجا دیے۔ سینڈوچز، بریڈ اور بٹر اور جیسے ہی لڑکی کا کپ خالی ہوتا تو روزمیری

پھر سے اسے چائے، کریم اور شکر سے بھر دیتی۔
لیکن امیروں کے دکھ ہمیشہ عجیب ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ غریب نہیں ہوتے۔
کہانی دولت مند خاتون کی خود کو خوب صورت سننے کی ناآسودہ خواہش پر تمام ہوتی ہے۔ جو کہ اس کا شوہر۔ چائے کی میز پر موجود لڑکی کے لیے کہہ چکتا ہے۔ رات کے کھانے کی پیشکش کو روز میری اپنے لیے خطرہ جان کر جس سرعت سے سد باب کرتی ہے۔ وہ بھی شاید دولت کی عطا کردہ فہم کا نتیجہ ہو۔
''گارڈن پارٹی۔'' اس مجموعے میں شامل ایک اور خوب صورت کہانی ہے۔ روز مرہ کے معمولات میں سے معاشرے کی دکھتی رگوں پر ہاتھ رکھنا۔ کسی عام ذہن کے بس کی بات نہیں۔ اور یہی وہ باریک بینی ہے جو ادیب کو دوسرے فرد سے ممتاز کرتی ہے۔
اس کہانی میں خوش وقتی کی خاطر دعوت کے اہتمام کی تیاریاں۔ نفاست اور ذوق و شوق دکھایا گیا ہے، جہاں موسیقی، کھانے پینے کی عمدہ چیزیں۔ سجاوٹ کے لیے پھولوں کا انتخاب اور بیٹھنے کے لیے بہترین جگہ جیسے انتظامات ہو رہے ہیں۔ ان مرحلوں سے کہانی۔ لکھنے والا اور پڑھنے والا سبک روی سے گزرتے ہیں کہ اچانک رونما ہونے والا حادثہ ایک موت کی خبر لاتا ہے۔ مرنے والا ایک عام آدمی ہے۔ جو اس دعوت والے گھر کے باہر حادثے کا شکار ہوا۔ لارا اس گھر کا حساس فرد اور کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ دعوت کو روکنے کے لیے اس کی ہر استدعا اچنبھے اور جوابی استدلال کے ساتھ رد کر دی جاتی ہے۔ اور ایسے دلائل وضع کیے جاتے ہیں کہ نا چاہتے ہوئے۔ لارا بھی پارٹی کو نا صرف جاری رکھنے بلکہ شرکت پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔
طبقاتی دیواروں کو گرانا۔ دیوانے کا خواب ہو سکتا ہے۔ مگر کچھ زندگیاں اس خواب کو سینچتے گزر جانے میں ذرا بھی ہرج نہیں سمجھتیں۔ اور یہ لڑائی ہر دور میں مختلف طریقوں سے لڑی گئی ہے۔ اس کہانی میں امیر اور غریب کا فرق تو دکھایا گیا ہے۔ مگر نفرت کے بجائے ہمدردی کا واضح احساس بھی موجود ہے۔ جیسا کہ پارٹی اور کہانی کے اختتام پر لارا اپنے گھر سے ٹوکری بھر کر کھانے پینے کی اشیا لے کر موت والے گھر جاتی ہے۔ جو کہ ایک مختلف تہذیب اور تربیت کا علم بردار رویہ ہے۔
وہاں موجود بے جان لاشے کو دیکھ کر لارا کا حساس دل زندگی کی بے ثباتی اور موت کو آزادی کے پروانے جیسا خیال کر کے مغموم رہتا ہے۔
اور اگلی خوب صورت کہانی ''ماپارکر کی زندگی'' ہے۔ دکھ بھری زندگی کے مصائب جھیلتی ایک گھریلو ملازمہ کی زندگی پر اتنی تفصیل سے روشنی ڈالنے کا وقت ہر ایک کے پاس کہاں؟
یہ لکھنے والے کی زود حسی کا کمال فن ہے کہ آج تک پڑھنے والا اس کرب میں لمحاتی طور پر ہی سہی۔ خود کو شریک سمجھتا ہے۔ ماپارکر کی زندگی کی آخری خوشی بھی بیماری اور موت کے ہاتھوں چھن گئی۔
کام پر واپس پہنچ کر۔ اس کے قلب و ذہن میں چلنے والی یادوں کی ریل ہم بھی دیکھ پاتے ہیں۔
بہترین کی کہانیاں۔ امارت کی نقشہ کشی۔ غربت اور مصائب کے تعلق۔ زندگی اور موت کے تذکروں سے پر ہیں۔ بنیادی کلید ایک ہونے کے باوجود۔ زندگی کی ہمہ رنگی کی طرح کہانی بھی۔ ہر دوسری سے مختلف ہے۔ لگاتار صدمات سے ہار نہ ماننے والی ماپارکر۔ اس دھچکے پر رونا اور چلانا چاہتی ہے۔ مگر نہ کندھا میسر اور نہ کوئی گوشہ۔
''سرمئی گھوڑا'' جسے کہانی میں گرے گینگر کہا جاتا ہے۔ ایک خوب صورت گھوڑے کی محبت میں مبتلا کسان کی کہانی ہے۔
انسان کا انسان ہونا، اسے جس ہمہ گیریت میں داخل ہونے کا وصف عطا کرتا ہے۔ مقام حیرت ہے کہ انسان اس سے محروم رہ جانے کے سبب سے بھی آگاہ نہیں ہو پاتا۔
اس کہانی میں ایسے ہی ایک انسان کو قریب

سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے جو ایک خوبصورت سرمئی گھوڑے کا مالک ہے۔ مگر اپنی تنگ نظری اور کم حوصلگی کے باعث گھوڑے پر صرف حق ملکیت جتاتے اور دوسروں کو اپنے گھوڑے کی طرف دیکھ کر ملنے والی خوشی سے حسد کرتے ہوئے ہی نظر آتا ہے۔

اس مختصر مگر تہہ دار کہانی میں عمروں کے تفاوت کے باعث در آنے والے باہمی تعصبات، فطری خواہشات پر قدغن لگانے کی آمرانہ منطق۔ نوجوانی کی مسرت اور امنگ۔ کھیتی باڑی اور موسموں کے مزاج۔ خراب فصلوں کی زد میں آئے کسانوں کے خراب معاشی حالات اور ان سے جڑنے جذباتی مسائل کا تفصیلی ذکر ہے۔

سرمئی گھوڑے کی محبت میں مبتلا۔ بل موری پارٹی کو، صرف اس محبت کی سزا دینے کے لیے۔ گورلے نے گھوڑا کسی اور کے ہاتھ بیچ کر، اس کی نظروں سے دور کر دیا۔

مصنفہ نے ایک ہی وقت میں انسان، معاش، موسم، جانور، جبلت اور جذبات کا باریک بینی سے کیا گیا مشاہدہ۔ نہایت فنکارانہ مہارت سے ہم تک پہنچایا ہے۔

''مگر ے گینگر پہلے جتنا خوب صورت تھا، اب مزید خوب صورت ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلے جیسا شوخ اور چنچل نہیں تھا بلکہ کافی شاہانہ ہو چکا تھا۔ اس کا عقبی حصہ پختہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی سرمئی اور ملائم جلد چمکنے لگتی جب وہ اپنے جسم کو حرکت دیتا۔ بل اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی گردن سہلانے لگا۔ غیر مطمئن زندگی کی کوفت کے ساتھ۔'' کاش وہ شخص میں ہوتا، بوڑھے۔'' بل نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''کاش وہ میں ہوتا۔ دراصل میں ہی اس کے لیے مناسب تھا۔''

کہانی کا جادوئی قالین تھوڑی دیر کے لیے ہمارے خطے میں بھی پہنچتا ہے۔ جہاں ادب کی دنیا کا ایک بڑا نام ''خشونت سنگھ'' دو خوب صورت کہانیوں کے ساتھ موجود ہے۔

دونوں کہانیوں کا موضوع اور ماحول یکسر مختلف ہے۔ لیکن خیال کی چابک دستی اور قلم کی روانی کے کیا کہنے۔

''ایک خاتون کی تصویر'' میں دادی ہی کہانی کا مرکز ہیں۔ اور اپنے بوڑھے اور ضعیف ہو چکے لوگوں کو دیکھ کر جو خیال کہانی کی پہلی سطروں میں ظاہر کیا گیا ہے، وہ شاید ایک آفاقی حقیقت کی طرح ہے۔ جو نوجوانوں، بچوں کے ذہن سے لپٹا رہتا ہے۔ ایک دھندلی حقیقت کی طرح۔ جو بہت بعد میں واضح ہوتی ہے۔ تب زمانے کا پھیر بدل چکا ہوتا ہے۔

''میری دادی ماں، کسی اور دادی کی طرح، ایک ضعیف خاتون تھیں۔ بیس سال سے میں نے انہیں ضعیف اور جھریوں سے بھری ہوئی ہی جانا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ بھی جوان اور خوب صورت تھیں، اور شوہر بھی رکھتی تھیں۔ لیکن میرے لیے یقین کرنا مشکل تھا۔''

دادی کا تقدس کہانی کے ماحول کو عجیب سا سکون عطا کرتا ہے۔ مناجات میں مصروف، چرخہ چلاتی ہوئی۔ چڑیوں کو دانہ ڈالتی۔ اسکول چھوڑنے جاتی۔ کتوں کو روٹیاں ڈالتی ہوئی دادی کے کردار سے انس لازم ہے۔ مگر اسی چلتی ہوئی ناؤ میں عصری مسائل کے کنکر پھینکنا۔ ایک ادبی شاہ پارے کا ہی وصف ہے۔

کہانی کا آخری پیراگراف آپ کا دل جیت لیتا ہے۔ آپ اس خوب صورتی کو محسوس کرتے ہیں۔ جس کا تعلق عالی اوصاف سے ہے۔

خشونت سنگھ کے چست قلم کا دوسرا شاہکار ''فلسفہ عمل'' ہے۔

کہانی کے آغاز سے کہانی کی سمت اور انجام کا اندازہ نہ ہو سکنا، فنکار کی فنکاری ہے اور تعارفی سطروں میں آئینے سے خود کلامی دراصل نرگسیت کی علامت تھی۔ اس کی خبر بھی جلد ہو جاتی ہے۔

عام طور پر کہانیوں کے اختتام پر پڑھنے والا سوچتا ہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کو

کیسے روکا جاسکتا ہے۔ ایسا کب تک ہوگا۔ لیکن ایسی کتنی کہانیاں آپ کو یاد ہیں۔ جن کے انجام پر ”اچھا ہوا اس کے ساتھ۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا“ ہوا ہو؟

سو، فلسفہ عمل بھی ایک ایسے شخص کی کہانی ہے۔ جس کی نرگسیت پر مصنف کو مکمل عبور حاصل تھا۔ آئینے سے داد وصول کرتے ہی ٹرین کے فرسٹ کلاس ڈبے میں۔ ہم بھی سر موہن کے ساتھ ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ جہاں وہ خود کو نادر زمانہ خیال کرنے کی ذہنی لذت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

نرگسیت پسندی کے دو منہ ہوں تو نرگسیت کا عنوان کیسے ملے؟ خبط عظمت میں مبتلا۔ یہ لوگ دوسروں کو کم تر خیال کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ سوان صاحب کو خود کو انگریزوں کے ہم پلہ سمجھنے کی خود فریبی (اور دوسروں کو بھی باور کرانے کی) لاحق تھی اور ہم وطنوں کو نالائق، نااہل اور آلودہ خیال کرتے تھے۔

انگریز ساتھی مسافروں کی ہم سفری کا خیال انہیں سرشار کیے ہوئے تھا۔ اور اسی سرشاری میں وہ مختلف چیزوں کے استعمال سے انہیں متاثر کرنے کی بھرپور منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔

لیکن۔ وائے قسمت۔ ان کے ساتھ ہونے والا اتفاق۔ حسن اتفاق کے بجائے۔ سوئے اتفاق ٹھہرا۔ اور سیٹی کی آواز کے ساتھ۔ ڈبے میں داخل ہونے والے انگریز فوجیوں نے اپنی غاصبانہ حکمت عملی سے کام لیا اور سر موہن۔ ان کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

ہر ادیب اپنے فن کے ساتھ مخصوص ہنر آزمائی کا اظہار کرتا ہے اور وہی اس کی پہچان ہوتی ہے۔

اس کہانی کا آخری پیراگراف بھی حیران کن حد تک موثر ہے۔ یوں کہ ساری داستان سمٹ کر آخری سطروں میں بس جاتی ہے۔

پڑھنے والا چونکہ سر موہن کے ساتھ ہی ٹرین کے ڈبے میں سوار ہوا تھا۔ تو پیش آنے والے سانحے کی صورت گری پر۔ جہاں سر موہن صدماتی سکتے کا شکار ہوئے۔ پڑھنے والا بھی منہ میں انگلی داب کر رہ گیا۔

اور ٹرین گزر جانے کے بعد قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

مجموعے میں شامل سب ہی کہانیاں۔ جہان دیگر سے لائی گئی ہیں اور اردو کے پڑھنے والوں کے لیے اس جہان تک رسائی، مترجم کی بدولت ہے۔ جن کی محنت اور کاوش اس انتخاب کے ذریعے سامنے آئی ہے۔

مختلف ہونے کی چاہ سے زیادہ دلنشیں ہے مختلف جاننے کی چاہ رکھنا۔

یہ خود بخود ہمیں مختلف بنا دیتی ہے۔ اس وجود سے جو جاننے سے قبل تھا۔

معروف اداکارہ

اذیکا ڈینیل سے ملاقات

شاہین رشید

اذیکا ڈینئل نے تقریباً 2016 میں ٹی وی کی فیلڈ میں قدم رکھا۔ کافی اچھے ڈرامے کیے اور ناظرین کے دل میں جگہ بنالی...... ابتدا میں ان کی اداکاری میں ویسی پختگی نہیں تھی جیسی کہ ایک ایکسپرٹ فنکارہ میں ہوتی ہے۔ مگر اب اذیکا ڈینئل کی پرفارمنس میں بہت نکھار آ گیا ہے۔

"کیسے مزاج ہیں آپ کے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"کچھ عرصہ آپ اسکرین سے غائب رہیں وجہ؟"

"کوئی خاص نہیں...... اور میرا نہیں خیال کہ میں غائب رہی کیونکہ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم سیریل ریکارڈ کروا لیتے ہیں مگر وہ آن ایئر دیر سے ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم اسکرین سے غائب ہو گئے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔"

"آج کل کیا آن ایئر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"

"آن ایئر میں تو "تیرا غم اور ہم" ہے اور انڈر پروڈکشن کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی۔ کافی کام ہے۔ کب مکمل ہوتا ہے اور کب آن ایئر ہوتا ہے، کچھ پتا نہیں۔"

"اب تک کیا کیا کر چکی ہیں؟"

"ہوں...... یہ تو آپ نے سوچ میں ڈال دیا ہے...... کافی سیریل کر چکی ہوں کچھ کر چکی ہوں۔ جو یاد ہے آپ کو بتا دیتی ہوں۔ کچھ ہی عرصہ قبل سیریل "ملال یار" ختم ہوا ہے۔

"اور سب اولاد کی طرح پسند ہوں گے؟"

"قہقہہ...... آپ نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ سب میں میرے کردار واقعی بہت اچھے تھے۔"

"اپنے بارے میں بتائیں کہ کس طرح اس فیلڈ میں آئیں؟"

"اگر میں کہوں کہ میں اس فیلڈ میں بغیر کسی پلاننگ کے آئی تو غلط نہ ہوگا۔ درحقیقت تو مجھے شوق تھا ڈاکٹر بننے کا اور پڑھائی میری جاری تھی کہ کہیں سے مجھے ماڈلنگ کی آفر آ گئی اور اتفاق دیکھیں کہ کمرشلز کافی ہٹ ہوئے اور جب کمرشل ہٹ ہو جائیں تو پھر ڈائریکٹرز کی خواہش ہوتی ہے کہ اس آرٹسٹ کو بک کریں...... چنانچہ سب سے پہلے مجھے جیو کی طرف سے پیشکش ہوئی۔ میں نے انکار نہیں کیا اور یوں اس سفر کا آغاز ہوا...... اور ہوتا ہی چلا گیا۔"

"اور ڈاکٹر بننے کا خواب؟"

"وہ تو اب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ اور تعلیم کا سلسلہ گریجویشن کے بعد بند ہو گیا۔ بلکہ رک گیا، لفظ استعمال کروں تو بہتر ہے کیونکہ پڑھائی تو میں پھر بھی جاری رکھ سکتی ہوں جب دل چاہیے۔"

"ماڈلنگ کا شوق کیسے ہوا۔ کس نے اس فیلڈ میں آنے کے لیے کہا؟"

"میری ایک دوست ہے، اس کی اپنی دوست کی ایڈورٹائزنگ ایجنسی ہے وہاں اس کے سب سے

بہت اچھے تعلقات تھے۔ اس نے مجھے کہا کہ تم اتنی پیاری ہو۔ ڈراموں اور کمرشلز میں ماڈلنگ کیوں نہیں کرتیں۔ اور میں ہمیشہ ٹال دیتی کہ نہیں مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ پھر مجھے خود ہی فیل ہوا کہ وہ اتنا اصرار کر رہی ہے تو آڈیشن دے ہی دیتی ہوں۔ چنانچہ میں نے آڈیشن دے دیا اور کامیاب بھی ہوگئی۔ اور یوں ہر مہینے ایک دو کمرشلز کی پیشکش ہو جاتی تھی اور میں کر لیتی تھی۔ کمرشلز کے ذریعے پہچان بنی تو پھر ڈراموں کے لیے آفرز آگئی۔“



”پہلا کمرشل اور پہلا ڈرامہ کون سا تھا؟“

”پہلا کمرشل ”اولپرز“ کا تھا اور یہ تھائی لینڈ میں شوٹ ہوا تھا اور اتنی بہت ساری لڑکیاں تھیں کہ میں ان میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی ...... ہم لوگ بنکاک گئے اور پہلا ڈرامہ ”چھوٹی“ تھا اور اس ڈرامے نے بھی بہت شہرت حاصل کی تھی اور میرے کام کو بھی پسند کیا گیا تھا جس کے بعد مجھے مزید ڈراموں کی آفرز آنا شروع ہوگئیں۔“

”گھر والے خوش تھے؟“

”شروع شروع میں تھوڑے ناراض ہوئے کہ تمہیں تو ڈاکٹر بننا تھا اور تم اس فیلڈ میں آگئی ہو۔ پھر خود ہی راضی ہوگئے کہ جہاں دل لگے وہیں کام کرو۔“

”افسوس تو نہیں ہوتا کہ کاش میں ڈاکٹر ہی بن جاتی اس فیلڈ میں نہ آتی؟“

”نہیں نہیں...... ہر فیلڈ کا اپنا مزہ ہے۔“

”ہمارے ڈراموں کے کردار کتنے حقیقت کے قریب ہوتے ہیں؟“

”میں سمجھتی ہوں کہ حقیقت کے ہی قریب ہوتے ہیں۔ ہمارے معاشرے کی خواتین جن حالات سے گزر رہی ہیں اس کی بالکل صحیح عکاسی کی جارہی ہے۔ اگر عورت اسٹرانگ ہے تو مظلوم بھی بہت ہے۔ بہادر ہے تو ڈرپوک بھی ہے۔ چالاک ہے تو نادان بھی ہے۔ تو بس ڈراموں میں بھی آپ کو ایسی ہی عورت نظر آئے گی۔“

”ذہنی تشدد تو ڈراموں میں دکھایا ہی جاتا ہے مگر جسمانی تشدد بھی دکھایا جاتا ہے۔ اس بارے میں کیا کہیں گی؟“

”جو ہو رہا ہے، وہ ہی دکھا رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ عورت پر جسمانی تشدد نہیں ہوتا؟ ارے بہت ہوتا ہے ......ذہنی ٹارچر بھی کیا جاتا ہے اور جسمانی..... کیا کریں کہ اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔“

”کیا معاشرے میں سدھار پیدا ہو رہا ہے؟“

”اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر کچھ نہ کچھ اثرات تو اچھے ہوئے ہی ہوں گے۔“

”چلیں اذیکا! اب آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں پھر مزید سوالات کرتے ہیں؟“

”میں کرسچین فیملی سے تعلق رکھتی ہوں۔ جولائی 1992 میں پیدا ہوئی۔ میرا نام میرے دادا نے رکھا اور میرے نام کا مطلب ”دیواروں کی طاقت“ ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میرا نام ایسا ہے کہ

ملتی ہیں۔"

"کس طرح کے کردار کرنے کی خواہش ہے؟"

"اب میں یہ نہیں کہوں گی کہ مجھے معذور کا یا پاگل کا یا اسی طرح کے دیگر کردار کرنے کی خواہش ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ میری خواہش ہے کہ ہماری پرانی فلموں کی ہیروئن، انگریزی فلموں کی پرانی ہیروئن اور مغلیہ دور کی شہزادیوں کے رول کروں۔ میرے خیال میں یہ سب سے زیادہ منفرد رول ہوں گے اور یقیناً ناظرین بھی پسند کریں گے۔"

"ایسا تو تب ہی ہوسکتا ہے کہ کہانیاں بھی پرانے زمانے کی ہوں؟"

"جی بالکل...... مگر رائٹرز تو آج کل کے دور میں ہی پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں اتنی جدوجہد کریں گے۔"

"کبھی ایسا ہوا کہ ایک کردار کرتے کرتے محسوس ہوا کہ میں بھی یہی ہوں؟"

"ہاں جی...... بالکل...... مسلسل کرزار کرنے کا موقع تو سوپ میں ہی ملتا ہے اور یہی لگتا ہے کہ یہ





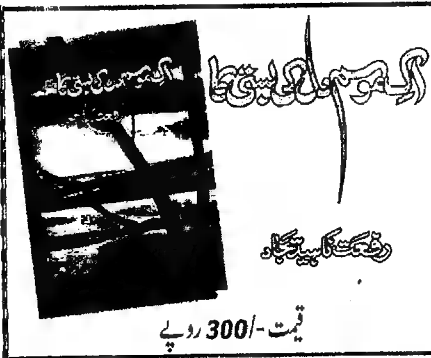
اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا...... خیر...... ہماری فیملی بہت مختصر تھی، اب اور مختصر ہوگئی ہے۔ میری والدہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے اور میرا ایک ہی بھائی تھا اس کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ اللہ میرے والد کو لمبی عمر عطا فرمائے (آمین)۔"

"آج کل کی فنکاراؤں میں سرجری کا بہت رجحان ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ خوب صورت نظر آسکیں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور میں بہت حیران ہوتی ہوں کہ لوگ مطلب خواہ مرد ہو یا عورت اپنے قدرتی حسن کو کیوں خراب کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جیسا ہمیں بنایا ہے، وہ ہمارے لیے بہترین ہے۔ تو میں نہ تو سرجری کرواتی ہوں اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتی ہوں...... میں قدرت کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے تو اللہ نے جیسا بنایا ہے میں اس کے لیے اس کی بہت زیادہ شکرگزار ہوں۔ کیونکہ مجھے تعریفیں بھی اسی چہرے کی وجہ سے

ہماری ہی کہانی ہے ہم ہی اس کا حصہ ہیں۔ اور ویسے بھی میں تو ہر کردار کو اپنے اوپر طاری کر لیتی ہوں۔"
"ڈاکٹر تو آپ بن نہ سکیں، کسی اور فیلڈ میں جانے کا دل چاہا شوبز کے علاوہ؟"
"بالکل چاہا...... میں بہت اچھی کک ہوں۔ تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بہ حیثیت شیف کے بھی کسی چینل میں آؤں اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ مجھ میں ایک اچھی "بزنس وومن" بننے کی صلاحیت بھی ہے۔ تو کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ میں کبھی بے کار نہیں بیٹھ سکتی کہ مجھ میں اللہ تعالیٰ نے مزید ٹیلنٹ بھی فیڈ کیا ہوا ہے جسے میں خدانخواستہ اپنے برے وقت میں بھی کام میں لا سکتی ہوں۔"
"برے وقت کی بات کی تو کیا کبھی زندگی میں برا وقت بھی آیا؟"
"جی ہاں...... بالکل دیکھا، جب میری والدہ بیمار ہوئی تھیں۔ اس وقت میں کافی چھوٹی تھی، مگر والدہ کی تکلیف اور پریشانی میری یادداشت میں محفوظ ہوگئی ہے اور اب بھی وہ وقت سوچتی ہوں تو دکھی ہو جاتی ہوں۔ اور پھر والدہ کے بعد جب تھوڑی سیٹ ہوئی تو بھائی کا انتقال ہوگیا۔ بس پھر تو زندگی ہی اندھیر ہوگئی...... مگر پھر وہی بات کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے انسان کو نارمل کر دیتا ہے اور میں اور میرے والد نارمل ہو ہی گئے۔ بس یادیں زندہ ہیں۔ تنہائی میں رونا بھی بہت آتا ہے۔ مگر خدا کی رضا پر راضی ہونا پڑتا ہے۔"
"کیا اب ہمارے ڈراموں میں بولڈ سین نہیں ہونے لگے؟"
"میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے ہاں، کبھی کبھار ڈرائیلاگ تھوڑے بولڈ ہو جاتے ہیں مگر وہ بھی کہانی کی ڈیمانڈ ہوتے ہیں۔"
"چلیں جی...... فیلڈ سے متعلق تو بہت باتیں ہوگئیں۔ یہ بتائیں کہ گھریلو امور سے کتنی دلچسپی ہے؟"
"بالکل جناب...... بہت دلچسپی ہے اور میں خود ہی پکاتی ہوں اور بہت اچھا پکاتی ہوں۔ ہاتھ میں ذائقہ ہے تو سب ہی پسند کرتے ہیں اور گھر کے دیگر کام بھی بہت شوق سے کرتی ہوں۔"
"شاپنگ کے وقت ڈسکاؤنٹ تو خوب ملتا ہوگا؟"
"توبہ کریں...... اصل قیمت سے بھی زیادہ قیمت بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تو آرٹسٹ ہیں آپ کے پاس بہت پیسہ ہے تو بہت دیکھ بھال کر شاپنگ کرنی پڑتی ہے۔"
"کون سا برانڈ زیادہ استعمال کرتی ہیں؟"
"مجھے برانڈ کا اتنا شوق نہیں ہے۔ اچھی اور معیاری چیزیں میری پہلی ترجیح ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اکثر برانڈ کی چیزیں معیاری نہیں ہوتیں۔ بس نام ہی نام ہوتا ہے۔"
"پرستار کیا فرمائش کرتے ہیں؟"
"سیلفی بنوالیں...... اور یہ بات مجھے پسند نہیں ہے، اس لیے معذرت کر لیتی ہوں۔"
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے اذیکا ڈینئل سے اجازت چاہی۔





دستک دستک

دستکہ

شاہین رشید

عمران اسلم

"کیا حال ہیں، طبیعت کیسی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"موسم انجوائے کیا، یا کراچی کے حالات پر رونا آیا؟"

"کیا انجوائے کرنا، کراچی کے حالات پر تو رونا ہی آیا...... کیا بولیں، اپنا شہر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنا کرم کردے اور میں تو گزشتہ دنوں لاہور گیا ہوا تھا۔ یہاں آیا تو پھر یہاں کی شوٹنگز میں پھنس گیا۔"

"کیا کہیں گے ان حالات پر؟"

"کیا کہیں، سوائے اس کے کہ بلدیاتی اداروں کی نااہلی ہے ورنہ کوئی اتنا خطرناک سسٹم نہیں کہ ہینڈل نہ ہوسکے۔ بارشیں تو ہر ملک میں ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ تو ایک لمبی بحث ہے۔"

"آج کل آپ کا ڈرامہ سیریل "نالائق" دیکھ رہی ہوں اور کافی عرصے کے بعد آپ اسکرین پر نظر آرہے ہیں وجہ؟"

"وجہ یہ ہے کہ اپنی کچھ مصروفیات کی وجہ اسے ٹی وی کو وقت نہیں دے پایا۔ اور ایسا نہیں کہ میں اسکرین سے بالکل غائب ہوگیا تھا۔ میرے ڈرامے دیگر چینلز سے آن ایر تھے۔ اور جس چینل کا نام آپ نے لیا اس میں کافی ٹائم کے بعد نظر آرہا ہوں۔ اور ہمیں تو کام کرنا ہوتا ہے، اچھا اور معیاری اور ہمارے لیے سب چینلز ایک جیسے ہیں بس ہمارا کام معیاری ہونا چاہیے۔"

"کیا انڈر پروڈکشن ہے؟ کیا آن ایر ہے؟"

"سیریل "نالائق" کے بارے میں تو آپ جانتی ہیں کہ آن ایر ہے اور اس کی شوٹس بھی جاری ہیں تو اس میں مصروف ہوں پھر میں خود بھی ایک سیریل لکھ رہا ہوں اور اس میں مرکزی کردار بھی میں خود ہی کروں گا۔ شاید کنفرم نہیں ہے ابھی نام اور تفصیلات نہیں بتانا چاہ رہا کہ پھر سسپنس ختم ہوجاتا ہے۔"

"آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آپ پروڈکشن کی سائیڈ پر بھی آئیں گے۔ وہ معاملہ کیا ہوا؟"

"جی...... میں نے بالکل کہا تھا اور پروڈکشن کی بھی مگر کچھ وجوہات کی وجہ سے مزید پروڈکشن کر نہیں پایا...... لیکن ان شاء اللہ کچھ عرصے کے بعد کچھ نہ کچھ ضرور سوچیں گے اس کے بارے میں۔"

"آپ کام کرتو رہے ہیں مگر پہلے کی نسبت بہت کم تو ایسا آپ نے خود کیا یا نئے لوگ رکاوٹ بنے؟"

"نہیں، کوئی کسی کے لیے رکاوٹ نہیں بنتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نئے لوگ کافی آگئے ہیں اور مقابلہ تو کافی بڑھ گیا ہے لیکن ٹیلنٹ کی تو ہمیشہ قدر ہوتی ہے۔ اور آپ کے سوال کا پہلا حصہ کہ کام کم کردیا ہے تو ایسا نہیں ہے۔ وجوہات میں نے آپ کو بتادی ہیں اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کام کافی سارا ریکارڈ ہوجاتا ہے مگر آن ایر ایک ساتھ ہوتا ہے تو لگتا ہے کہ بہت کام ہورہا ہے۔"

"کبھی کسی نے "مان" سے کام کروایا، کہ یار یہ تم نے ہی کرنا ہے کردار؟"

"جی...... کچھ پروڈکشن ہاؤسز ہیں۔ کچھ دوست ہیں اس فیلڈ میں جو مان سے کام کرواتے ہیں اور کرداروں کو لکھواتے بھی ہیں تو ان کے لیے بھی کام کرتا ہوں۔ اور "نالائق" میں جو کردار میں کررہا ہوں

اگرچہ مشکل کردار ہے لیکن اس کے لیے میرا انتخاب کیا گیا۔"

"آج کل جو کام ہو رہا ہے۔ جو کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں، اس سے آپ مطمئن ہیں؟ کیا موضوعات ایک جیسے نہیں ہو گئے ہیں؟"

"آج کل نہیں کافی عرصے سے ہمارا کانٹینٹ یکسانیت کا شکار ہے اور جو نیا دکھانا چاہیے۔ وہ دکھا نہیں پا رہے آج کل دور پورٹلز کا ہے اور انہوں نے ہماری عوام کا دماغ کھول دیا ہے۔ موویز کی وجہ سے ایکسپوژر تو ہمارے پاس تھا اور "سیزن" کو دیکھنے کے بعد جو رجحان آیا، اس کی وجہ سے ہماری پروڈکشن پہ اثر پڑا ہے اور پروڈکشن کم ہو گئی ہے کیونکہ کانٹینٹ کے لیے سمجھ نہیں آ رہا کہ اصل میں ہمیں پیش کیا کرنا ہے۔ اور میری آج میں جو بات ہے، وہ یہ کہ جو سروے کیا گیا تھا اس حساب سے کانٹینٹ کو پیش کیا جاتا تھا مگر اب اس کی پسندیدگی میں کمی آئی ہے۔ امید ہے کہ آنے والے وقت میں اس سروے کو مدنظر رکھ کر بہتر کانٹینٹ پروڈیوس کریں گے۔ ہمارے پاس بہت سے ایسے موضوعات ہیں جن پر آج تک کچھ نہیں لکھا گیا۔"

"میں نے ڈراموں میں دیکھا ہے کہ ڈراموں میں میک اپ کا معیار بھی بہت گر گیا ہے۔ خواہ وہ خواتین ہوں یا آپ مرد حضرات۔ "نالائق" میں آپ کی لپ اسٹک کافی تیز ہے؟"

"جہاں تک خواتین کی بات ہے تو میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا کیونکہ وہ میرا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے۔ ہاں میرا جو گیٹ اپ ہے، اس کو میں میک اپ نہیں کہوں گا اور جسے آپ لپ اسٹک کہہ رہی ہیں وہ ایڈیٹنگ کا فالٹ ہے اور "نالائق" میں میرا میک اپ نہیں ہے، میرا گیٹ اپ ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے بھی دکھائے گئے ہیں۔ وائٹر بھی لگایا ہے۔ پیٹ بھی لگایا ہے اور اسکن کو بھی تھوڑا پینٹ ڈاؤن کیا ہے تاکہ میں جتنا زیادہ فریش نظر آؤں گا، اتنا ہی ایج کا فیکٹر ختم ہو جائے گا۔ اس میں مجھے تھوڑا ایجڈ دکھایا گیا

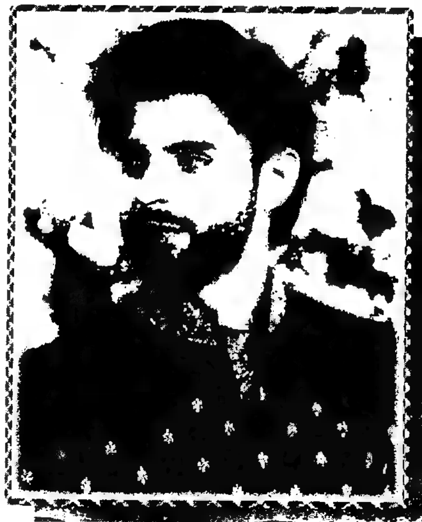


ہے۔

"نئے آنے والے فنکار کیا سینئرز کی عزت کرتے ہیں؟"

"اپنے کولیگز اور اپنے سے جونیئرز کے لیے کوئی کمنٹ کرنا مناسب نہیں لگتا۔ کیونکہ ہر انسان کا دیکھنے کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور جتنا بھی نیا ٹیلنٹ آیا ہے وہ واقعی بہت ٹیلنٹڈ ہے۔ اور ان کا رجحان سوشل میڈیا کی طرف بہت زیادہ ہے بہ نسبت پرنٹ میڈیا کے، جتنے بھی نئے لوگ ہیں، وہ بہت باادب ہیں۔ پروفیشنل ہیں۔ میں نے تو ابھی تک سب کو بہت اچھا ہی پایا ہے۔ پھل دار درخت ہی جھکتا ہے۔ اور نئے آرٹسٹوں کے ساتھ تجربہ کچھ اچھا نہیں رہا ہوگا تو ہوسکتا ہے کہ وقت کے ساتھ انہیں سمجھ آجائے کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تو پھر وہ جو بوئیں گے وہی کاٹیں گے بھی، میں نے اپنے کیریئر میں اپنے سینئرز کے ساتھ بہت کام کیا ہے اور ہمیشہ سب کو عزت دی ہے۔ شاید اسی کا صلہ ہے کہ آج کے جونیئر میری بہت عزت کرتے ہیں۔"

"چلیں...... اب بتائیں کہ آپ کی بیگم ثنا کیسی ہیں اور بیٹی ماشاء اللہ سے کتنی بڑی ہو گئی ہے؟"



"عنایا بیٹی ماشاء اللہ سات سال کی ہوگئی ہے اور اسکول بھی جاتی ہے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اور ثناء کے بارے میں تو آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ ہاؤس وائف ہیں اور جو ہاؤس وائف کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ وہ بہت اچھے طریقے سے نبھا رہی ہیں اور میری بیگم میرے لیے بہت بڑی سپورٹ ہیں۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ان شاء اللہ پھر بات ہوگی۔"

سعد علی قریشی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"لگتا ہے، بہت مصروف رہے ہیں..... ٹائم ہی نہیں ہے آپ کے پاس؟"

"جی الحمدللہ کافی مصروفیات ہیں، کچھ ڈرامے انڈر پروڈکشن ہیں"

"ہوں..... اچھا..... "محبوب آپ کے قدموں" میں کافی پاپولر ہوا..... آپ کو کیا رسپانس ملا؟"

"جی..... بہت زیادہ مقبول ہوا، اور بہت اچھا رسپانس ملا اس سیریل کی وجہ سے مزید راستے کھلے۔ مصروف تو پہلے ہی تھا، اب بہت زیادہ مصروف ہوگیا ہوں۔"

"اب تک کیا کیا کر چکے ہیں؟"

"محبوب آپ کے قدموں میں" تو ابھی حال ہی میں ختم ہوا ہے۔ اس سے پہلے "پکار" کیا۔ میرا برڈ" کی جاناں کون" وفا"، "خدا اور محبت"۔

"محبوب آپ کے قدموں میں" آپ کے خیال میں کتنا حقیقت سے قریب تھا؟"

"یقیناً رائٹر کے تجربات اور مشاہدات ہوں گے تب ہی انہوں نے یہ سیریل لکھا۔"

"ویسے اتنی ٹوٹ کے محبت کسی نے کی جتنی اس ڈرامے کے کردار شازیہ نے کی؟"

"قہقہہ...... چھوڑیں اس سوال کو، ویسے آج کل کے دور میں اتنا جنونی کوئی نہیں ہوتا۔"

"ہاں...... یہ تو ہے...... یہ بتائیں کہ پہچان کس سیریل یا ڈرامے نے دی آپ کو؟"

"ایک ڈرامہ ہوا تھا۔ "تیری میری جوڑی" اور "پکار" نے اور اب "محبوب آپ کے قدموں میں" نے شہرت دی، پہچان دی۔

"ٹی وی پر آمد کیسے ہوئی؟"

"ٹیلنٹ ہنٹ" کے ذریعے سے اس فیلڈ میں آیا۔ اور فیملی نے بہت زیادہ سپورٹ کیا۔ اس وجہ سے آج اس فیلڈ میں کامیاب ہوں کہ ان کی دعائیں اور سپورٹ میرے ساتھ ہے۔"

"اس کو پروفیشن بنانا ہے آپ نے؟"

"فی الحال تو یہی ہے کہ کچھ اور کرنے اور سوچنے کا ٹائم ہی نہیں ملتا۔"



جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ف۔ج

کافی عرصے سے یہ مقبول سلسلہ پڑھ رہی ہوں اور اس کی بدولت بہت سی بہنیں اپنا حال دل سناتی ہیں اور یہ سوالات و جوابات ان بہنوں کے لیے فائدے مند ہیں جو ابھی کنواری ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکیوں کو تعلیم یافتہ اور پراعتماد ہونا چاہیے تاکہ کوئی ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی نہ کر سکے۔ شادی کے بعد ہر عورت اپنے شوہر اور بچوں میں مگن ہو کر اپنی زندگی میں اپنے لیے وقت نکالنا چھوڑ دیتی ہے اور پھر بعد میں چند وجوہات کی بنا پر ڈپریشن، بلڈ پریشر اور مختلف بیماریوں کے مسائل نکلتے ہیں تو تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ شادی کے بعد بھی کچھ وقت دن یا ہفتے میں ایک بار اپنا پسندیدہ کام کریں یعنی یہ سبق آموز رسائل ضرور پڑھیں یا کچھ ایسا جس سے آپ ذہنی طور پر پرسکون رہیں نماز وقرآن کی باقاعدگی بھی کریں۔ اپنے لیے بھی کچھ وقت نکالیں۔ اپنے والدین یا رشتہ داروں سے بات، کبھی کبھی اپنی اسکول کی سہیلیوں سے بھی کریں تاکہ آپ پرسکون رہیں پھر ہی تندرست رہیں گی جو دکھ ملنے ہیں وہ تو ملنے ہیں مگر خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کریں، یہ تجاویز ان بہنوں کے لیے جو مختلف ذہنی امراض کا شکار ہیں، اب سوالات کی طرف چلتے ہیں جہاں پر بیالیس سالہ زندگی کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا۔

س: ''شادی کب ہوئی؟''

ج: ''میری شادی سردیوں میں 14 نومبر 1997ء میں ہوئی۔ بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں سات بھائیوں کی بہن ہوں اور ہم دو بہنیں ہیں۔ فریدہ باجی سب سے بڑی ہیں۔ اس کے علاوہ خالہ زاد کزنیں بھی ہیں۔ جن میں نائلہ، مسرت، شاہین اور زبیدہ۔ اور شائلہ میری پیاری سہیلیاں رہی ہیں۔''

س: ''شادی سے پہلے کیا مشاغل رہے؟''

ج: ''پورے گھر کی لاڈلی رہی۔ تعلیم میٹرک تھی۔ رسالے پڑھتی تھی کہ میرے پولیس والے بھائی سرور بھی رسالوں کے شوقین تھے اور اپنی کزنوں جن کا پہلے سوالات میں ذکر کیا ہے، ان کے ساتھ کھیلنا اور واجد اور انور بھائی کے ساتھ پتنگ اڑانا، گول گپے، چاٹ، دہی بڑے، لچھا اور پتیسا اسکول کے بعد راستے میں کھانا۔ کبھی ردی والے کو اپنی پرانی کتابیں اور کاپیاں بیچ کر لچھا اور پتیسا کھاتی تو کبھی میرے ابو میرے لیے امرتی لاتے اور دودھ والا پولاک برف میں ڈال کر کھاتی تو کبھی بڑے بھائی فرمائش پر گولا گنڈا لاتے۔ چھپن چھپائی اور پکڑن پکڑائی اور گڑیا کے ساتھ کھیلتی۔ پرانے پی ٹی وی کے ڈرامے دیکھتی۔ الغرض شادی سے پہلے بڑا سکون تھا، بڑا لاڈ اٹھوایا اور پیار ملا۔ شاید بعد میں امتحان سے گزرنا تھا اس لیے پہلے ہی اتنا پیار ملا۔ مگر قسمت سے ہم لڑ نہیں سکتے شاید عورت کی زندگی میں صبر کرنا لازمی ہے۔''

س: ''کیا رشتے میں مرضی شامل تھی؟''

ج: ''پہلے کا دور بہت سیدھا تھا اور ہمارے خاندان کا ماحول ایسا نہ تھا کہ والدین سے ایسی بات کریں تو والدین کی مرضی پر ہی سر جھکا دیا تھا۔''

س: ''جیون ساتھی کے حوالے سے کیا تصور تھا؟''

ج: ''مجھے شادی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ گھر میں ہی اتنی محبتیں ملی تھیں اور کچھ ماحول کا اثر تھا کہ اس حوالے سے کوئی خیالات ہوتے۔ پہلے نہ یہ آج کے موبائل تھے، نہ نیٹ اور ٹی وی پر بھی ایسے کوئی ڈرامے نہیں آتے تھے کہ عشق و محبت کا کوئی تصور یا جیون ساتھی کا کوئی تصور کیا جائے۔ اب۔ سب اتنا فاسٹ ہو گیا ہے۔ آج تو پندرہ سال کی لڑکیاں شادی کے مطالبات کرتی ہیں۔ یہ سب معاشرے کی خرابی ہے جو یہودیوں کی ایجادات کا اس قدر منفی استعمال ہو رہا ہے۔ میری انیس سال کی عمر میں شادی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے بھی بچوں والی سوچ ہی تھی۔ آج کی طرح ٹین ایج والی کوئی بات نہیں۔''

س: ''منگنی کتنے عرصے رہی؟ کوئی ملاقات یا فون پر بات ہوئی تھی؟''

ج: ''منگنی ایک سال رہی۔ ان لوگوں کو تو شادی کی جلدی تھی مگر میرے ابو نے کہا تھا کہ پہلے اپنا گھر بنواؤ پھر اپنی بیٹی کی شادی کروں گا۔ شکر ہے آج اپنا گھر ہے۔ فون پر کوئی بات نہ ہوئی۔ ان کے گھر ٹیلی فون نہیں تھا۔ ملاقات منگنی کے بعد میری پھپھو کے بچوں کی شادی میں ہوئی تھی

مگر کوئی بات چیت نہیں، بس دیکھا تھا پھر ہمارے گھر یہ منگنی کے بعد آئے تو میری امی نے ان سے کہا کہ اب سہرا باندھ کر ہی آنا۔ شاید اسی بات سے چڑ گئے تھے میرے شوہر کہ شادی سے پہلے مجھے سسرال آنے کی اجازت نہ دی۔ میکہ سکھر میں ہے اور یہ ملتان کے تھے۔ ان کے بھی سندھ میں رشتہ دار رہتے تھے تو ادھر جاتے ہی تھے۔"

س: "شادی سے پہلے سسرال والوں کے متعلق کیا خیالات تھے؟"

ج: "کیونکہ مجھے اپنے گھر میں بہت زیادہ پیار ملا تھا تو ذہن میں تصور نہ تھا کہ سسرال ایسا نہیں ہوگا۔ میں یہ ہی سوچتی تھی کہ سسرال میں بھی پیار ملے گا۔ شوہر اور نندیں عزت کریں گی۔ اچھی اور سکون بھری زندگی ہوگی۔ میں بھی اپنے اخلاق و کردار سے ان کے دل میں جگہ بناؤں گی۔ جیسے میری بڑی بہن فریدہ اپنے گھر میں خوش ہے، ایسے ہی میں بھی خوش رہوں گی۔ میرے شوہر بھی میرے بہنوئی کی طرح عزت کرنے والے اور اچھے ہوں گے۔ یہ ہی خیالات تھے ہمارے شادی سے پہلے۔"

س: "شوہر نے شادی کی رات دیکھ کر کیا کہا اور منہ دکھائی میں کیا ملا؟"

ج: "منہ دکھائی میں انگوٹھی ملی اور کوئی تعریف نہ کی بلکہ وہ ہی روایتی باتیں ہوئیں کہ میری ماں، باپ اور بہنیں اور خاندان وغیرہ وغیرہ۔ کوئی عہد و پیمان نہ ہوئے۔ کاش مائیں اپنے بیٹوں کو یہ بھی بتائیں کہ جو لڑکی سب کچھ چھوڑ کر آئی ہے، تم اس کی عزت کرنا اور اس کے جذبات کا خیال بھی رکھنا۔"

س: "شادی کے لیے کوئی قربانی دی؟"

ج: "جی ہاں۔ اپنی شادی شدہ زندگی بچانے کے لیے قربانیاں دیں۔ بہت کچھ برداشت کیا۔ تفصیل نہیں بتا سکتی۔ ہاں جب لڑائی جھگڑے ہوئے بیٹا بھی چھوٹا تھا تو میں میکے میں تھی۔ ماں باپ نے کہا کہ چھوڑ دو اپنے شوہر کو تم ہمیں کوئی مسئلہ نہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب ہے مگر وہی عورت کی عادت کہ برداشت اور سمجھوتا تو گھٹی میں لکھا ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کا سوچا اور واپس چلی گئی کہ اولاد بڑی ہوگی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اب کچھ امید نظر آتی ہے۔ بچے بہت خیال کرتے ہیں اور کوئی کرے نہ کرے۔ بیٹا ہی ہر بات کا خیال رکھتا ہے۔ مما اپنی ذہنی خوشی کے لیے بھی کچھ کرو۔ جنید ہی رسالے لا کر دیتا اور خط پوسٹ کرتا ہے، وہی مشورے دیتا ہے کہ خوش رہو۔ سروے کے شروع میں بھی باتیں اس نے لکھوائی ہیں کہ سائیکولوجی میں دلچسپی ہے اور مستقبل میں ماہر نفسیات بننے کا ارادہ ہے۔ دعا کرنا بہنوں کہ اس کا ایڈمیشن ہو جائے اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔"

س: "شادی خیریت سے سرانجام پائی یا رسموں کے لین دین پر کوئی بدمزگی ہوئی؟"

ج: "ملتان سے سکھر ٹرین کے ذریعے بارات جا رہی تھی۔ سارے راستے ٹرین ٹھیک مگر آخر میں جا کر رک گئی۔ گھر والے سب پریشان تھے، کیا ہو گیا، بارات کیوں نہیں آئی۔ 1997ء میں موبائل نہیں تھے اور ٹیلی فون بھی ہمارے اور ان کے گھر نہیں تھا۔ جو بارات صبح آٹھ بجے آنی تھی وہ دوپہر کو تین بجے آئی۔ میری امی اور ابو بڑے پریشان تھے کہ شاید دولہا والے نہیں آئیں گے۔ ہاں رسموں میں بدمزگی تو نہیں مگر مزا بہت آیا۔ دودھ پلائی اور جوتا چھپائی باجی فریدہ، کزن مسرت، زبیدہ اور شاہین نے کی تو میرے میاں جی کو بڑے سائز کے گلاب جامن تینوں نے ایسے کھلائے کہ میرے شوہر پیچھے کو گر رہے تھے۔ میرے دو نندوئی بھی شوہر کے دائیں اور بائیں طرف پان کھلانے میں نخرے کر رہے تھے تو ان کو منہ بھر کر پان بھی کھلائے گئے، یہاں تک کہ وہ بھی پیچھے کو زبردستی پان کھاتے ہوئے گر گئے۔ میری بھابھی ثمینہ اور چچی فائزہ نے دونوں نندوئیوں کے اوپر مذاق میں آٹا پھینک دیا کہ وہ پان کھانے میں نخرے کر رہے تھے۔ مگر نندوئیوں نے کسی بات کو مائنڈ نہیں کیا۔ اس سب میں بڑا مزا آیا۔ ہر کوئی ان پر ہنس رہا تھا۔ آج جب شادی کی مووی (جو فلیش میں کروائی ہے پہلے کیسٹ میں تھی) میں جوتا چھپائی کی رسم ہم دیکھتے ہیں تو بچوں کو بھی مزا آتا ہے مووی دیکھنے کا۔"

س: "شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا آپ نے؟"

ج: "تقریباً بیس دن بعد کام شروع کیا کہ میری آٹھ نندیں ہیں۔ سب نے دعوت کی کیونکہ میاں جی بھی آٹھ بہنوں کے ایک ہی بھائی ہیں۔ تب سے ایسا کام شروع کیا کہ ابھی تک کر رہے ہیں۔ ہاں اب بچے بھی کام کرواتے ہیں۔"

س: ”کیا میکے اور سسرال کے کھانے اور انداز میں فرق محسوس ہوا؟“

ج: ”جی ہاں، بالکل۔ ہمارے گھر میں ہر ایک کی فرمائشی چیز بنتی تھی۔ جو دل کرتا تھا وہ ہی بنتا تھا اور ذائقہ بھی اچھا تھا۔ میکے میں میری باجی فریدہ اور بھابھی ثمینہ ہمیشہ بل دار ڈبل پراٹھا پوری کی طرح بناتی تھیں اور ہر چیز وافر مقدار میں موجود ہوتی تھی۔ شوہر کے گھر کافی کفایت شعاری سے کام لیا جاتا تھا کہ شوہر نے ہی میری نندوں روبینہ اور ثمینہ کا بیاہ کرنا تھا۔ یہاں کے ذائقے میں فرق تھا۔ سادہ غذا بنتی تھی۔ پراٹھے پر کم گھی لگایا جاتا تھا اور بھی بہت کچھ ہے بتانے کو مگر طوالت نہ ہو جائے۔ اس لیے ذکر نہیں کر رہی۔

س: ”میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق تھا؟“

ج: ”ہمارا میکہ مذہبی رجحان کا حامل تھا۔ وہاں بڑوں سے زیادہ بات یا ہنسی مذاق نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنی باجی یا کزنز سے ہنسی مذاق کر لیا اور سسرال میں ہر کوئی ہنستا بولتا ہے۔ ہر وقت آنا جانا لگا رہتا تھا۔ میری نندیں آتی جاتی رہتی تھیں پھر میری ساس اللہ جوار رحمت کرے، بڑی ملنسار خاتون تھیں۔ ان کی موجودگی میں گھر میں رونق تھی اور اب بھی ہے۔“

س: ”سسرال میں کب تعریف اور کن باتوں پر تنقید ہوئی؟“

ج: ”یہ سوال میرے لیے بڑا پیچیدہ ہے۔ تعریف تو باہر والے ہی کرتے تھے۔ کوئی پڑوسن یا نندوں کے سسرال والے تعریف کرتے تھے۔ کھانا پکانے پر بھی تعریف ہوئی اور میرے سسرالی رشتہ دار میرے اخلاق سے بھی متاثر تھے۔ تنقید تو اتنی ہوئی کہ الفاظ ہی کم پڑ جائیں گے۔ آپ سمجھ گئی ہوں گی، ہر بات، ہر کام میں ہی روک ٹوک ہوتی تھی۔ یہ جواب بڑا طویل ہو جائے گا اور سسرال کی باتیں کھل جائیں گی، اس لیے اس سے زیادہ نہیں لکھتی۔“

س: ”سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟ گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی تھی؟“

ج: ”اگر مختصر جواب دوں، ان سوالات کا تو جواب سو فیصد نہیں ہے۔ نہ وہ مقام ملا اور یہ خواہش ہی رہی میرے سے بھی کوئی رائے لی جائے اور یہ بات تو اب تک ہے کوئی اہمیت نہیں۔“

س: ”بچوں کی پیدائش کے موقع پر تبدیلی اور سسرال والے اور شوہر...... کیا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا آپ کو؟“

ج: ”اس سوال کا جواب بھی بہت تلخ ہے اور طویل ہے۔ میں اس سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ قلم کن الفاظ میں داستان رقم کرے۔ اس سوال پر ذہنی کشمکش کا شکار ہو گئی ہوں۔“

س: ”آپ نے سسرال کا ماحول بہتر بنانے کی کیا کوشش کی اور آپ کس حد تک کامیاب ہوئیں؟“

ج: ”شاید آپ سوچیں کہ اس سوال کا جواب آپ سوال کے مطابق کیوں نہیں دے رہیں، مگر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ آج کی مائیں اپنی آنے والی بہوؤں کے لیے وہ سوچ کیوں نہیں رکھتیں جو اپنی بیٹی کے لیے رکھتی ہیں۔ آپ کا داماد آپ کی بیٹی کے ساتھ خوشی خوشی آئے اور دن گزارے۔ سالیوں سے سالوں سے گفتگو کرے اور بیٹا سسرال کی شکل تک نہ دیکھے۔ معاشرے میں یہ تضاد کیوں ہے۔ ہم کیوں اپنی اور دوسروں کی بیٹیوں کے لیے یکساں نہیں سوچتے۔ مائیں بیٹے کو نصیحت کرتی ہیں، بیوی کو سر پر نہ چڑھانا زیادہ، یہ اپنے داماد کو بھی کہیں۔ فرق کیوں رکھا جاتا ہے۔

اس فرق کی بناء پر رشتوں میں دراڑ پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ ناجائز کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ اس کے ساتھ اس انسان کو اس دنیا میں ہی دکھا دیتا ہے۔ ہم کسی کے ساتھ ناانصافی کرتے ہوئے کیوں نہیں سوچتے کہ ہمارے ساتھ بھی کوئی ناانصافی کر سکتا ہے۔

چاہے ساس ہو یا نند، دیورانی ہو یا جٹھانی، بھابھی ہو یا کوئی رشتہ۔ کوئی غلطی ہو بھی تو سب کے سامنے شرمندہ کرنے کے بجائے اکیلے میں آگاہ کیا جائے اور بہوؤں کو بھی برداشت سے کام لینا چاہیے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساس اور نندیں شادی کے بعد بھی بھائی اور بھابھی کے معاملات میں ٹانگ اڑائیں۔

جو نندیں اپنی شادی سے پہلے اپنی بھابھیوں کے دل سے اتر جائیں تو بھی ماں باپ نے ہمیشہ زندہ نہیں رہنا۔ کل کو بھابھی کے منہ کو ہی میکہ ہوتا ہے۔ لہٰذا کوشش کریں کہ شادی سے پہلے بھی خوش گوار تعلقات ہوں۔ شوہر کو بھی چاہیے کہ وہ رشتوں میں توازن رکھے۔ صرف کسی ایک طرف کا ہو کر نہ رہے۔ زندگی اتنی مشکل نہیں، انسان خود اپنی زندگی کو مشکل بناتا ہے۔

آپ نے میرا تعارف ''شعاع کے ساتھ ساتھ'' شائع کیا۔ بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ وہ تو دس ستمبر کو آنٹی شہناز نے آکر بتایا کہ ثانیہ تو چھا گئی۔ میں گھر کے صحن میں پودے لگا رہی تھی۔ مجھے ان کی بات سمجھ میں نہ آئی۔ آنٹی کے جانے کے بعد خالہ نے بتایا کہ تمہارا نام آیا ہے شعاع میں۔ لیکن مجھے پھر بھی یقین نہ آیا۔ شام کے وقت باہر کھیتوں میں گئی تو خیال آیا کہ کیوں نہ آنٹی سے شعاع منگوا کر دیکھ لیا جائے۔ اقرا اور میں نے جا کر ان کا دروازہ بجایا۔ پھر وہیں کھیتوں میں بیٹھ کر شعاع کھولا۔ جب دیکھا تو اور زیادہ خوشی ہوئی کہ اقراء کا بھی ساتھ تھا۔ آپی ہمارے گاؤں کا نام منصور والا ہے۔ اتنا پیارا۔ پرامن اور خوب صورت گاؤں شاید ہی کوئی اور ہو۔ ہمارے گاؤں کی برادریاں راجڑ، بروہی، سہٹر وغیرہ سب ایک دوسرے کے دکھوں میں شامل ہوتے ہیں۔ مل کر خوشیاں مناتے ہیں، چوری ہو جائے تو پورا گاؤں ایک ہو جاتا ہے۔ چور پکڑا جائے تو اس بے چارے کا بچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہمارے گاؤں کے لوگ بہت پرامن اور باشعور ہیں یہاں کبھی جھگڑے نہیں ہوئے۔ قتل نہیں ہوا۔

گاؤں کی شادیوں میں بہت مزا آتا ہے۔ سب کے سب شادی میں شرکت کرتے ہیں۔ غم میں غم زدہ کو بالکل بھی اکیلا نہیں چھوڑا جاتا۔ کوئی مشکل میں ہو، غربت میں ہو، تکلیف میں ہو، گاؤں کے لوگ خوش نہیں ہو پاتے۔ اللہ تعالیٰ میرے پیارے گاؤں کو نظر بد سے بچائے۔

☆ پیاری ثانیہ! آپ کے گاؤں کے بارے میں جان کر خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔ ہمارے پیارے ملک میں زمین کا ایک خطہ ایسا بھی ہے جہاں اتنا پیار و محبت ہے۔ جہاں سب مل کر رہتے ہیں، ایک دوسرے کے غم میں شریک ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس امن و محبت کو قائم رکھے، آمین۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مریم فاطمہ گاؤں گولڑہ ضلع گجرات سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ڈائجسٹ کب پڑھنے شروع کیے میں نے؟ اچھا اچھا بتاتی ہوں۔ آٹھویں کلاس میں شروع کیے اور اب ایم۔ایس۔سی زوولوجی کر رہی ہوں۔

اچھا تو پسندیدہ رائٹرز کا پوچھ رہے ہیں۔ وہ تو بہت ساری ہیں مگر موسٹ فیورٹ نمرہ احمد، سمیرا حمید، ہاشمل رضا، فرزانہ کھرل اور عمیرہ احمد۔ لیکن باقی بھی اچھا لکھتی ہیں۔ ناولز میں فیوٹ پوچھ رہے ہیں، وہ بھی بے شمار۔ مثلاً جنت کے پتے، نمل، حالم۔ سمیرا حمید کے سارے۔ میں خود سوال خود ہی جواب لکھ رہی ہوں۔ مجھے پتا تھا کہ آپ سب یہی جاننا چاہتے ہیں۔ آئندہ بھی لکھوں گی اور کہانیوں پر تبصرہ کروں گی۔

☆ پیاری مریم! آپ کی آمد، ہم کو کیسی لگی؟ یہی جاننا چاہتی ہیں نا آپ؟ تو بھئی ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی۔

خط بخیریت اپنی منزل یعنی ہم اور ہمارے قارئین تک پہنچ گیا۔ اب ہم آپ کے تبصرے کے منتظر ہیں۔

حرمین میرب لکھتی ہیں

خط لکھنے کی وجہ آپ کے ادارے کا عمدہ معیار ہے۔ جس طرح سے آپ اپنے شمارے کی تعریف کے ساتھ ساتھ قارئین کی تنقید کو بھی خوب صورتی سے قبول کرتی ہیں، یہ مجھے بے حد پسند ہے۔ مجھے شروع سے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اپنا افسانہ آپ کو بہت امید، شوق اور یقین کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ میرے گھر والے بالکل بھی مجھے اس بات کی اجازت نہیں دے رہے کہ میں کوئی خط یا افسانہ لکھوں۔ بہت مشکل سے ان کی منت سماجت کر کے انہیں یہ خط پوسٹ کرنے پر راضی کیا ہے۔

میری امی اور بہنیں بھی آپ کے تمام شمارے پڑھتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ خط لکھنے اور پوسٹ کرنے سے ڈرتی ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ خط لکھنے سے کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔

☆ پیاری میرب! آپ اطمینان رکھیں۔ ہمیں خط

بقیہ صفحہ نمبر 244 پر

ماہنامہ کرن

نومبر 2020ء کے شمارے کی ایک جھلک

- نیوز کاسٹر "نازمین الطاف" سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اداکارہ "انعم فیاض" کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "گڑیا راجپوت" کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کے سلسلے وار ناول کی آخری قسط،
- "کنارِ خواب جو" فرح بخاری کا مکمل ناول،
- "روپ کے شیدائی" منعم ملک کا ناول،
- "کانچ سے سائبان" مصباح علی سید کا ناولٹ،
- "جھانسی کی رانی" صدف آصف کا ناولٹ،
- "بچھڑنا بھی ضروری تھا" عطیہ خالد کا ناولٹ،
- اُم اقصیٰ، اُم ہانی، عندلیب زہرا، عبادت شاہ اور طیبہ چوہدری کے افسانے اور مستقل سلسلے،

"کرن کتاب"

دلہن کی پریشانی آنکھوں میں حلقے، حنا کا گہرا رنگ ہی سب کو بھائے، چکوترے کے 25 فوائد،
اف: یہ غصہ کیوں؟ کچن اور آپ، کرن کا دسترخوان مزے دار ریسپیز کے ساتھ۔

نومبر 2020ء کا شمارہ شائع ہوگیا

''سوال کیا گیا کہ کیا گناہ گار ہمیشہ اللہ کی خوشنودی کو ترستے رہیں گے؟''
جواب دیا گیا کہ اللہ پر صرف اللہ والوں کا حق ہوتا تو انبیاء کے علاوہ کوئی نور القلوب کا حق دار نا ٹھہرتا۔''

☆☆☆

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔
صبح کا وقت تھا اور ہر طرف دھند کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں واضح طور پر دیکھنے سے قاصر تھیں۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر سامنے کی جانب دیکھا۔
وہ ذرا اونچے اور نوکیلے سے مقام پر بیٹھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چوٹی کے سرے پر بیٹھے ہیں۔ وہاں سے وہ صرف اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ وہ ایک چراگاہ معلوم پڑتی تھی۔ ہر طرف ہریالی اور سبزے کی مخصوص سی مہک تھی۔ اسے تو اس جگہ میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی۔
اس نے سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کی یادداشت الجھی ہوئی تھی۔ مانسہرہ اس کا روز کا آنا جانا تو نہیں تھا لیکن چونکہ یہ کھیت کھلیان چراگاہیں اور پہاڑ اس کے راستے میں پڑتے تھے تو وہ ناموں کی حد تک واقف ضرور تھا۔ اسے یہ شام لئی کا علاقہ لگا لیکن وہ کچھ بولا نہیں تھا
''یہ جو بھی جگہ ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔'' وہ اسے خاموش پا کر کہہ رہی تھی۔
''تم لڑکیاں ہر چیز میں خوبصورتی کیسے ڈھونڈ لیتی ہو؟''
وہ اپنے مخصوص لٹھ مار انداز میں بولا تھا۔ اسے خود نہیں پتا تھا کہ وہ اکتایا ہوا کیوں ہے لیکن وہ تھا۔ اس کے اس سوال پر اس نے چہرہ موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور چند لمحے دیکھتی رہی۔

تنزیلہ ریاض

نور القلوب





’’نہیں۔ تم غلط سمجھے۔ مجھے یہ گھاس پھونس خوب صورت نہیں لگ رہی۔ مجھے یہ لمحہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ کیونکہ میں یہ لمحہ تمہارے ساتھ جی رہی ہوں۔‘‘ وہ سادہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی پھر یک دم اس کی جانب گردن موڑ کر بولی۔

’’یہ جگہ بدصورت بھی ہوسکتی ہے۔‘‘ اس کا لہجہ پُراسرار سا ہوگیا تھا۔

’’کیسے؟‘‘ اس کے انداز میں تجسس نہیں تھا فقط ایک سرسری سا سوال تھا۔ وہ مسکرائی۔ اس کے قریب ہوئی پھر بولی۔

’’ایسے۔‘‘ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، اس نے اسے پوری قوت سے دھکا دے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف ناک تحیر چمکا تھا۔

’’لاریب ب ب......‘‘ نوکیلے پتھروں پر لڑھکتا ہوا وہ چلایا تھا۔ اس کی سماعتوں نے پہاڑوں میں گونجتا ہوا اس کا نام سُنا تھا اور اس کے بعد اسے ہوش آگیا تھا۔

☆☆☆

’’یہ صندل بی ہیں۔ یہ جس کے لیے دعا کردیں۔ وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔‘‘

دالان سے ہال کی جانب آتے ہوئے اس کے ساتھ چلتی خاتون نے اپنے مخصوص لہجے میں اسے بتایا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔

’’نظریں تو اٹھاؤ۔ اتنا پُرنور چہرہ دیکھا ہے پہلے کبھی؟‘‘ وہ پھر بولی تھی۔ اسے اتنی دور سے کیا نظر آسکتا تھا اور اب جب آہی گئی تھی تو اتاولی ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ ان سے ملاقات ہوتی تو انہیں دیکھ ہی لیتی۔

وہ روشنی کی تلاش میں بہت دور تک آئی تھی۔ اتنی دور کہ اسے اب واپسی کا راستہ ملتا دکھائی نہ دیتا تھا لیکن اسے امید تھی کہ وہ درست جگہ آئی ہے مگر ایسا نہیں تھا۔

’’تم غلط جگہ آگئی ہو اور وہ بھی غلط مقصد لے کر۔‘‘

دودھیا رنگ کے لباس میں ملبوس اوائل صبح جیسی سحری خاتون نے اس کے سامنے پڑے دیوان پر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تھا۔ اسے دل ہی دل میں جھٹکا لگا۔ وہ تو ابھی ان کی ظاہری شخصیت کے سحر سے نکل بھی نہیں پائی تھی کہ انہوں نے اسے روحانیت سے چت کرتے ہوئے اس کی آمد کا مقصد بھی بھانپ لیا تھا۔ وہ بھی بنا اس کے بتائے۔

’’صندل بی!‘‘ اس نے تھوک نگل کر ان کو پکارنا چاہا اور ڈرے ڈرے انداز میں نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ ان کے متعلق اسے جو بھی بتایا گیا تھا کم بتایا گیا تھا۔

وہ جو کہانیوں کی کتابوں میں حسین و جمیل ملکاؤں کا تذکرہ ملتا ہے نا، بالکل ویسی تھیں وہ۔ ان کے وجود سے روشنیاں پھوٹتی محسوس ہوتی تھیں۔ بنانے والے نے اپنا ہنر جیسے دل کھول کر استعمال کیا تھا۔ ان کے ہر نقش میں عجیب ملاحت سی گندھی محسوس ہوتی تھی۔ چہرے پر نرمی نے ایک الگ حصار باندھ رکھا تھا۔ ان کے لباس میں ہی نہیں انداز میں بھی ایک عجیب سا تمکنت اور شاہانہ پن تھا۔ وہ بلاشبہ ایک ایسی شخصیت کی مالک تھیں کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔

قصہ مختصر وہ خوبصورت تھیں، طرحدار تھیں لیکن بے حد دین دار تھیں۔ شنید تھی کہ ان کی دعائیں رد نہیں ہوتی تھیں۔ ان کی اس علاقے میں ہی دھوم نہیں تھی بلکہ قرب وجوار میں بھی ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ صندل بی جس کو سایہ عافیت میں لے لیتی تھیں اسے نور القلوب مل جایا کرتا تھا، تب ہی تو ان کی درس گاہ کا نام نور القلوب رکھا گیا تھا۔ وہ اتنا لمبا سفر کرکے اسی لیے تو ان سے ملنے آگئی تھی اور آتے ہی چاروں شانے

چت ہوگئی تھی۔
اسے اگرچہ حسین چہروں سے فٹافٹ مرعوب ہوجانے کی عادت تھی حالانکہ اس کے بڑوں نے اسے بڑے صحیح وقت پر سکھایا تھا کہ خوب صورتی ہر امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوکر بھی محبت کے امتحان میں ناکام ہوسکتی ہے سو اس چیز پر بھروسا ذرا کم ہی کرنا لیکن بڑوں کا سکھایا ہوا سبق عجیب پھسلن آمیز ہوتا ہے۔ ایک کان سے اندر ڈال، دوسرے سے پھسل کر باہر۔ سو اس کا اپنے سامنے بیٹھی خاتون سے انہیں دیکھتے ہی متاثر ہوجانا کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن بات یہ تھی کہ ان کی آنکھوں میں جو بجلی کی طرح چمکتی کاٹ تھی وہ اسے پریشان کررہی تھی۔ ان کے اس قدر دوٹوک بیان پر ایک لمحہ کے لیے تو وہ گڑبڑا ہی گئی۔ انہیں پکارنے کے بعد منہ سے مناسب الفاظ ہی نہ نکل سکے۔ وہ حیران تھی کہ اس نے ابھی کچھ بتایا ہی نہیں تھا تو انہیں کیسے پتا چل گیا پھر جیسے خود ہی اس نے یہ پزل حل کرلیا تھا۔
”حق ہے! اتنی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ بھلا اللہ والوں سے کیا چھپا سکتا ہے کوئی؟ انہیں سب خبریں پہلے سے ہی ہوتی ہیں۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“
اس تاویل سے اس نے اپنے دھک دھک کرتے دل کو راضی کرنا چاہا جو کہ ہو نہ سکا۔ وہ تو حقیقی معنوں میں دم بخود رہ گئی تھی۔
”اس قدر حیران مت ہو۔ اور مجھ جیسی گنہگار کو کسی اونچے تخت پر بٹھا کر کوئی مفروضے قائم کرکے ہلکان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہارے چہرے پر یہ جو بڑا بڑا لکھا ہے نا کہ محبت کے نام پر خوار ہوکر تھک چکی ہو اور اب ایسا تعویذ ڈھونڈتی پھرتی ہو جو تمہارے دل کو سکون بخش دے، اسے باہر کھڑا چوکیدار بھی با آسانی پڑھ سکتا ہے۔ اسے بھی عادت ہوچکی ہے اور میں بھی جانتی ہوں بلکہ سب کو پتا ہے کہ تم آج کل کی لڑکیوں کو ”محبوب قدموں میں“ والے تعویذ کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے ہوتا۔“
وہ سخت لہجے میں کہہ رہی تھیں لیکن اللہ جانے ان کے وجود میں ایسا سنہرا سنہرا سا کیا تھا کہ ان کے اس قدر دوٹوک بیان نے بھی اسے بدمزہ نہ کیا۔
”صندل بی! مجھے ”محبوب قدموں میں“ والا تعویذ نہیں چاہیے۔ محبوب کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ دل کی مسند پر بٹھایا جاتا ہے۔ میں کیوں چاہوں گی کہ محبوب قدموں میں ہو۔ محبوب کو قدموں میں گرا کر کیا مل جائے گا مجھے۔ اور ایسی گرے ہوئے محبوب کا میں کروں گی کیا؟“
وہ ایسے بولی تھی جیسے کوئی ناراض بچہ ماں سے شکایت کررہا ہو۔
صندل بی جو پہلے پہل صندل بی بی کہلاتی تھیں لیکن پھر ان کا نام کثرت استعمال سے ”صندل بی“ ہوگیا تھا نے اس کے چہرے کو بغور دیکھا اور تب تک دیکھتی رہیں جب تک کہ اس نے اگل نہ دیا۔
”مجھے نور القلوب درکار ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا دل نجانے کیوں لرزنے لگا تھا۔ صندل بی کے چہرے پر اس کی بات سن کر لمحہ بھر کے لیے عجیب سی مسکراہٹ چمکی اور پھر غائب ہوگئی۔ وہ دیوان پر ذرا سا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی تھیں۔ اسے لگا شاید وہ اس سے متنفر سی ہوگئی ہیں تو اپنے لہجے کو مزید لاچار کرکے بولی۔
”میں بہت دور سے آپ کے پاس آئی ہوں صندل بی! مجھے اس تبرک کی تلاش ہے جو میرے دل کو ہر بوجھ سے، ہر غم سے آزاد کردے۔ میں چلتے چلتے تھک چکی ہوں۔ لیکن منزل نظر ہی نہیں آتی۔ سنا ہے آپ گناہ گاروں کو بھی وہ اسم اعظم بتا دیا کرتی ہیں جو ان کو منزل تک لے جاتا ہے۔“
”چپ ہوجاؤ۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ خاموش رہنا بھی عبادت ہے۔“
وہ ناگواری سے اسے جھڑک کر بولی تھیں۔ وہ ڈبک کر بیٹھ گئی۔

"اِدھر کا راستہ کس نے دکھایا؟" انہوں نے اس کے وجود سے نظریں ہٹائے بنا اپنے سامنے پڑے پاندان جیسی صندوقچی کا ڈھکن کھولتے ہوئے سوال کیا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔
"یہ مت پوچھیں۔ میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی۔" صندل بی نے سر ہلایا پھر بولیں۔
"تم بول بھی نہیں سکتیں۔ اور یاد رہے۔ آئندہ آنا ہو تو کسی محرم کے ساتھ آنا۔ منہ اٹھا کر کسی کو بنا بتائے آنے کی ضرورت نہیں۔ تم جیسے لوگ اپنے ساتھ ساتھ مجھے بھی گناہ گار کرتے ہیں۔" انہوں نے ایک ننھی سی کاغذ کی پڑیا نما پرچی اس کی جانب بڑھادی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ آگے کرکے تبرک کی طرح وہ پرچی وصول کی تھی جس پر بہت ننھا سا کرکے لکھا تھا۔
"نورالقلوب۔"

☆☆☆

"منزل سب کی ایک ہوتی ہے۔ لیکن راستے سب کے مختلف ہوا کرتے ہیں۔" اس نے سرگوشی کے انداز میں خود کلامی کرتے ہوئے کاغذ کی پڑیا کو بے حد نرمی سے کھولا تھا۔ کاغذ کی ایک ایک تہہ کھولتے ہوئے جیسے اس کا دل ایک نئی لے پر دھڑکنے کو بے تاب ہوا جارہا تھا۔ اس کمرے میں نیم تاریکی تھی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کمرے میں تاریکی ہی تھی اور وہ ذرا سی روشنی جو اس نیم تاریکی کو باریکی سے تاریکی سے علیحدہ کررہی تھی وہ کمرے کی کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرک جانے کے باعث ممکن ہوئی تھی۔ اسی تاریکی نے اسے اس پڑیا میں موجود سفید سفوف کو دیکھنے کے قابل بنایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک سی آگئی تھی۔ اس نے بے حد احتیاط سے اس سفوف کو میز کی چکنی سطح پر رکھا تھا پھر خود بھی آگے ہوکر بیٹھ گئی تھی اور انگلی کی مدد سے اسے پھیلانے لگی۔
"میں نے مشکل والا راستہ چنا ہے کیونکہ مشکل راستے مختصر ہوتے ہیں۔ جلدی ختم ہوجاتے ہیں۔" اس نے اس پھیلا کر رکھے گئے سفید سفوف کے درمیان میں دو لمبی لکیریں کھینچ کر اسے تین چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم کردیا اور پھر مزید پھیلاتے ہوئے ہموار کرنے لگی۔
"اور مجھے چیزوں کو جلدی ختم کرنا اچھا لگتا ہے۔"
ایک ننھی سی نلکی کی مدد سے بہت مہارت کے ساتھ اس سفوف کو ناک سے دھیرے دھیرے سونگھتے ہوئے بے حد مطمئن تھی۔ اسے کسی کا ڈر نہیں تھا، کسی کی پروا نہیں تھی۔ دروازے کی چٹخنی چڑھی ہوئی تھی اور وہ اس راستے پر چلنے کے لیے بالکل تیار تھی جو مختصر تھا مگر ٹیڑھا تھا۔
ایک ایسا راستہ جو اسے بھٹکا کر منزل سے دور کردینے والا تھا لیکن وہ چہرہ میز کی سطح کے بالکل قریب کیے اپنے آپ میں گم تھی۔ اس کے اپنے ہی اعصاب اس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوئے جارہے تھے۔ اس کا ہوش مدہوش ہوا چلا جارہا تھا۔
"نورالقلوب۔ جب آسانی سے نہ ملے تو چھین کر لینا پڑتا ہے۔"
سُرخ بھاری ہوتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس نے خود کو نصیحت کی تھی۔

☆☆☆

بگرام کے آخری سرے پر شہری آبادی سے ذرا الگ تھلگ سر اٹھا کر فخر سے کھڑی اس عمارت کا نام ہری حویلی تھا اور اس کا ٹھاٹ باٹ چندھیا دینے والا۔
سردیوں میں تو خیر سفیدی ہر رنگ پر حاوی رہتی تھی لیکن مارچ اپریل میں جب سنہری دھوپ کا دوشالہ اس کے وجود پر پڑتا تو اس کی چھب دور سے دیکھنے والوں کو مسحور کردیتی تھی۔ ایک جانب الائی کے سفیدے کی جالی سے ڈھکے پہاڑ، دوسری جانب سرسبز و شاداب چراگاہیں۔ ہری حویلی کے سحر سے آنکھیں خیرہ نہ ہوتیں تو کیا

ہوتیں۔
عقبی سمت میں تو خیر پہاڑ تھے لیکن سامنے کی جانب وسیع عریض گھاس سے ڈھکے قطعے تھے اور بڑے سے آہنی گیٹ کو پار کر کے اندر جانے پر بھی یہ قطعات سب سے پہلے خوش آمدید کہتے تھے۔ان سے علیک سلیک کے بعد آگے بڑھنے پر بڑا سا برآمدہ تھا جس کے مضبوط ستون کافی اونچے تھے۔
اس برآمدے میں بیٹھ کر چائے کے ایک کپ کی طلب بے پناہ بڑھ جاتی تھی اور طلب پوری ہونے پر ایسا گہرا سکون ملتا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔خان بابا کو عرصہ پہلے جب اس بات کا احساس ہوا یا شاید انہیں یہ احساس دلایا گیا تو انہوں نے فوراً اس حصے کے دوسری طرف دس بارہ کمرے بنوا کر اسے سیاحوں کے لیے مختص کر دیا تھا جبکہ عقبی سارا حصہ اپنی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ ہری حویلی اس لیے مشہور نہیں تھی کہ وہ ہری تھی بلکہ اس لیے مشہور تھی کہ وہ لال تھی لیکن اس کا نام ہری پڑ گیا تھا۔ہوسکتا ہے اس کی دیواروں میں سلیقے سے سر جوڑ کر قطار در قطار کھڑی لال اینٹوں کو بھی دل ہی دل میں اس بات کا قلق ہوتا ہو کہ ان کے حسن جوانی اور رنگ روپ کو خاطر میں نہیں لایا گیا لیکن بھلی مانسیں بظاہر چپ چپاتے حویلی کے چاروں طرف حصار باندھے کھڑی تھیں اور یوں ایک عرصہ سے ہری حویلی ہری ہی تھی اور اس کے اس اسٹیٹس کو کسی نے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ایک خان بابا کا بیٹا ہی تھا جو کبھی کبھی ضد میں آ کر گلے سے کہا کرتا تھا۔
”تم دیکھنا گلے ایک دن آئے گا جب اس حویلی پر میری ملکیت ہوگی۔تب میں اس کا نام تبدیل کر کے تربوز حویلی رکھ دوں گا۔کم از کم حدود اربع کے مطابق نام جچے گا تو سہی۔یہ کیا کہ سبزے سے اَٹے میدان میں لال حویلی بنا کر اس کا نام ہری حویلی رکھ دیا۔“
”خوشل خاناں۔تار بوز حویلی بہت مشکل نام ہے۔ام کو ہری حویلی ہی اچھا لگتا اے۔“
گلے بے چاری کو اس کی آدھی بات تو سمجھ میں ہی نہیں آتی تھی۔اور جتنی آتی تھی اس سے اختلاف کرنا اسے اپنا حق لگتا تھا۔
”اونہہ۔تم تو ہو ہی جھلی۔بس ہر جگہ ناک کٹوانا میری۔یہ نہیں کہ کسی جگہ میرا ساتھ دے دو۔میری ہاں میں ہاں ملا دو۔ویسے تم نے اگر کبھی میرا ساتھ دیا ہوتا نا گلے تو میں تمہارے خاوند کو سبق سکھا دیتا۔انہیں لگ پتا جاتا کہ میں چیز کیا ہوں۔اور یہ تار۔بوز کیا ہوتا ہے۔الفاظ کو بھی بریڈ سلائس سمجھ کر کیچپ لگانے کی عادت کب چھوڑو گی۔ہر لفظ سے پہلے ”الف“ لگانے سے ثواب ملتا ہے کیا نہیں؟ اچھے بھلے الفاظ کا سینڈوچ بنا دیتی ہو۔“
وہ جب موڈ میں ہوتا تھا تو اناپ شناپ بولے چلا جاتا اور گلے بس ہنستی رہتی لیکن جب اس کا مزاج بگڑ جاتا تھا تو کئی کئی دن کسی کی شکل نہ دیکھتا تھا۔اور گلے بے چاری اس کے آگے پیچھے پھرتی رہتی لیکن وہ اتنی جلدی راضی بھی نہیں ہوتا تھا۔بہر حال ہری حویلی کا نام کچھ بھی ہوتا۔اس کی رونق یہ دونوں ہی تھے۔ایک دوسرے کے ہمدم و ہم راز۔ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم۔ہری حویلی کا رہائشی حصہ ان دونوں کے دم سے آباد تھا۔

☆☆☆

”گلے۔تمہارا خاوند سو گیا ہے کیا؟“
اس نے دروازہ ذرا سا کھول کر کمرے میں جھانکتے ہوئے دھیرے سے سوال کیا تھا۔وہ مٹی کی بھوری کوئلوں والی انگیٹھی کے سامنے بیٹھی تھی۔اس نے بے نیازی سے سر اٹھا کر دیکھا اور سامنے کی جانب اشارہ کیا۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ خان کمرے کے اس حصے میں ہے جو اس نے اپنے لیے الگ کر رکھا تھا۔کمرے کے دونوں حصوں کے درمیان لکڑی کی دیوار تھی۔وہ یہ سن کر تسلی سے اندر آیا اور گلے کے پاس بیٹھ گیا۔گلے نے نیا نیا

کروشیہ استعمال کرنا سیکھا تھا۔ سرِ شام کام نبٹا کر وہ انگیٹھی کے پاس بیٹھ کر یہی کھیل کھیلتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کا سارا دھیان سیاہ رنگ کی اون میں گم تھا اس لیے وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ وہ چند لمحے تو دیکھتا رہا پھر جب کہنے کے لیے کچھ نہیں ملا تو چڑ کر بولا۔

"گل ...... اے گلے ...... میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ سنتا نہیں ہے؟" وہ چڑ کر دوہرا رہا تھا اور آواز اب کی بار پہلے سے بھی دھیمی تھی مبادا دوسرے کمرے میں موجود اس کا شوہر سن ہی نہ لے۔ گلے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور چڑ کر بولی

"تم کو کیا مسئلہ اے۔ جاؤ اندر جا کر دیکھ لو۔ باپ ہیں تمارے۔"

"اونہہ۔ باپ تب ہوا کرتے تھے جب ہماری اماں زندہ تھیں۔ اب تو فقط تمہارے شوہر ہیں۔ تم نے ان کا پتلا بنا کر اس میں جو سوئیاں گاڑ رکھی ہیں نا۔ بس وہ سوئیاں کھا گئی ہیں میری خوشیوں کو۔"

وہ الزام لگا رہا تھا۔ کوئی اور ہوتی تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتی لیکن گلے تو اس کی عادت سے واقف تھی۔ اس کے پاس گلے کا دماغ گھمانے کے لیے بے انتہا باتیں ہوا کرتی تھیں۔

اس نے بیزار ہو کر اسے دیکھا۔ ایک تو اسے وہ طریقہ بھول گیا تھا جو باجی خریت بتا کر گئی تھی اور دوسرا غلط کروشیہ گھماتے رہنے کے باعث دھاگہ الجھ گیا تھا جسے سلجھانا اب اسے مشکل لگ رہا تھا اور تیسرا اس کی اول فول باتیں دل جلانے کو کافی تھیں۔

"وئی وئی۔ تم کو ام پر الزام لگاتے شرم نئیں آتی خوشحال خاناں۔ جانتے بھی ہو ام سے کیا رشتہ اے تمارا۔" وہ اسے ٹوک رہی تھی۔

"دشمنی کا رشتہ اے۔ اور ہم یہ رشتہ زندگی بر نہیں بھولے گا۔ ہم اپنے بچوں کو وصیت کرے گا اور وہ بی اس دشمنی کو مرتے دَم تک نبائیں گے۔ ہم ان کو سکھائے گا کہ اس عورت کو غور سے دیکھ لو۔ یہ ای اے وہ عورت ہے جس نے تماری دادی کو کالا جادو کر کے مار دیا تھا۔"

وہ اس کی نقل اتارتے ہوئے بولا تھا۔ اسی لیے پورے جملے میں جہاں جہاں "ھ" کا استعمال ضروری تھا وہاں بھی نہیں کیا گیا تھا۔ گلے نے ہاتھ میں پکڑا کروشیہ اور اونی دھاگہ سائیڈ میں رکھ دیا۔

"تم کو اب پڑنا وڑنا نئیں اے کیا۔ جب دیکھو باتیں کر کے وقت ضائع کرتے او۔ تمارا بابا دیکھے گا تو ناراض ہوگا۔"

گلے نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا تھا۔ وہ کھڑکی میں سے دیکھ چکی تھی کہ خان بیدار ہو چکا ہے جبکہ خوشحال خان کی پشت تھی اس لیے اسے پتا نہیں چل سکا تھا

"کیا کروں گا پڑھ مر کر۔ تمہارے شوہر نے مجھے کون سا میری مرضی کی نوکری کرنے دینی ہے۔ جب رکھنا ہی یہیں ہے غلام بنا کر تو کیوں کتابوں میں وقت ضائع کروں۔ لاؤ گلے! آٹا لاؤ۔ مجھے بھی گول روٹیاں بنانا سکھا دو۔ کل کو یہی سب کام آنا ہے میرے۔"

لہجے میں مصنوعی جذباتیت جی بھر کر سموتے ہوئے وہ قطعاً بے خبر تھا کہ خان بابا اپنے کمرے میں جاگ چکے ہیں۔ وہ تو جب انہوں نے کھنکھار کا گلا صاف کیا تو وہ اُچھل پڑا۔

"بابا؟" اس نے گلے کی جانب دیکھ کر پوچھا تھا۔ جب اس نے ہنستے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے والے تھے۔

"چڑیل پہلے نہیں بتا سکتی تھیں۔" وہ دھیمی آواز مگر کھا جانے والے انداز میں بولا تھا اور تمیز دار انسان بن کر بیٹھ گیا تھا۔ گلے ہنستی رہی۔

☆☆☆

وہ چار سال کا تھا جب اس کی ماں زچگی کی پیچیدگی کے باعث انتقال کر گئی تھی۔ وہ تب ہری حویلی میں نہیں رہا کرتے تھے بلکہ وہ اور اس کی امی تھا کوٹ اس کی نانی کے گھر رہتے تھے جبکہ خان بابا جاب کے سلسلے میں کراچی میں مقیم تھے۔ وہ کافی چھوٹا تھا اور اسے کوئی سوجھ بوجھ تو نہیں تھی لیکن اتنا ضرور یاد تھا کہ اس روز امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ نانا اور ماموں مل کر انہیں چارپائی پر ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے بعد گل لالہ جو اس کی ماں کی چھوٹی بہن تھی اور اسے امی سے بھی زیادہ پیار کرتی تھی نے گود میں بٹھا کر بہت پیار بھرے لہجے میں روتے ہوئے بتایا تھا۔

''خوشحال خاناں! اپنی امی کے لیے دعا کرو۔ وہ اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔'' وہ حیران ہوا۔

''چھوٹی گلے۔ پہلے کہتی تھی امی بھائی لینے گئی ہے۔ اب کہتی ہو وہ اللہ کے پاس چلی گئی ہے۔'' اسے یہ بات اچھی نہیں لگی تھی اور نا ہی یقین آیا تھا لیکن گل لالہ جو اس کی ماں سے آٹھ سال چھوٹی تھی اسے آغوش میں لیے روتی چلی گئی۔ وہ خود تب چودہ سال کی تھی اور اسکول جاتی تھی لیکن نانا نے اس کی ماں کے مرجانے کے بعد اس کی شادی خان بابا سے کر دی تھی۔

خان بابا نے اس شادی کے بعد ہی اپنی کراچی والی ملازمت کو خیرباد کہہ کر ہری حویلی کو آباد کیا تھا اور یوں گل لالہ جسے وہ پیار سے گلے کہتا تھا مستقل بنیادوں پر اس کی ماں بن گئی لیکن ان دونوں کا رشتہ ماں بیٹے سے زیادہ بہن بھائی والا تھا۔ وہ اس سے فقط دس سال بڑی تھی اور وہ اس پر رعب ایسے جماتا تھا جیسے وہ اس سے دس سال بڑا ہو۔

خان بابا کا گل لالہ سے کس قسم کا رشتہ تھا یہ اسے بڑا ہو جانے کے بعد بھی کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ بہت ہی سنجیدہ انتہائی کم گو اور خشک قسم کے انسان تھے لیکن اس کا گل لالہ سے جو رشتہ تھا وہ بہت منفرد تھا۔ وہ اگرچہ اس کا نام لیتا تھا۔ اس کے ساتھ خوب لڑتا جھگڑتا تھا لیکن اس کے بغیر گزارا بھی نہیں تھا۔

گلے کو پڑھنے لکھنے سے سخت الرجی تھی اور شادی کے بعد خان بابا کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ مزید پڑھنے پر راضی نہ ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اردو ٹھیک سے بولنی نہیں آتی تھی جبکہ خان بابا نے گلے کے اصرار کے باوجود بیٹے کی پڑھائی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا تھا اور اسے اگلے ہی سال ایبٹ آباد برن ہال بھجوا دیا تھا جہاں سے وہ چھٹیوں میں ہی گھر آپاتا تھا لیکن آتے ہی گلے کے آگے پیچھے پھرتا رہتا۔

اسے بورڈنگ کے قصے سناتا، دوستوں کی باتیں بتاتا اور یہ سلسلہ تب بھی قائم رہا جب اس نے اسلام آباد میں یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا۔ اسے گلے کو سب کچھ بتائے بنا سکون ہی نہیں آتا تھا حالانکہ وہ پشتو ٹھیک سے نہیں بول سکتا تھا جبکہ گلے کی اردو کے حالات دگرگوں تھے مگر دونوں کے درمیان دوستی گہری تھی۔ گلے کی اپنی اولاد نہیں ہوئی تھی سو وہ تو ویسے ہی بھانجے کو سگے بیٹے سے بڑھ کر چاہتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اتنے خوش باش اور مطمئن تھے کہ انہیں ہری حویلی میں موجود تیسرے فرد کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا کہ وہ اس قدر تنہائی پسند اور کم گو کیوں ہے۔

☆☆☆

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ روشنی کی ایک لکیر تک کسی جھری سے اندر کمرے میں نہیں آرہی تھی فقط ایک چنگاری تھی جو اس سگریٹ سے پھوٹتی تھی جو وہ وقتاً فوقتاً جلاتا اور پھر انگلیوں میں پکڑے پکڑے اسے راکھ میں بدلتا یک ٹک دیکھتا جاتا تھا جیسے سگریٹ راکھ میں نہیں بدل رہا تھا بلکہ یہ اس کی زندگی تھی جو دھیرے دھیرے گھل گھل کر ختم ہوئی جارہی تھی۔ وہ بے حس، بے سدھ جانے کب سے راکنگ چیئر پر بیٹھا آگے پیچھے جھول رہا تھا

جبکہ سماعتیں ان چار پانچ جملوں سے بے حال ہوئی جارہی تھیں جو اس کی نوجوان بیٹی نے کسی بے رحم شہزادی کی طرح اس کے کانوں میں انڈیلے تھے۔

"مجھے آپ کے ساتھ نہیں رہنا۔ میں مرجانا چاہتی ہوں۔" وہ روئی تھی نہ اس کے لہجے میں ندامت تھی بس سرکشی تھی جو اس کے ہر عضو سے چھلک رہی تھی۔

"کیوں؟" اس نے پوچھا تھا اور یہ اس کا دل جانتا تھا کہ اس کے منہ سے یہ لفظ کیسے نکلا تھا۔

وہ تو ابھی تک اس بات کو ہی ہضم نہیں کرپارہا تھا کہ اس کی بیٹی یہ سب بھی کرسکتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے تو ادھ موا وجود ہی نہیں ہٹ رہا تھا جسے باتھ روم سے اٹھا کر بیڈ تک لانے میں وہ ہانپ گیا تھا۔ بایاں بازو، کلائی اور اس کی قمیص کا پورا دامن خون میں نہ صرف شرابور تھا بلکہ خون اتنا گاڑھا ہوچکا تھا کہ اس نے یہ امید ہی چھوڑ دی تھی کہ وہ اس لڑکی کو دوبارہ زندہ دیکھ پائے گا مگر اللہ مہربان تھا۔ کاش انسان بھی ہوا کرتے۔ زندگی بچ گئی تھی۔

اس کے خون میں ڈرگز پارٹیکلز بھی ملے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اس نے یہ احمقانہ کوشش کرنے سے پہلے کوئی چیز لی تھی اور کافی زیادہ مقدار میں لی تھی۔ لیکن یہ میرا اندازہ ہے۔ تم کہو تو میں مزید ٹیسٹ کرواسکتا ہوں۔ لیکن میرا مشورہ ہے کہ......"

ڈاکٹر گوہر کے انداز میں ہچکچاہٹ سی تھی۔ ان کے ساتھ اس کے دیرینہ مراسم تھے اور ان سے کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے کسی مشورے یا تفتیش کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے انہیں کسی بھی مزید ٹیسٹ سے روک دیا تھا۔ کیا فائدہ تھا یہ سب کرنے کا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی بیٹی کے کمرے میں سب دیکھا تھا اور وہ اتنی حیثیت بھی نہیں رکھتا تھا کہ اس سے اس متعلق سوال کرسکتا۔ لوگ ایسی صورت حال میں پریشان ہوجایا کرتے ہیں جبکہ وہ تو حیران تھا۔

"میں انیس سال کی ہوچکی ہوں۔ لیگلی میں آپ پر ڈیپینڈ ینٹ نہیں رہی۔ اس لیے آپ مجھ سے کچھ مت پوچھیں۔ میں جو کرنا چاہتی ہوں۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں۔ اور اگر میری بات نہ مانی گئی تو میں پھر یہ سب کروں گی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ اس کے ہر انداز سے اس کی تکلیف چھلک رہی تھی لیکن اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے الفاظ سے اپنے باپ کو کس قدر تکلیف دے رہی ہے اور اس کے الفاظ کسی تیز دھار آلے کی طرح اس کے باپ کا جگر کاٹ رہے ہیں۔

وہ تو آنکھیں موند کر اپنی جانب سے سب رشتے ناتے ختم کرچکی تھی لیکن وہ اپنے دل کا کیا کرتا جو اس قدر کرچی کرچی ہوگیا تھا کہ اسے سمیٹنا اب اس کے بس کا روگ نہ رہا تھا۔

"آپ جاسکتے ہیں۔ آپ مجھے ہاسپٹل لاکر ایک غلطی کرچکے ہیں۔ یہاں ٹھہر کر مزید غلطی مت کریں۔" وہ اپنا چہرہ دوسری جانب کرتے ہوئے لاتعلقی سے بولی تھی۔ اس کے اندر اتنی سکت بھی نہیں تھی کہ پلکیں ہی جھپکا سکتا۔

"کیا میں ہر مقام صرف ہارنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔"

یہ سوچ نہیں تھی۔ یہ ایک تازیانہ تھا، طعنہ تھا جو اس کا اپنا ضمیر اسے دینے سے نہیں چوک رہا تھا۔

"نہیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑسکتا لاریب۔ کم ازکم ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اگر تمہاری بات مانوں گا۔ تو تمہیں بھی میری ماننی پڑے گی۔" وہ شاید ایسا سوچ کر خود کو مطمئن کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے یہ بھی نہیں ہورہا تھا۔

"کیا اس دن کے لیے اولاد کو نورالقلوب کہا گیا ہے؟" راکنگ چیئر پر اپنا نچڑا ہوا وجود لیے وہ فقط آگے

پیچھے جھول رہا تھا۔

☆☆☆

''داؤددددد!'' ممی اس کو ٹی وی کے سامنے کاؤچ پر اطمینان سے نیم دراز دیکھ کر چلائی تھیں۔ وہ گڑبڑا کر سیدھا ہوا تو گود میں پڑے چپس کے پیکٹ سے چپس نکل کر نیچے زمین پر جا گرے۔ وہ گڑبڑا سا گیا۔

ممی ایک دم سے سامنے آئی تھیں۔ ایک ہاتھ سے کانوں میں ڈائمنڈ اسٹڈ پہنتی ہوئی وہ کہیں جانے کے لیے تیار لگ رہی تھیں۔ داؤد جو صوفے میں دھنسا پڑا تھا بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے اٹھ کر بیٹھنے سے وہ چار چاکلیٹس کے خالی پیکٹ نظر آنے لگے جو اس نے میچ دیکھتے ہوئے کھائے تھے۔ وہ ذرا پھیل کر بیٹھ گیا تا کہ ممی کی نظر سے ان پیکٹ کو محفوظ رکھ سکے ورنہ وہ مزید ناراض ہو جاتیں۔

''تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟'' ان کے انداز میں بیزاری تھی کیونکہ وہ واقعی تیار نہیں تھا اور اس کے چہرے پر لکھا تھا کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اسے تیار بھی ہونا تھا۔

''داؤد! تم اتنے غیر ذمہ دار کیوں ہو۔'' ممی دو قدم مزید آگے آئی تھیں۔

''میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ وقت پر تیار ہو جانا، ہمیں شمع کی طرف جانا ہے۔ آٹھ بج رہے ہیں اور تم ابھی تک یہ ڈیڑھ فٹ کی نیکر پہن کر صوفے میں غرق ہو۔'' وہ درشتی سے بولی تھیں۔

داؤد کو کچھ دیر لگی تھی یہ یاد کرنے میں کہ ممی نے اسے یہ سب بتایا تھا یا نہیں اور اسی لیے ممی کو اسے مزید سنانے کا موقع مل گیا تھا۔

''تم بہت سست ہو داؤد! تمہاری عمر کے بچے اتنے ایکٹو ہوتے ہیں۔ انہیں تو بس بتانا پڑتا ہے کہ پارٹی ہے اور وہ پیرنٹس سے بھی پہلے تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں جبکہ تمہیں دس بار یاد کروانا پڑتا ہے۔''

وہ اب سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ کر اپنے پاؤں پر آئی نادیدہ گرد صاف کر رہی تھیں۔

''ممی! آنٹی شمع کے گھر میں بہت بور ہوتا ہوں۔ آپ کو پتا ہی ہے۔''

''تم تو ہر اس جگہ بور ہو جاتے ہو جہاں تمہاری عمر کے لڑکے موجود ہوں۔ تمہارا بس چلے تو تم اسکول بھی نہ جاؤ۔ بس ہر وقت اس ٹی وی کے آگے بیٹھے یہ منحوس میچ دیکھتے رہو۔'' وہ اتنا کہہ کر اٹھیں اور اپنے کمرے کی جانب چل دی تھیں لیکن ان کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

''اچھا مجھے ان میچز کو دیکھنے پر بھی اعتراض نہ ہو اگر تم ان سے کوئی سبق سیکھو۔ کوئی ورک آؤٹ، کوئی جم ہی جوائن کر لو۔ لیکن تم تو بس ہر وقت اس صوفے میں گھسے رہتے ہو اور ٹی وی دیکھتے رہتے ہو۔ وزن دیکھو اپنا۔'' اس کا وزن ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور اس کی ہر کوتاہی کا الزام اس کے وزن پر ڈال دینا ان کی پسندیدہ عادت تھی۔ اس کا منہ لٹک گیا وہ بجھے ہوئے دل کے ساتھ خالی ریپرز سمیٹنے لگا۔

وزن کی زیادتی اس کا قصور تو نہیں تھی۔ وہ تو خود اپنے وزن سے عاجز تھا لیکن اس سے ایکسر سائز ہوتی تھی نہ وہ چپس چاکلیٹ جیسی چیزیں کھانا چھوڑ سکتا تھا۔

''لڑکے جس عمر میں لڑکیوں کے فون نمبرز جمع کر رہے ہوتے ہیں۔ تم نے اس عمر میں صرف وزن جمع کرنا شروع کیا ہوا ہے۔''

وہ اب ٹک ٹک کرتی ہیل شوز پہنے پھر باہر آ گئی تھیں۔ وہ زمین پر گرے چپس کے ٹکڑے جمع کر رہا تھا۔ ان کو دوبارہ لاؤنج میں دیکھا تو بعجلت کھڑا ہونے کی کوشش میں صوفہ اور میز کے درمیان پھنس سا گیا۔ ممی نے نہایت ناگواری اور جتاتی ہوئی نظروں سے اس سارے عمل کو دیکھا۔

''غضب خدا کا۔ 95 کلو۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہوئی تھیں تو وہ فوراً بولا۔

"90 کلو" اپنے تئیں اس نے ان کی تصحیح کی تھی۔ ان کا چہرہ مزید تلخ ہوا اور آنکھوں میں خفگی کا درجہ حرارت تیزی سے بڑھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"90 کلو چھ مہینے پہلے تھا۔ اب چیک کرو گے تو 95 کلو ہی آئے گا۔ بلکہ مجھے خدشہ ہے اس سے بھی زیادہ ہو چکا ہوگا۔ تمہارے حالات ہی ایسے ہیں۔ مجھے تو حیرانی ہوتی ہے چار چار کماچیاں (روٹیاں) کھا کر بھی تمہارے سٹامک میں چپس اور کولڈ ڈرنک کی گنجائش رہ جاتی ہے۔ ہم تو تمہاری عمر میں ڈر کے مارے پوری روٹی بھی نہیں کھاتے تھے کہ کہیں وزن نہ بڑھ جائے۔"

وہ اب بالکل تیار ہو کر سامنے آ بیٹھی تھیں اور ان کا خاموش رہنا اب ناممکن کے مترادف تھا۔ داؤد نے چپ چاپ اپنا پھیلایا کچرا سمیٹا، پھر خود کو سمیٹا اور تیار ہونے چل دیا۔

☆☆☆

وہ ایک سنگل مدر کا بیٹا تھا۔ اس کی ممی اور ڈیڈی میں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی علیحدگی ہو گئی تھی۔ وہ ابھی اسکول جانا بھی شروع نہیں ہوا تھا کہ ڈیڈی نے ممی کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی۔ ان کے درمیان خراب تعلقات کی وجوہات کیا تھیں اسے نہیں پتا تھا اور اسے اس معاملے میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہ تھی کیونکہ وہ باپ سے کبھی ملا نہ ہی انہوں نے کبھی اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

اس نے ہوش سنبھالا تو خود کو اپنی نانی کے گھر پایا اور نانی اس کے ڈیڈی کا ذکر ہمیشہ ایک ایسے انسان کے طور پر کرتیں جو بے حد ظالم اور لاپروا شخص تھا۔ یہ نانی کی تربیت کا اثر تھا، باپ کا ہیولہ اس کے گمان میں ہمیشہ ایک ولن ہی رہا۔

نانی نے اپنی زندگی کے قیمتی سال اکاؤنٹنگ کی درس و تدریس میں بسر کیے تھے۔ اسی لیے ان کی گفتگو میں حساب کتاب اور ناپ تول ہمیشہ موجود رہا۔ وہ اسے یہ ازبر کروانا نہ بھولتی تھیں کہ اس کی ماں یعنی ان کی بیٹی نے اپنی قیمتی جوانی اس کی خاطر ضائع کی ہے اور بظاہر ایک گھاٹے کا سودا کیا ہے لیکن وہ اگر چاہے تو یہ سارا خسارہ نفع میں بدل سکتا ہے۔ اسے ہمیشہ ایک اچھا بچہ بن کر دکھانا تھا۔

اس نے اپنے تئیں کبھی ممی کو مایوس کیا بھی نہیں تھا۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا اور اس کی طبیعت میں بھی نفاست تھی۔ وہ ممی کے آفس آنے سے بھی پہلے اپنا ہوم ورک ختم کر کے لنچ اور ڈنر تک کر لیا کرتا تھا۔ ممی بینک میں آپریشنل منیجر کے طور پر کام کر رہی تھیں۔ وہ ہمیشہ مصروف رہتیں۔ ان کے پاس اسے دینے کے لیے وقت کم ہی دستیاب ہوتا تھا لیکن ممی کی کمی نانی کی موجودگی سے پُر ہو جایا کرتی تھی۔ وہ تھرڈ گریڈ میں تھا جب نانی کا انتقال ہوا اور تب ہی ممی نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروا لیا۔

☆☆☆

دبئی آ کر اس کی زندگی یکسر بدل گئی۔ وہاں کا طرزِ زندگی پاکستان سے بالکل مختلف تھا۔ ایک بڑے سے ولا میں دو عدد ملازمین اور ماں جیسی نانی کے ہمراہ رہنے والے آٹھ سالہ بچے کو اب دو کمروں والے محدود سے لگژری اپارٹمنٹ میں رہنا پڑ رہا تھا اور اکیلے کھانا کھانا پڑتا تھا۔

تازہ کھانا ملنے کے بجائے میڈ کے ہاتھ کا باسی کھانا کھانا اسے ابتدا میں مشکل لگتا تھا اور پھر میڈ بھی آتی تھی کبھی نہیں۔ آرڈر کر کے پزا اور شوارما منگوانا اسے ممی نے چھوٹی عمر میں سکھا دیا تھا۔ سیر و تفریح اور کھیل کود کے مواقع بھی محدود تھے سو اس کا اسکول کے بعد کا وقت کتابوں اور ٹی وی میں صرف ہونے لگا۔

ممی کا حلقہ احباب دبئی آ کر ہلکا نہیں رہا تھا۔ انہوں نے لاتعداد دوست ڈھونڈ لیے۔ آئے دن پارٹیاں دی اور لی جاتی تھیں۔ وہ اسے بھی اپنے ہمراہ لے جاتیں۔ ان کے احباب کے بچوں سے اس کی بھی اچھی علیک

سلیک رہنے لگی۔
اس کا وزن دبئی آنے کے دو مہینہ بعد ہی بڑھنا شروع ہو گیا تھا اور اس عمل میں گزرتے سالوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ ابتداء میں سب سراہتے تھے کہ وہ کیوٹ ہو گیا ہے۔ اس کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔
یہ سب تب تک ٹھیک رہا جب تک وہ او۔ لیولز میں نہیں آیا تھا۔ او۔ لیولز میں پڑھائی کا پریشر بھی زیادہ ہو گیا۔ اس سے اس کی کاہلی اور موٹاپے میں بے پناہ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ سب دوست جو پہلے اسے کیوٹ سمجھتے تھے اب اس کا مذاق اڑانے لگے۔ وہ ان سب چیزوں سے بچنے کے لیے اسکول سے گھر تک محدود ہوتا چلا گیا۔
اب وہ آئی بی کر رہا تھا۔ اس کے گریڈز تو اچھے آ رہے تھے۔ اسائمنٹس پر اچھے ریمارکس مل رہے تھے لیکن کسی غیر نصابی سرگرمی میں اس کی کارکردگی صفر تھی۔ اسپورٹس میں اس کی دلچسپی فقط دیکھنے کی حد تک تھی۔ اس کا اپنا کوئی خاص حلقہ احباب نہیں تھا لیکن ممی کے حلقہ احباب میں پند و نصائح اور مشوروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہونے لگا لیکن اسے اس احساس کو ہنستے ہوئے برداشت کرنا پڑتا تھا۔
وہ چاہے ممی کے دوست ہوتے یا ان کی اولادیں وہ سب کے طنزیہ ریمارکس کو ہنس کر سہتا آیا تھا لیکن حقیقت یہی ہے کہ اس سے ایکسرسائز ہوتی تھی نا وہ اپنا کھانا کنٹرول کر سکتا تھا۔

☆☆☆

"تم فرمان سے پوچھنا کسی اچھے جم کا۔ وہ جاتا رہا ہے باقاعدگی سے۔"
ممی نے گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ موضوع شروع کر دیا تھا جو داؤد کا سب سے ناپسندیدہ تھا لیکن پھر بھی اچھے بچوں کی طرح اس نے سر ہلایا۔
"اوکے ممی۔ آئی ول۔" ممی نے اس کے سعادت مند انداز کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ مزید کہہ رہی تھیں۔
"اس کی ماں نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔ وہ لوگ بھی انوائیٹڈ ہیں۔ اب دیکھنا تم اسے۔ کتنا گڈ لکنگ ہوتا جا رہا ہے۔ تم کیوں ایسے نہیں ہو داؤد۔ خود پر فوکس کیوں نہیں کرتے۔ اس عمر میں اتنا موٹاپا کوئی اچھی بات نہیں۔ سو بیماریاں اسی موٹاپے سے شروع ہوتی ہیں۔"
ممی گاڑی کو سڑکوں پر دوڑانے اور اسے جھاڑنے میں مصروف تھیں۔ اب ان کا مزاج ذرا بہتر نظر آتا تھا۔ داؤد نے تیار ہونے میں بالکل بھی وقت نہیں لگایا تھا۔ سفید آدھی آستین والی ٹی شرٹ کے ساتھ بلیو ڈینم پہن کر وہ فٹافٹ ہی کمرے سے نکل آیا تھا تاکہ ممی کی ناراضی کا مزید سامنا نہ کرنا پڑے۔ اب وہ ناراض تو نہیں تھیں لیکن اسے ناراض کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھیں۔
"میں نے بہت مشکل زندگی گزاری ہے داؤد! صرف تمہاری وجہ سے۔ تمہیں اچھا فیوچر دینے کے لیے بہت کمپرومائز کیے ہیں میں نے۔ بہت سے مقامات پر اپنی ذات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف تمہیں فوقیت دی۔ صرف تمہارے بارے میں سوچا ہے۔ یہ چھوٹی بات نہیں ہوتی داؤد! فرشتوں جیسا ظرف چاہیے ہوتا ہے اس کام کے لیے۔ کوئی اور ہوتی تو اب تک ہر چیز پر لعنت بھیج کر کوئی اچھا لائف پارٹنر ڈھونڈ چکی ہوتی۔"
وہ رکی تھیں اور ان کی گاڑی بھی۔ سگنل سرخ تھا۔ داؤد نے "ہر چیز پر لعنت بھیجنے" والی بات پر خوامخواہ اپنے سراپے پر نظر دوڑائی۔
"لیکن میں نے ایسا نہیں کیا داؤد! تمہاری خاطر اپنا آپ فنا کر ڈالا میں نے۔ لیکن اب میں تھک رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم اپنی ذمہ داریاں نبھانی سیکھو۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم میرے لیے کچھ کرو لیکن خود اپنی ذات کے لیے تو کرو۔ اتنے وزن کے ساتھ کیسے کرو گے سب۔"

وہ کہہ رہی تھیں اور کہتی چلی جارہی تھیں۔ سگنل چند لمحوں بعد ہی سبز ہوگیا تھا۔ داؤد کو ممی کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں لیکن وہ خاموش تھا۔

ممی بالکل نانی کی طرح بات کرنے لگی تھیں۔ انہیں اس بات سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ سامنے بیٹھا بندہ ان کی سن بھی رہا ہے یا نہیں۔ وہ بس کہتی چلی جاتی تھیں۔ اسے ان کے احسان جتاتے انداز اور الفاظ سے چڑ تھی مگر وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

''واہ میرے وائٹ پانڈے۔ تو نے تو مزید پٹ آن کرلیا۔ بھائی کیا کرے گا اتنے وزن کا۔ تھوڑا تھوڑا ان سب کو بانٹ دے۔''

یہ وہی فرمان تھا ممی نے جس سے مل کر اسے جم کے متعلق معلومات لینے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے اس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ کھڑی فروا اور ماہم کو دیکھتے ہوئے کہا جو بے حد کمزور تھی۔ یہ سب لوگ ایک ہی اسکول میں تھے۔ فرق صرف پروگرام اور سسٹم کا تھا۔ کوئی اے لیولز کر رہا تھا تو کوئی آئی بی کر رہا تھا۔

''ایکسکیوزمی۔ ہمیں ہاتھی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' ماہم نے ناک چڑھا کر کہا تھا۔

داؤد نے بے چارگی سے دانت نکالنے پر اکتفا کیا۔ فرمان تنہا نہیں تھا بلکہ اس کا گینگ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ تین لڑکیوں اور پانچ لڑکوں پر مشتمل یہ گینگ سب کو زچ کرنے میں ماہر تھا۔ یہ لوگ بڑوں کے سامنے تو مہذب بنے رہتے لیکن جب اکیلے ہوتے تو اس کا ناک میں دم کردیتے تھے۔ اس کے پاس ان کی باتوں کو ہنس کر نظر انداز کردینے کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا۔

''یار کیا سارے خاندان کی روٹیاں تو ہی کھالیتا ہے؟'' شعیب نے بھی حصہ لیا تھا۔

''ویسے ڈوڈ میں اکثر حیران ہوتی ہوں تم ایک وقت میں دو لوگوں کی باڈی مینیج کیسے کرتے ہو؟'' خلود نے نخوت سے کہا تھا۔ وہ سب ہنس دیے لیکن خلود ہلکی تک نہیں تھی۔

''بلیو ان می۔ آئی ایم سو کنسرنڈ داؤد۔ تمہیں آنٹی بھی کچھ نہیں کہتیں۔ وہ خود تو اتنی گریس فل، فٹ اینڈ اسمارٹ ہیں۔ اور تمہارا کوئی خیال ہی نہیں۔ کنفرم کرو یار۔ تمہیں کسی گردوارے سے تو نہیں اٹھالائی تھیں؟''

اپنا جملہ مکمل کرکے وہ اب ہنسی تھی اور باقی سب نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ داؤد کا قہقہہ سب سے اونچا تھا اگرچہ مصنوعی تھا۔

''ہے گائز۔ کیا چل رہا ہے۔ مے آئی جوائن؟''

اس کے عقب سے کوئی انجانی سی آواز آئی تھی۔ اس نے یہ آواز پہلے نہیں سنی تھی۔ فرمان کے گینگ میں شاید کوئی نیا اضافہ ہوا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھنا چاہا اور پھر جیسے وہ پتھر کا ہوگیا تھا۔

☆☆☆

''گلے! تم اتنی نکمی کیوں ہو۔ جب تمہیں پتا ہے کہ میں اس ہری حویلی میں داخل ہوتے ہی تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو پھر ادھر ادھر کیوں غائب ہوجاتی ہو۔ تمہیں پتا ہے نا، تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے اسٹریس ہونے لگتا ہے۔''

وہ کسی تیز رفتار طیارے کی طرح اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ ایک جھٹکے سے اس کے بستر پر گرا اور واویلا مچانے لگا۔ گلے نے اس کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ریک میں پڑے کسی گلدان کی مٹی جھاڑنے میں مصروف تھی۔

وہ کچھ دیر پہلے جاگنگ کرکے آیا تھا اور جاگرز بدلنے کے علاوہ اس نے کچھ نہ کیا تھا لیکن چونکہ سردی بس

آ ہی چکی تھی تو اس کے کپڑے پسینے وغیرہ سے پاک تھے لیکن گُلئے کو اس بات سے شروع سے ہی الجھن ہوتی تھی۔ وہ سادہ مزاج تھی لیکن بہت نفاست پسند اور صاف ستھری عورت تھی۔

ہری حویلی کو صاف ستھرا رکھنے میں وہ اپنی ساری توانائی خرچ کر دینے کو تیار رہتی تھی۔ یہ اسی کی محنت تھی کہ ہری حویلی کا رہائشی حصہ بڑا لش پش رہتا تھا۔ وہ اصرار کر کے خوشل خان سے اپنے موبائل پر گھر کی تزئین و آرائش سے متعلق ویڈیوز ڈاؤن لوڈ کروایا کرتی تھی۔ وہ بھی اس کے شوق کو مدِنظر رکھتے ہوئے جب بھی ایبٹ آباد یا اسلام آباد سے آتا تو کوئی نہ کوئی سجاوٹی شے بطور تحفہ گلئے کے لیے ضرور لاتا تھا۔ اس کے باوجود اسے جب بھی گلئے کو ستانے کا موقع ملتا تھا تو وہ اس سے فائدہ ضرور اٹھاتا تھا۔ گلئے کے بستر پر جاگنگ والے لباس کے ساتھ لیٹ کر اسے زِچ کرتے رہنا بھی اسی کارروائی کا حصہ تھا۔ وہ چند لمحے بیڈ پر پڑے تکیے سے اپنا سر رگڑتا رہا کہ وہ کچھ بولے گی لیکن جب وہ نہیں بولی تو اس کی طرف کروٹ بدل کر بولا۔

”گلئے! یہاں آؤ نا۔ میں نے تمہیں ایک بات بتانی ہے۔ پتا ہے میں نے ایک خواب دیکھا۔ مجھے لگتا ہے میں یہ خواب پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ میں نے سوچا تم سے پوچھوں۔ تم اتنی اللہ والی ہو۔ تمہیں تو تعبیر ضرور پتا ہوگی۔“

اس کے انداز میں شرارت سی تھی۔ کم پڑھی لکھی خواتین کی طرح گلئے بھی کسی قدر توہم پرست ضرور تھی لیکن وہ اب بھی اس کی جانب متوجہ نہ ہوئی تو وہ اس کے قریب چلا آیا اور تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں سُرخ ہیں۔

”اے خیستے (میری پیاری)! کیوں اس قدر غمگین ہو۔ کیا تمہارے شوہر نے کچھ کہا ہے۔ بتاؤ اگر اس نے کچھ کہا ہے تو...... یہ تمارا خوشل خان ابھی جا کر اس کو سبق سکھاتا اے۔“ وہ اسے کندھے سے ٹہوکا دیتے ہوئے نیم مزاحیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

”جاؤ خاناں۔ اپنا کام کرو۔ میری دل اچھا نہیں ہے۔“ وہ کچھ بُجھی بُجھی سی تھی۔ خوشل خان نے اسے پہلے کبھی ایسے نہ دیکھا تھا اس لیے وہ سمجھ نہیں پایا کہ وہ اداس ہے یا پریشان ہے۔ اسے اپنا خواب وواب سب بھول گیا۔

”وہ تو مجھے پتا ہی ہے۔ تمہارے کالے سیاہ دل کی مجھ سے زیادہ خبر کسے ہو سکتی ہے۔ اسی کالے سیاہ دل کی وجہ سے تو میری ماں۔“ وہ اتنا ہی بولا تھا کہ گلئے نے اس کی بات کاٹ دی۔

”میری ماں...... میری ماں۔ ہر وقت ایک ہی بات۔ وہ تماری ماں تھی تو میں کون ہوں۔“

وہ نہایت ناراض لہجے میں بولی پھر گہری سانس لی اور پہلے کی نسبت دھیمی آواز میں بولی۔

”خوشل خاناں! میرے منہ نہ لگو۔ میں نے کہا نا میرا دل اچھا نہیں ہے۔ تم کو سمجھ کیوں نئیں آتی۔“ گلئے عموماً اس طرح بولتی نہیں تھی اس لیے وہ حیران تو ہوا لیکن خاموش نہیں۔

”ہاں تو وہی کہہ رہا ہوں میں بھی۔ دل تو تمہارا واقعی اچھا نئیں ہے۔“ گلئے کا گلدان کی سطح پر چلتا ہاتھ ساکت ہوا تھا لیکن اس نے رُخ نہیں بدلا تھا

”تم بالکل اپنے باپ کے جیسا ہے۔ کسی کا احساس نئیں کرتا۔ کیا فائدہ ہوا امارا جوانی کا۔ تم کو پالا پوسا لیکن۔ تم کو خیال ای نئیں اے۔“

وہ روہانسی ہوئی کہہ رہی تھی۔ وہ رونے والوں میں سے نہیں تھی۔ اسے پہلی بار موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔

”گلئے۔“ اس نے محبت سے پکارا تھا لیکن وہ ہاتھ میں پکڑا گلدان ریک میں رکھ کر باہر چلی گئی تھی اور جاتے

جاتے کہنا نہ بھولی۔
"کوئی ضرورت نہیں اے ام سے بات کرنے کی۔ تم دونوں احسان فراموش ہو۔ تم بھی۔ اور تمارا باپ بھی۔ جو اس عمر میں شادی بنانے کا سوچ رہا ہے۔"
"کون...... خان بابا......؟" وہ ششدر رہ گیا تھا۔ یہ تو گلے نے ناممکنات والی بات کر دی تھی۔

☆☆☆

"مجھ سے کیوں ناراض ہو۔ میں تو شادی نہیں بنا رہا نا۔"
یہ بات اگرچہ اس نے بہت تحمل سے کہی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خود بھی تذبذب کا شکار تھا۔ ہری حویلی میں ایسا پہلے کبھی ہوا تو نہیں تھا۔ خان بابا کے ساتھ اس کا رشتہ عجیب نوعیت کا تھا۔ وہ اتنے کم گو تھے کہ عید بقر عید کے علاوہ چند دوسرے مواقعوں کو دو دو بار بھی گنا جاتا تو ان کے منہ سے نکلنے والے اب تک کے الفاظ سو کا ہندسہ بھی پورا نہ کر پاتے اور وہ کم گو نہ بھی ہوتے تب بھی اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کے اس قدر ذاتی معاملے کے متعلق ان سے کھل کر بات کر پاتا۔ وہ صرف گلے سے ہی بات کر سکتا تھا۔ ان کے یہاں دوسری تیسری شادی کوئی انہونی یا عجیب بات نہیں تھی لیکن خان بابا سے یہ توقع عبث تھی۔ وہ اپنی بہت سی خاندانی روایات کے منکر تھے اور کثرت ازدواج ان میں سے ایک تھی۔ اس لیے وہ بھی ایسا کر سکتے ہیں یہ تو شاید پورے بٹگرام نے نہ سوچا تھا۔
انہیں کتابوں اور ہری حویلی کے علاوہ صرف اپنے گھوڑوں میں دلچسپی تھی اور گلے بے چاری کو یہ بات پتا تھی۔ اسی لیے ان کی کسی اور عورت میں دلچسپی اس کے لیے ایٹم بم حملے سے کم نہ تھی۔
"میں ناراض وراض نہیں ہوں خوشحل خاناں۔ لیکن یہ سوچ کر افسردہ ہوں کہ میرے اتنے سال ضائع ہو گئے۔ اولاد بھی نہ دی اللہ نے۔ اور اب شوہر کو بھی کوئی ڈائن لے جائے گی۔ بتاؤ! میرے ہاتھ کیا آیا؟"
وہ آنسوؤں کے درمیانی وقفے میں ناک صاف کرنا نہ بھولی تھی۔ اس کا رونا دھونا چھوٹے خان کو عجیب سے احساسِ جرم میں مبتلا کر رہا تھا لیکن اسے تسلی دینے کے لیے مناسب الفاظ نہ مل رہے تھے۔ اس لیے جز بز ہو کر بولا۔
"شاوا گلے۔ میں اولاد نہیں ہوں تمہاری؟ مجھے عاق کر دیا ایک ہی جھٹکے میں۔ نکل آیا تمہارے دل کا چور۔ تم نے کبھی مجھے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ اگر سمجھا ہوتا تو تمہیں خود سے زیادہ میری فکر ہوتی۔ اگر سوچو تو تمہاری ایک سوکن آ رہی ہے۔ میری سوتیلی ماں آ رہی ہے۔ وہ بھی دوسری۔ پہلی تو تم ہو۔ تم سے ایک سوکن نہیں برداشت ہو رہی۔ میں دو دو سوتیلی مائیں کیسے برداشت کروں گا۔"
وہ اس کے مزاج کو اعتدال پر لانے کے لیے ایسے کہہ رہا تھا۔ گلے اس کی بات سن کر مزید اونچا اونچا رونے لگی تھی۔
"ہاں ہاں۔ کہہ دو تم بھی مجھے سوتیلی۔ ساری جوانی ضائع ہو گئی میری تم دونوں پر۔"
"چپ کرو...... ضائع ہو گئی...... ضائع ہو گئی۔ ویسے بڑا جولیا رابرٹس بن جانا تھا تم نے۔ اور رونا بند کرو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ مجھے یقین ہے، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ خان بابا تم سے شادی کر کے جو غلطی کر چکا ہے۔ مجھے یقین ہے وہ یہ غلطی دوہرانے کا خواب میں بھی نہیں سوچتا ہوگا۔"
وہ اس کے مزاج کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس لیے ایسے بول رہا تھا ورنہ کھد بدھ تو اسے بھی لگی تھی کہ یہ ہری حویلی میں ہو کیا رہا ہے۔
"تم ہم سے میٹھی میٹھی باتیں کر کے اپنے بابا کی پردہ داری نہ کرو خوشحل خاناں۔ میں نے اپنے کانوں سے

سنا ہے، وہ کسی کو فون پر کہہ رہا تھا کہ وہ شادی کے لیے تیار ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں بتا رہی تھی۔ اس نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ خدا جانے یہ کیا ہونے جا رہا تھا۔

گلے یقیناً جھوٹ نہیں بول رہی تھی لیکن خان بابا واقعی تیسری شادی کرلے گا یہ بھی تسلیم کرنا آسان نہیں تھا اور یہ بھی سچ تھا کہ خان بابا نے غلطی سے بھی آج تک اگر کوئی بات منہ سے نکالی تھی تو اسے پورا کر کے دَم لیا تھا۔

لو بھئی ہری حویلی تمہارا یہ دن دیکھنا باقی رہ گیا تھا۔" وہ یہ بات گلے سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

☆☆☆

"یار! ایک بُری خبر ہے۔ فارغ ہو کر مجھے کال کرنا۔"

ارباب نے واٹس ایپ کیا ہوا تھا۔ وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا۔ تین دن بعد یوں بھی اس کی واپسی تھی لیکن حویلی کے حالات دیکھ کر اس نے سوچا تھا وہ آج ہی واپس چلا جائے گا۔ ان کی روایات میں ہی نہیں تھا کہ اپنے باپ کے کسی عمل پر تنقید کی جائے۔ اسے اگرچہ اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن اس کے پاس یہ اختیار بھی نہیں تھا کہ وہ کچھ کر پاتا۔ اس کا ارادہ ارباب کو کال کرنے کا تھا لیکن اس کا واٹس ایپ دیکھ کر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے مسائل عجیب ہی ہوا کرتے تھے۔

ارباب اس کا بچپن کا دوست اور روم میٹ تھا۔ ارباب کا تعلق فیصل آباد سے تھا۔ ان دونوں کی دوستی برن ہال میں ہوئی تھی اور اب تک قائم تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے خاندانوں میں بھی علیک سلیک تھی۔

ارباب کے مسائل بڑے عجیب تھے۔ اس کی فیملی انتہائی مذہبی تھی لیکن اس کو فیشن ماڈل بننے کا شوق چرایا تھا اور اس سلسلے میں وہ مہنگے جم اور سیلون میں نا صرف اپنا روپیہ بلکہ وقت بھی فراخدلی سے ضائع کرتا تھا۔ اکثر اس کی اسائنمنٹس نامکمل رہ جایا کرتی تھیں اور اس کی پاکٹ منی وقت سے پہلے مکمل ہو جایا کرتی تھی لیکن یہ سب مسائل ایک طرف تھے اور اس کے بال جھڑنے کا مسئلہ دوسری طرف۔

اس کے بال آج کل تیزی سے جھڑنے لگے تھے اور سامنے سے کچھ کچھ گنجا ہو رہا تھا۔ ایک فیشن ماڈل بننے کا خواب دیکھنے والے لڑکے کے لیے یہ سب بہت پریشان کن تھا۔ اس نے بالوں کے علاج معالجے پر خوب روپے خرچ کرنے شروع کیے ہوئے تھے۔

اس لیے اسے اسائنمنٹس ہی نہیں روپوں کی مد میں بھی دوستوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ اسی لیے اس کا واٹس ایپ دیکھ کر وہ زیادہ پریشان نہیں ہوا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اس نے روپے مانگنے کے لیے ہی یہ تمہید باندھی ہوگی اور جب وہ کال کر کے دریافت کرے گا کہ بُری خبر کیا ہے تو ارباب کہے گا یار میرے مزید بال جھڑ گئے ہیں۔ یا میرا وزن 250 گرام بڑھ گیا ہے۔ اس لیے اس نے فون کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

پہلے اطمینان سے اپنی پیکنگ مکمل کی پھر نہانے گھس گیا۔ وہاں سے نکلا تو ہیئر ڈرائر لے کر بال سکھانے لگا۔ اس کام میں دو ڈھائی گھنٹے صرف کر کے اس نے بیڈ پر بیٹھ کر ابھی فون اٹھایا تھا۔ ارادہ تھا کہ نیم دراز ہو کر آرام سے موبائل سرفنگ کرے گا۔ ارباب کے کافی سارے میسجز آئے ہوئے تھے۔ اس نے کال نہ کرنے پر دو چار طعنے دینے کے بعد لکھا ہوا تھا۔

"لاریب نے خودکشی کر لی۔"

"واٹ۔" اسے شدید جھٹکا لگا۔ اتنا جھٹکا تو گلے کی بات سُن کر بھی نہیں لگا تھا۔ وہ جو نیم دراز تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لا...... ریب...... نے......؟ لا...... ریب نے خودکشی کر لی؟"

اسے ایک لمحے کے لیے تو یقین ہی نہ آیا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے دوہرایا تھا۔

☆☆☆

آدھی رات بیت چکی تھی۔ حویلی کے پچھلے حصے میں کچھ شور سا سنائی دیا۔ وہ سو چکا تھا لیکن اسی شور سے اس کی آنکھ کھلی۔ اسے لگا وہ بس پانچ منٹ ہی سویا ہے اور آنکھ کھل گئی ہے۔

پہلے اس نے کروٹ بدل کر سو جانا چاہا کہ شاید کوئی سیاح آئے ہوں گے اور ملازم ان کا سامان وغیرہ رکھواتے ہوئے بے احتیاط ہو کر اونچی آواز میں باتیں کر رہے ہیں لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ آواز اس کے کمرے کے قریب سے آرہی ہے جبکہ سیاح پچھلے حصے میں ٹھہرائے جاتے تھے۔

اس نے سرہانے کے قریب رکھا موبائل اٹھا کر وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اس وقت عموماً سیاح آتے بھی نہیں تھے۔ ہزارہ ایکسپریس ہائی وے کے بننے سے رات کے وقت ان علاقوں کی طرف آمدورفت کچھ بڑھ چکی تھی لیکن ایک تو ابھی بھی بڑے شہروں والی صورت حال نہیں تھی دوسرا بٹگرام میں سیاح کے لیے ایسی کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں جیسی وادی چوڑ وغیرہ کی طرف تھی، اس طرف لوگ صرف تازہ دم ہونے اور چائے پینے کے لیے رکتے تھے۔ بٹگرام کی آبادی تو اتنے بجے تک آدھی نیند پوری کر چکی ہوتی ہے اس لیے وہ اس بے وقت کی کھٹ پٹ سے بدمزہ ہوا لیکن ایک خیال بجلی کی طرح دماغ میں چمکا تھا۔

گلے کی بات یاد آئی اور یہ بھی یاد آیا کہ اس کے سو جانے تک بھی خان بابا اسلام آباد سے لوٹے نہیں تھے۔ وہ اپنے بستر سے اترا اور دبے پاؤں چلتا کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ چوروں کی طرح اس نے بھاری ویلوٹ کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔

اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔ خان بابا کی جیپ کھلے احاطے میں اندر کی طرف کھڑی تھی۔ یہ جیپ باہر والے حصے میں کھڑی کی جاتی تھی لیکن جب تھاکوٹ سے کوئی مہمان خواتین آتی تھیں تو ہی اسے اندر لایا جاتا تھا۔

ہلکی سی روشنی میں بھی وہ دیکھ سکتا تھا۔ خان بابا اپنے ملازم کم ڈرائیور وراثت سے باتیں کرنے میں مصروف لگتے تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے وراثت کو وہاں سے جاتے دیکھا پھر خان بابا نے جیپ کا پچھلا دروازہ کھولا تھا۔

کمرے کے اندر کھڑے اسے پسینہ سا آگیا۔ گلے کے خدشات ٹھیک تھے۔ ایک چادر میں لپٹی لپٹائی لڑکی اتر کر دھیرے دھیرے ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ خان بابا اسے سامنے کے کمرے کی طرف لا رہے تھے۔ وہ گھبرا کر تھوڑا سا پیچھے ہوا کہ کہیں وہ اسے دیکھ نہ لیں حالانکہ اس کا امکان کم تھا کیونکہ اس کے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا مگر پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ ذرا سا پیچھے ہٹ گیا اور پردے کی جھری کو مزید محدود کر دیا۔ وہ دونوں مزید قریب آتے جا رہے تھے۔ اس کا دل گلے کے متعلق سوچ کر پریشان ہونے لگا تھا۔

''خان بابا! ایسا کیوں کر رہے ہیں آپ؟'' یہ سوال وہ ان سے کبھی بھی نہیں پوچھ سکتا تھا۔

برآمدے میں روشنی زیادہ تھی۔ وہ دونوں اس کے کمرے کے اور بھی قریب آگئے تھے۔ زیادہ قریب آجانے پر اس لڑکی کا چہرہ اس روشنی میں واضح ہوا تھا۔ ایک جھپاکا تھا جو اس کی بصیرت نے سہا تھا۔

''لاریب......؟''

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

عندلیب زہرا



"لڑکیوں سے نہیں ان کے نصیبوں سے ڈر لگتا ہے۔"

جب سے بینا پھپھو کی تیسری بیٹی ہوئی تھی دادی اٹھتے بیٹھتے یہ ہی کہتیں۔

"کیسی گنوں والی بیٹی تھی میری...... ناقدروں میں چلی گئی۔" دادی کو بیٹی کا صدمہ تھا۔ اپنے زمانے میں

بہت دبدبے والی خاتون تھیں۔ لیکن بیٹی کی شادی کے بعد زود رنج اور رقیق القلب ہوگئی تھیں۔ ان دنوں تیرہ سالہ حریم وادی کی بہترین سامع تھی۔ لیکن اس وقت ان کی باتیں اس کے سر پر سے گزر جاتیں۔

''تعلیم، تربیت، جہیز معلوم نہیں کہاں کمی رہ گئی تھی؟'' وہ اکثر کھوئی جاتیں۔

''ارے اپنے جگر کے ٹکڑے پڑھا لکھا کر..... تراش کر اگلوں کے حوالے کرو اور وہ کچھ نہ گردانیں۔'' جب پھوپھو سے فون پر بات ہوتی وہ یہی کہتیں۔

حریم کی زندگی کے ہر دن کی شروعات بابا اور مما کے پیار سے ہوتی اور دادی کی دعاؤں پر اختتام پذیر ہوتی۔ وہ شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ جب امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ اپنے والدین کے لیے وہ سات بیٹوں کے برابر تھی۔ اس کی پیدائش پر دل کھول کر خوشیاں منائی گئی تھیں۔ اور حقیقتاً اسے کسی شہزادی کی طرح رکھا گیا تھا۔

حریم نے ہمیشہ محبتیں ہی سمیٹی تھیں۔ سو زندگی کا تاریک پہلو یا لوگوں کے منفی رویے اس کی نظروں سے اوجھل ہی رہے تھے بینا اس کی اکلوتی پھوپھو تھیں..... ناز و نعیم میں پلی، خوب صورت، خوب سیرت۔ لیکن نصیب کے ہاتھوں مار کھا گئی تھیں۔ شوہر شقی القلب، اوپر سے تین بیٹیاں سو صبر سے زندگی گزار رہی تھیں۔ لیکن آنکھوں کی ویرانی دلی کیفیات کی غماز تھی۔ دادا دادی کی زندگی بیٹی کے حالات پر کڑھتے گزر رہی تھی۔

''بس بابا! نو اسٹڈی.....'' جی ایس سی کے رزلٹ کے بعد اس نے اعلان کیا۔

''بس گھومنا پھرنا ہوگا۔ انجوائے منٹ.....'' مسکراتے ہوئے بابا سر ہلا رہے تھے۔ گویا متفق ہوں۔

''جی نہیں..... گھر داری سیکھو، کھانا پکانا..... ورنہ طعنے مجھے ملیں گے۔'' امی نے اس کی پلاننگ سن کر تادیبی انداز اختیار کیا۔

''بابا.....'' اس نے شکایتی انداز میں کہا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گئے۔

''ثمینہ اگلے ماہ آرہی ہے۔ جنید کے ساتھ..... اب اپنوں میں کیا سوچنا۔ اچھا ہے ناں بیٹی اپنوں میں جائے گی۔'' اس نے لاؤنج سے نکلتے ہوئے امی کی آواز سنی۔

''جنید۔'' اس نے کافی سال پہلے دیکھا تھا۔ فربہی مائل..... سانولا رنگ، کم گو سا لڑکا جس کے کالے ہونٹ اور حلقے اسے کبھی پسند نہ رہے تھے۔

''خالہ! جنید بھائی کے اتنے حلقے کیوں ہیں۔'' وہ منہ پھٹ سدا سے تھی۔

''ارے بیٹا! بہت محنت کرتا ہے وہ..... پڑھائی..... جاب..... بس صحت سے لاپرواہ ہے ناں..... خالو کے بعد وہی بڑا ہے گھر کا۔'' خالہ کے پاس ہر بات کا جواب ہوتا تھا۔

امی اور خالہ اکثر اپنا رشتہ مضبوط کرنے کے لیے اس کا اور جنید کا تذکرہ کرتیں۔ لیکن ابو، وہ تو لاڈلی بیٹی کو اپنے قریب رکھنا چاہتے تھے۔ کسی قدر دان کے ہاتھوں دینا چاہتے تھے۔ اور ایسے میں اس کے ذہن میں ہمیشہ ارسل کا نام آتا۔

ارسل، شمائلہ کا بھائی تھا۔ ان تینوں کی تکون اسکول سے کالج اور یونیورسٹی تک مشہور تھی۔ وہ دوست تھے..... کب دل بدلے معلوم نہیں بس ایک دوسرے کا ساتھ تقویت کا باعث بنتا۔ معلوم نہیں قسمت میں کیا لکھا تھا۔

لیکن وہ والدین کے فیصلے پر راضی برضا رہنے والی لڑکی تھی۔ اس نے امی ابو کی تمام باتیں شمائلہ سے ڈسکس کیں۔

''تم اب بتا رہی ہو.....'' اس کے لہجے میں شکوے تھے۔

''ارسل بھائی نے تمہیں ہمیشہ ایک مضبوط رشتے میں دیکھا ہے۔ اپنے ساتھ.....'' حریم بالکل خاموش تھی۔ اس کی نظریں ان کرنوں پر تھیں جو جالی کے دروازے سے چھن چھن کر اندر آرہی تھیں۔

ارسل نے اسے سائیکل چلانا سکھائی تھی۔ کمپیوٹر میں وہ اس کا استاد تھا۔ کوئی پریشان کرتا تو ایسا سبق

سکھاتا کہ بس...... اسے بھی اپنی زندگی میں ارسل، مہربان ابر لگتا۔ کبھی سرما کی دھوپ، کبھی بن موسم کی ہلکی سی پھوار جیسا...... لیکن امی اور بابا نہیں مانیں گے...... وہ غیر کو اپنوں پر فوقیت نہیں دیں گے۔ اس لیے اس نے اپنے دل کا راز کسی پر آشکار نہیں کیا تھا۔ لیکن آنکھیں جو سب کچھ عیاں کر دیتی ہیں۔ جن میں ارسل کو دیکھ کر چمک آجاتی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور فون بند کر دیا۔

اگلے روز ارسل، شائلہ اور اپنے والدین کو لے کر آگیا...... پڑوسی تھے۔ برسوں پرانے تعلقات...... تینوں بینا پھوپھو سے ٹیوشن پڑھتے...... سو وہ ان کی دوست تھیں۔

امی اور بابا نے سبھاؤ سے انکار کر دیا۔

"انکل! جواز تو بتایئے ناں۔" ارسل نے التجا کی۔

"ہم خاندان سے باہر رشتے نہیں کرتے، ایک بینا کا کیا جس پر اب تک پچھتا رہے ہیں۔" امی نے رکھائی سے کہا۔

بینا ارسل کے ابو کے توسط سے آنے والے رشتے داروں میں بیاہی گئی تھی...... سو کھنچاؤ فطری تھا۔

بار ہا کہنے کے باوجود انکار اقرار میں نہ بدلا۔ یہاں تک کہ بینا پھوپھو اپنے شوہر کے ساتھ آئیں۔ ابو متذبذب ہوگئے۔ بظاہر ارسل میں کوئی خرابی نہ تھی۔ امی نے حریم سے پوچھا۔ انداز میں سختی تھی۔ وہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔

"جو آپ کی مرضی۔" کہہ کر سامنے سے ہٹ گئی، ہاں دھیان میں بار بار وہ براؤن آنکھیں آتیں جو بھی شکوہ کناں ہوتیں کبھی مسکرا اٹھیں۔ وہ بار بار دل کو سمجھانے لگتی۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔" بابا تو چاہتے تھے بیٹی نظروں کے سامنے رہے۔

"جب خاندان میں بہترین بر موجود ہے تو باہر کیوں جائیں۔" وہ بے نیازی سے کہہ رہی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ان خواتین میں شمار ہوتی تھیں جو میکے کو ہر بات میں فوقیت دیتی ہیں۔ میکے کے نام پر فقط بہن ہی تھی۔ سو وہ رشتہ مضبوط کرنا چاہتی تھیں۔ چاہے بیٹی کا دل ٹوٹ جائے۔ انہوں نے خالہ کو فون کر کے رضامندی کا عندیہ دیا۔

حریم کا دل خاموش تھا۔ اس سے خفا بھی۔

اسے لگتا جیسے بابا خوش نہیں ہیں...... بینا پھوپھو خاموش تھیں، شائلہ نے اس دن کے بعد تعلق توڑ لیا تھا۔

ارسل کہاں تھا۔ کچھ خبر نہیں۔

☆☆☆

خالہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔

"ارے اپنی گڑیا کو اس شان سے لے کر جاؤں گی کہ دنیا دیکھے گی۔" وہ بار بار اعلان کرتیں۔

"یہ تو میری پری ہے۔ کام کروا کر ہاتھ خراب مت کرواؤ اس کے......" وہ برتن دھوتی تو جھٹ سے امی کو ٹوکتیں صدف اور حمنہ اس کے لیے تحائف لائی تھیں۔

"ہماری بھابھی تو ایسٹرن بیوٹی ہے۔" صدف اس کے لمبے بالوں کو سراہتی۔

جنید ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ کیونکہ اس کو یہاں قیام مینرز کے خلاف لگ رہا تھا۔ ابو کو اس کی یہ بات بہت معقول لگی۔ غرض یہ کہ خالہ کے برتاؤ نے ان کے خدشات دھو ڈالے تھے۔ صدف اور حمنہ کے ساتھ حریم بہل گئی تھی۔ ان ہی ہنگامہ پرور دنوں میں اس کا نکاح ہوگیا۔

بہت شان سے شوکت سے ہوا۔ ایک دنیا اکٹھی تھی ماسوائے بینا پھوپھو کے...... متحمل مزاج بھابھی نے بھی ناراض نند سے دوری ہی بہتر سمجھی تھی۔ چند دن پاکستان میں گزار کر خالہ کی فیملی یو کے چلی گئی تھی۔ اس دوران دعوتیں اڑائیں...... سیریں کیں۔

جنید کم گو اور سنجیدہ مزاج نوجوان تھا۔ حریم کو اس کے انداز میں نہ تو بہت التفات محسوس ہوتا نہ ہی بےزاری۔

امی اور بابا اپنے داماد کو فل پروٹوکول دے رہے

تھے۔ اس کی سب سہیلیوں نے پورے جوش کے ساتھ شرکت کی تھی۔ ماسوائے شمائلہ کے...... اس نے ٹیرس سے دیکھا کہ ان کے گھر کی بتیاں بند تھیں...... شاید کہیں گئے ہوئے تھے۔

خالہ کی فیملی واپس چلی گئی۔ اسے چند ماہ بعد جانا تھا۔ جب کاغذات بن جاتے۔ یہ عرصہ اس نے خانہ داری سیکھنے میں گزارا تھا۔ جنید کا فون آتا مگر بہت کم۔ اور خود سے کرنا مناسب نہ لگتا۔

ہاں خالہ بہت خلوص کا اظہار کرتیں۔ جنید کی محنت، جاب، ڈبل شفٹ کا تذکرہ کرتیں۔ چھ ماہ پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ اور آخر کار اب یو کے کی سرد فضاؤں میں کھڑی خود کو نئے ماحول سے مانوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

ہفتہ، دس دن تو دعوتوں میں گزر گئے۔ پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ سارا گھرانہ جاب کرتا تھا۔ صرف حمنہ پڑھ رہی تھی۔ وہ سارا دن ٹی وی دیکھتی۔ یا دیواریں۔ ہر شے ساکت لگتی...... ایسے میں امی ابو شدت سے یاد آتے۔ سہیلیاں...... محلہ...... کالج کا چوکیدار...... جسے وہ سب ٹائیگر چاچا کہتی تھیں۔

پھر اچانک جنید کی جاب ختم ہو گئی۔ وہ سارا دن گھر میں گزارتا سو کر۔

''پتا نہیں اسے اتنی نیند کیسے آ جاتی ہے۔'' وہ کوفت سے سوچتی اور یہ عقدہ بھی کھل ہی گیا۔ اس کی الماری سے نشہ آور گولیاں اور کانچ کی بوتلیں نکلیں وہ ساکت تھیں۔

''ارے بھئی! کسی دوست کی ہوں گی......'' خالہ نے گویا مکھی اڑائی پھر اس نے جنید کو کسی انگریز لڑکی کے ساتھ دیکھا۔ اس نے خالہ سے تذکرہ کیا۔

''ارے اس کے باس کی بیٹی ہے...... بیمار ہے...... نفسیاتی ہے'' خالہ پردے ڈالتی رہتیں۔

لیکن قدرت ان کے سارے راز افشا کر رہی تھی۔ سارا زیور خالہ کے قبضے میں تھا۔ صدف اور حمنہ بے تکلفی سے اس کی اشیاء استعمال کرتیں اور خستہ حالت میں واپس کرتیں خالہ سے گلہ کیا تو وہ ناراض ہو گئیں۔

اسے لگتا وہ واقعی اجنبی دیس میں آ گئی ہے۔

انجان، بے مہر لوگ......

خالہ ٹوکتی رہتیں۔

''توبہ! ماں نے کچھ نہیں سکھایا۔''

ان کے رویے میں اجنبیت آ گئی تھی۔

اسے امی کی مہربان گود اور بابا کا لمس یاد آتا...... آنسو امڈ امڈ آتے۔

''بیٹا! تم ٹھیک ہو ناں؟'' امی فکر مندی سے پوچھتیں۔ وہ ہاں، ہاں کر کے یقین دہانی کرواتی۔ یہ اور بات کہ اس رات اس کا تکیہ بھیگ بھیگ جاتا۔ اپنوں کی یاد میں۔ اس نے دیکھا کہ زیادہ تر ایشیائی لڑکیاں ایسے حالات سے دوچار ہیں۔ لیکن جلد ہی جاب کر کے پیروں پر کھڑی ہو جاتیں۔ اکثریت غریب گھرانے سے تھی سو ادھر کے سخت ماحول میں خود کو ڈھال لیتیں...... لیکن وہ تو ناز و نعم میں پلی تھی۔ محبت آشنا...... یہ سب کیسے برداشت کرتی۔

انہی دونوں گروسری کی شاپنگ کرتے ہوئے اسے الماس نظر آئی۔ وہ بینا پھوپھو کی فرینڈ تھی۔ اب سیلز گرل کی حیثیت سے جاب کر رہی تھی۔ دو بچے۔

''حریم!'' دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔

''اتنی کمزور...... کیوں...... میاں کیا کرتا ہے۔''

حریم کو عرصے بعد کوئی اپنا ملا تھا۔ وہ پھیکی مسکراہٹ سے دیکھتی رہی۔ یہ ملاقات پہلی تھی مگر آخری نہیں......

اکثر ویک اینڈ پر گروسری کی خریداری کے لیے وہ آتی اور یہ چند گھڑیاں اس کے لیے مہربان ثابت ہوتیں۔

حریم! اکثر لماس کے سامنے رو پڑتی......

الماس اسے تسلی دیتی...... حوصلہ دیتی۔

''تم جاب کر لو...... یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

''خالہ نہیں مانیں گی۔'' اس نے نفی میں

سر ہلایا۔

"کیوں۔" الماس کو حیرت تھی۔

وہ خاموشی سے اپنے سوکھے سیاہ ہاتھ دیکھ رہی تھی...... کیا کہتی کہ مفت کی نوکرانی جو مل گئی ہے۔ اس کی خاموشی نے الماس کو بہت کچھ باور کروادیا تھا۔

"یہ یہاں کی عام کہانی ہے...... لوگ لالچ کے ہاتھوں اپنی بیٹیوں کی شادی یہاں کردیتے ہیں...... لیکن یہاں کا ماحول، لڑکوں کا کردار ...... اپنی آنکھیں بند کردیتے ہیں، کچھ یہاں ایڈجسٹ ہوجاتی ہیں اور کچھ تمہاری طرح پردیس میں اجنبی بن جاتی ہیں...... میں بھی یہاں بہت مشکل سے ایڈجسٹ ہوئی۔ بچے ہوئے تو لگا زندگی رواں ہے۔ ورنہ تو ایک جبر مسلسل تھی۔"

الماس نے کافی کا کپ اس کے سامنے رکھا۔ اور سینڈوچ اوون میں گرم کرنے لگی۔

لاابالی...... ہنسوڑ حریم ایک دم سمجھ دار ہوگئی تھی۔

وہ دور بیٹھے والدین کو پریشان نہیں کرسکتی تھی۔ ایک سال بیت گیا تھا۔

انہی بوجھل...... اداس دنوں میں۔

خالہ اسے سونی گود کا احساس دلاتیں...... وہ خود بھی پریشان ہوتی۔

اللہ سے دعا کرتی، لیکن معلوم نہیں کیوں اسے لگتا اس کے نصیب کی دعائیں آسمان تک پہنچ نہیں پاتیں...... آخر یہ عقدہ بھی حل ہوگیا۔

الماس کے ساتھ وہ بچوں کو لے کر پارک میں آگئی۔ سبزہ...... ہنستے کھیلتے لوگ...... بچوں کی شرارتیں...... وہ انہماک سے سب دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس کی نظر جنید اور حمنہ پر پڑی۔ وہ دونوں ایک انڈین فیملی کے ساتھ آئے تھے اور انداز سے لگتا تھا کہ تعلقات پرانے ہیں......

سانولی تیز سی لڑکی کے ساتھ جنید کا التفات حیران کن تھا۔ وہ بجھے دل کے ساتھ واپس آگئی......

اس نے مڑ کر دیکھا۔ جنید کا ہنستا مسکراتا چہرہ کتنا اجنبی لگ رہا تھا۔

بہت سے پردے اٹھ گئے تھے۔

☆☆☆

اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ رشتے تکلیف نہیں دیتے۔ ان سے وابستہ توقعات توڑ دیتی ہیں۔ جان نچھاور کرنے والی خالہ لاتعلق رہتیں بیا اور حمنہ موڈی...... اور جس کے لیے سات سمندر پار آئی تھی وہ تو اجنبی بھی نہیں تھا...... کبھی نہیں......

خالہ کو بگڑے سپوت کے لیے معصوم گھریلو لڑکی درکار تھی اور حریم ان کے معیار پر پوری اتری تھی۔

حریم معصوم تھی لیکن بیوقوف نہیں...... بدلتی نظریں اور رویے وہ شروع سے محسوس کرلیتی...... اب تو اس کی زندگی کا معاملہ تھا۔ وہ اپنا نصیب سزا کے طور پر کیوں قبول کرتی...... جب کہ اس سے ایسا کوئی گناہ سرزد نہ ہوا تھا۔

اس نے والدین کا حکم قبول کیا تھا۔ اس فیصلے کو نباہنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ کہاں لکھا تھا کہ وہ خود کو اذیت کی بھٹی میں جھونک دے۔ اس سرد اور بے مہر دنوں میں شمائلہ کی کال آگئی۔ وہ حریم سے ناراض تھی۔ بہت ناراض لیکن اس کی مشکل زندگی کا علم ہوا...... تو سارے گلے، لاتعلقی اور ناراضی بھاپ بن کر تحلیل ہوگئے۔ دونوں رورہی تھیں۔

آخر ارسل کی آواز نے انہیں ہوش کی دنیا میں لاکھڑا کیا۔

"بس کردو شمی......"

شمائلہ کی کال پہلی تو ثابت ہوئی لیکن آخری نہیں...... حریم کو بہت سہارا لگتا...... اجنبی دیس اور بے مہر رویوں میں امید دلاتا لہجہ...... اس کی ڈھارس بندھاتا...... وہ کسی ایک فیصلے پر پہنچ جانا چاہتی تھی......

ان ہی دنوں...... جنید نے بہانے سے اس سے جھگڑا کرنا شروع کردیا۔ وہ جواب دیتی تو مار پیٹ پر اتر آتا غلیظ زبان...... الزام تراشی...... اسے جنید کے رویے نے احساس دلایا کہ وہ محض خالہ کی پسند ہے۔ اسے دبو، بدھو لڑکیاں نہیں پسند، حریم اپنی تذلیل پر روتی۔

"کیا مجھے کوئی دعا نہیں ملی جو اتنا ظالم شخص ملا ہے۔" وہ اپنی ہتھیلیاں دیکھتی اور خود سے سوال کرتی۔

اسے بینا پھوپھو بہت یاد آتیں۔ بے شک ان کی زندگی اب بہتر تھی ساس سسر فوت ہو چکے تھے۔ نندوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ایک صبر ان کے چہرے پر رقم تھا۔ وہ ہر دم اپنی بیٹیوں کے لیے دعا گو رہتیں۔ شوہر کو اب بیٹیوں نے نرم کردیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ بینا پھوپھو ایک بار مار کھا کر میکے آئیں......

دادی کا بی پی ہائی ہوگیا...... ابو پریشان...... دادا چاہتے تھے کہ بیٹی واپس چلی جائے...... لوگ کیا کہیں گے...... (وہی پرانی بوسیدہ سوچ)

آخر امی نے ہمت کی۔

''ابا جان! بیٹیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ انہیں پڑھا لکھا کر مار کھانے بھیج دیں۔ کچھ دن رکیے۔ بینا کی حالت سنبھل جائے۔ پھر کوئی قدم اٹھاتے ہیں۔''

اور واقعی امی کے تدبر اور معاملہ فہمی نے پھوپھو کے مسائل حل کرنے میں مدد کی تھی۔ ''اب آپ اپنی بیٹی کے لیے کیا فیصلہ کریں گی؟''

حریم نے آنسو پونچھتے ہوئے خود کلامی کی، شمائلہ سے اس نے مشورہ کیا۔

''میں بہت تھک گئی ہوں۔ ٹوٹ گئی ہوں'' اس کی آواز میں بین تھے۔ شمائلہ دم بخود تھی۔ ساکت......

''حریم! میں...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں تم واپس آؤ......'' اس نے کتنے عرصے بعد ارسل کی آواز سنی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

کیا؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بس آنسو امڈتے آرہے تھے بنا رکاوٹ کے...... جب خالہ کی آواز نے اس کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''اچھا! تو یہ ہے وہ یار...... جس کی وجہ سے تیرا دل نہیں لگتا میرے بیٹے کے ساتھ، آپا نے اچھا نہیں کیا۔ اتنا بڑا دھوکا۔'' وہ صفائی دینا چاہ رہی تھی۔ لیکن شوروغل۔۔ گالیاں...... پھر جنید کی دھاڑ اور مار پیٹ کی آواز...... فون کال منقطع نہیں ہوئی تھی۔ ارسل اور شمائلہ سن سی حالت میں تھے۔ شمائلہ نے فون کرکے حریم کے والدین کو بتادیا۔

☆☆☆

جنید چھوڑنا چاہتا تھا۔ اب تو بہانہ مل گیا تھا۔ خالہ نے حفظ ماتقدم کے تحت فون کرکے پاکستان میں اسے خوب بدنام کیا......

''بابا! کیا آپ کو اپنی بیٹی پر بھروسہ نہیں ہے۔'' حریم کی دگرگوں حالت دیکھ کر بھی وہ خاموش تھے۔

حریم نے سب کتھا سنا ڈالی۔

''ارسل سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔'' امی کی بات نے اسے چپ کردیا تھا۔

''مجھے...... یا اپنے بابا کو کال کرتیں...... بینا کو حال دل سناتیں''

امی، بہن کی باتوں کے زیر اثر تھیں۔

بابا خاموش تھے۔ پھر اچانک بولے۔

''حریم! میں ٹکٹ بھیجتا ہوں، واپس آؤ۔''

امی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ حریم کو سہارا ہوا۔ کوئی تو ہے اس پر یقین رکھتا ہے۔ امی کے رویے نے اسے مایوس کردیا تھا۔

جنید اسے دیکھتا برا بھلا کہنے لگتا...... خالہ...... حمنہ...... صدف نے بات چیت ترک کردی تھی۔

کوئی روزن نہیں۔

ہوا کا گزر نہیں

اسے دم گھٹنے کا احساس رہنے لگا تھا۔

اس رات وہ پانی پینے اٹھی۔ دل گھبرایا تو پرانی البم نکال کر بیٹھ گئی...... پرانی کتابوں کے پیچھے مانع حمل کی گولیاں ملیں۔ وہ حیرت سے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی...... اس نے ذہن پر زور دیا...... اکثر جنید سب کے لیے کافی بناتا۔

''بھائی کی کافی ہم سب کی فیورٹ ہے۔'' بہنوں کی مشترکہ رائے تھی۔

''اوہ۔'' ایک گہری سانس لی۔ فیصلے میں آسانی ہوگئی تھی۔ اب کی بار اس نے بینا پھوپھو کو فون کیا اور کچھ بھی راز نہ رکھا اسے جنید کے ساتھ رہنے کا جواز نظر نہ آتا تھا۔ بہتری کی امید بھی نہ تھی۔ اولاد بھی نہ تھی۔ مستقبل غیر یقینی تھا۔

اسے یقین تھا کہ اب اس کا مقدمہ بینا پھوپھو

لڑیں گی۔

☆☆☆

''آپ حریم کو واپس بلائیں بھائی۔''

''شادی کوئی گڈا، گڈی کا کھیل نہیں ہے بیٹا...... سب لوگ شریک عزیز کیا کہیں گے؟'' امی تذبذب کا شکار تھیں۔

''آپ بہن سے رشتہ بچانے کی خاطر بیٹی کو زندہ درگور کر رہی ہیں۔'' بینا پھوپھو نے طنزاً کہا۔

''آپ تو کہتی تھیں کہ پڑھی لکھی بیٹیاں اس لیے نہیں ہوتیں کہ انہیں مار کھانے کے لیے بھیج دیں۔ آج آپ خود کیا کر رہی ہیں۔ سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود......''

بینا پھوپھو حیرت زدہ تھیں۔

''آپ نے بہن کی محبت میں اندھی کھائی میں حریم کو پھینک دیا۔ جنید کی اصلیت مشتاق کو اس کے دوست نے بتادی تھی۔ آپ نے مجھے نکاح تک میں نہ بلایا...... مجھ پر بھروسا نہ کیا...... میں ہر لمحہ حریم کے لیے دعا گو رہی......''

بابا کا چہرہ زرد تھا اور وہ ساکت تھے۔ ان کی نگاہوں میں ملامت تھی بیوی کے لیے...... پچھتاوے تھے اپنی بیٹی کے لیے۔ اور خدشات تھے اس کے مستقبل کے لیے۔ انہوں نے کچھ کہنا چاہا...... لیکن زبان ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ وہیں ڈھے گئے تھے۔

☆☆☆

ہارٹ اٹیک بہت شدید تھا۔

بچنا ایک معجزہ۔

ہوش میں آکر انہوں نے حریم کی بابت دریافت کیا۔

''بابا! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد ہم ملیں گے۔ بے فکر رہیں۔ میں کوئی کمزور، ڈرپوک لڑکی نہیں ہوں...... اپنے حق کے لیے کھڑی ہونے والی ہوں...... میں پاکستان آرہی ہوں......''

ویڈیو کال پر حریم نے مضبوط لہجے میں کہا...... خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کیسے؟؟ یہ اس کا دل جانتا تھا۔

امی روتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہی تھیں۔ اس نے محض اتنا کہا۔

''مقدر میں جو تکلیفیں ہوتیں ہیں وہ مل کر رہتی ہیں۔ مجھے کوئی گلہ نہیں ہے۔''

خالہ ہنوز لاتعلق تھیں۔

جنید کا خیال تھا کہ بیٹی کے کرتوتوں نے ان حالوں پہنچایا۔ ارسل نے دوبارہ کبھی رابطہ نہیں کیا۔ شمائلہ نے فون کیا...... اس نے نہیں سنا۔ الماس کے وجود سے ڈھارس تھی۔ کبھی اسے لگتا جیسے اس کی حسیات مرگئی ہیں...... کبھی اس کا دل کرتا وہ چیخ چیخ کر روئے...... اسے اپنا آپ نفسیاتی مریض لگنے لگا تھا۔

پھوپھو نے اس کا ٹکٹ بھیج دیا تھا...... چند دن بعد اس کی فلائٹ تھی......

پھوپھو مسلسل رابطے میں تھیں...... جذباتی سہارا دیتیں...... ''اپنے باپ کی زندگی کے لیے خود کو مضبوط کرو بیٹا...... ہم سب تمہارے ساتھ ہیں ناں......''

اس کی خالی خالی آنکھوں کو دکھ سے دیکھتیں۔

''ارسل، شمائلہ تمہارے ساتھ ہیں...... ارسل ہر جگہ تمہارے لیے کھڑا ہے۔ خوش نصیب ہو جو اتنے رشتے تمہارے آس پاس ہیں......'' حریم اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھی۔

اسے اٹھنا تھا۔ ان کے لیے جو اس کے لیے فکر مند تھے، اس کے لیے پریشان تھے۔ واپسی کا سفر بہت دشوار تھا۔ ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں مسلے ہوئے ارمان، نوحہ کناں روح تھی۔

لیکن دل میں کہیں بہت گہرائی میں یہ احساس تھا کہ اس کے اپنے اس کے لیے فکر مند تھے۔ دعا گو تھے۔ انہوں نے اسے اکیلا نہیں چھوڑا...... اور ارسل...... اس کا خیال آج بھی اسے سکون دیتا تھا...... یقین کا احساس...... جس نے اس کی روح پر مرہم رکھ دیا تھا۔ اس وقت اس کا یقین کیا جب سب کچھ اس کے خلاف تھا۔

ہاں اس تکلیف دہ سفر کے اختتام پر ایک روشن امید اب بھی موجود تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں...... سفر دشوار تھا لیکن منزل بامراد تھی......

☆

وہ نظریں جھکائے، بغل میں پرس دبائے، بڑی سی چادر کی بکل مارے آہستہ آہستہ مگر مضبوطی سے قدم اٹھاتی گھر کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ابھی گھر جا کر اسے ایک محاذ پہ لڑنا تھا، اپنے دفاع میں دلائل دینا تھے۔ گھر جانے پہ روز ہی جنگ وجدل کا سامان تیار ہوتا، گھمسان کا رن پڑتا، زبان سے تلوار بازی ہوتی اور بنا کسی ہار جیت کے جنگ ختم۔

جیسے ہی وہ اس گلی میں داخل ہوئے، وہ وہیں گلی کے نکڑ پہ رک گیا اور وہ آگے بڑھ گئی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر دروازہ دھڑ دھڑایا لیکن پھر مڑ کر نہیں دیکھا۔ دیکھے بنا بھی وہ جانتی تھی کہ وہ وہیں کھڑا ہوگا اور تب تک کھڑا رہے گا جب تک وہ اندر داخل ہو کر گیٹ بند نہیں کر لیتی۔

''آ گئیں؟'' پھپھو نے گیٹ کھولتے ہی سوال جھاڑا۔ اس نے سلام کیا اور سوال نظر انداز۔

پھپھو نے سر گیٹ سے نکال کر باہر دیکھا جہاں نکڑ پہ کھڑا ایک سایہ معدوم ہوا چاہتا تھا۔ ناک سکوڑے وہ گیٹ بند کر کے اس کے پیچھے اندر آئیں۔

''آج بھی وہی چھوڑنے آیا تھا؟'' اس نے جواب نہ دیا۔ روز ایک ہی سوال کا جواب دینا اسے پسند نہیں تھا۔ گلاس میں کولر سے پانی بھرا اور غٹا غٹ پینے لگی۔ پیدل چلنے سے حلق سخت خشک ہو جایا کرتا تھا۔

''وہی چھوڑ کر گیا ہوگا یقیناً۔'' غصے سے بڑبڑاتے انھوں نے ناگواری سے اسے دیکھا۔

''روز ایک ہی سوال سے تنگ نہیں آتیں آپ؟'' وہ سن سن کر تنگ آ چکی تھی لیکن وہ کر کر کے نہیں تھکتی تھیں۔

''میں تو تم سے تنگ آ گئی ہوں۔''

میمونہ صدف



ناولٹ

اس نے زخمی نظروں سے پھپھو کو دیکھا اور گہری سانس بھری۔ یہ اس کے لیے کون سی نئی اطلاع تھی بھلا کہ وہ ایسی کسی بات پہ چونکتی۔ ایسی باتیں وہ اپنے بچپن سے سنتی آ رہی تھی۔

''میں بھی خود سے تنگ آ گئی ہوں تو بتائیں کیا کیا جائے اب میرا؟'' چادر اتار کر اس نے اندر اپنی جھلنگی چارپائی پہ اٹھا کر رکھی اور پرس سامنے الماری میں۔ سخت تھکاوٹ ہو چکی تھی۔ روز کی یہ مشقت پہلے اسے کبھی نہیں تھکاتی تھی۔ اب تھکانے لگی تھی۔

''مت آیا کر اس کے ساتھ۔ کیوں ہماری





عزت کا پاس نہیں ہے تجھے؟" ماتھا پیٹ کر اسے روز کی طرح احساس دلانے کی کوشش کی گئی۔ روز کا ڈرامہ۔ روز کا تماشا۔

"ایک وقت میں یا تو میں اپنی عزت کا پاس رکھ سکتی ہوں یا آپ کی۔ اور مجھے اپنی عزت کا پاس رکھنا زیادہ مقدم ہے۔" اس نے سختی سے گندھے بالوں کو آزاد کیا۔ لہجہ بالکل سپاٹ تھا جیسے یہ ساری باتیں اسے نہیں محلے والوں کو سنائی جارہی ہیں۔

"اس میں تیری عزت کو بھی بٹا لگ رہا ہے۔"

"لگنے دیں۔ کنکر، بٹوں کی مجھے پرواہ نہیں ہے لیکن رستے میں چلتے ان جانوروں کی ہے جو نوچ کھانے کو جھپٹتے ہیں۔"

وہ اب باورچی خانے میں گھسی اپنے لیے کھانا نکال رہی تھی۔ ایک چھوٹے ڈونگے میں چکن کی دو بوٹیاں رکھی تھیں جو یقیناً سنی کے لیے تھیں۔ وہی بیٹوں کو اچھا کھلانے کی روایت۔

اس نے خاموشی سے مونگ کی دال اپنی پلیٹ میں نکالی، دوپہر کی باسی روٹی اٹھائی اور باہر نکل آئی۔ پھپھو اس کے آنے تک کھانا نہیں بناتی تھیں اور وہ بھوک کے مارے مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ خود بنانے کی ہمت ہوتی نہیں تھی سو صبح یا دوپہر کی باسی روٹی ہی کھا کر گزارہ کر لیتی تھی۔ کھانا اب وہ پیٹ بھرنے کے لیے کھاتی تھی، مزے کے لیے کھانا کھائے عرصہ گزر گیا تھا۔

پھپھو اب اسے محلے اور اڑوس پڑوس کے سبھی گھروں اور ان کے مکینوں کے نام گنوا رہی تھیں جنھوں نے اسے سر راہ آتے جاتے دیکھا تھا۔ وہ ڈھیٹ بنی نوالے پہ نوالا نگل رہی تھی اور سامنے لگا گونگا ٹی وی دیکھ رہی تھی جس پہ مختلف کردار پتلیوں کی طرح آجا رہے تھے۔

"سن بھی رہی ہے یا نہیں۔ میں دیواروں کو سنا رہی ہوں کیا یہ سب؟" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے اس کے عین سامنے آکھڑی ہوئیں۔ اب ناچتے تھرکتے کردار پھپھو کے پیچھے روپوش ہو گئے تھے۔ اس کی پھپھو حلیمہ ناز۔

"آپ کہیں تو ان کے نام بھی گنوا دوں جنھوں نے مجھے دیکھا تو ہے لیکن آپ سے تذکرہ کرنا بھول گئے۔" پھپھو کو پتنگے لگ گئے۔ پھر وہ وہ سنایا جو اس نے کبھی پہلے نہیں سنا تھا۔ اس کی ذات کے متعلق، اس کی ماں کے متعلق اور اس کے پورے خاندان سے متعلق بھی جو اتفاق سے ان کا خاندان بھی تھا۔ ہر بار ہی دیے جانے والے طعنوں اور باتوں میں جدت ہوتی تھی۔ نجانے اتنے سالوں سے سنائی گئی باتیں اب تک پھپھو کے پاس ختم کیوں نہیں ہو گئی تھیں۔

"میں کل سے اس کے ساتھ آنا چھوڑ دوں گی۔ آپ کل سے سنی کو بھیجنا شروع کر دیں مجھے لینے کے لیے۔" سپاٹ چہرہ لیے اس نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ نہیں جاتا تجھے لینے تو کیا کروں پھر؟" وہ جاتا تھا یا نہیں اس کا اسے نہیں پتا تھا لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ وہ بھیجتی نہیں تھیں اسے۔

"مجھے کو سنا بند کر دیں پھر۔" کمرے کا دروازہ اس نے بند کر لیا اور اپنے بستر پہ آکر لیٹ گئی۔ پھپھو ہنوز بول بول کر اپنا خون جلا رہی تھیں اور ساتھ میں اس کا بھی۔

"کل سے آئرن کی گولیاں پھانکوں گی۔" کروٹ بدلتے ہوئے جو آخری بات اس نے سوچی تھی وہ یہ تھی۔

☆☆☆

وہ صبح ایک چھوٹے سے کلینک میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ باقاعدہ نرسنگ کا کوئی کورس نہیں کر رکھا تھا اس نے بس چند ماہ کلینک میں ہی سیکھتی رہی تھی۔ انجکشن بھرنا، لگانا۔ ڈرپ لگانا، اتارنا۔ بی پی چیک کرنا اور اسی طرح کے دوسرے چھوٹے بڑے کام۔ وہاں سارا دن نرس بنے رہنے کے بعد وہ شام

میں ایک اکیڈمی جا کر استانی کا روپ دھار لیتی تھی۔ اکیڈمی کم ٹیوشن سینٹر زیادہ۔ جہاں وہ چھوٹے بچوں کو جو مختلف جماعتوں سے تھے، کو اردگرد بٹھائے اردو اور حساب پڑھاتی تھی۔ اس سب سے اس کی اتنی آمدن ہو جاتی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر لیتی۔ ایک ناختم جدوجہد تھی اس کی زندگی میں پچھلے کئی سالوں سے۔

شام میں جب وہ گھر کے لیے نکلتی تو سورج ڈوب چکا ہوتا اور ملگجا اندھیرا پھیل رہا ہوتا تھا۔ شروع میں اسے اکیلے آتے جاتے ڈر لگتا تھا لیکن پھر اس نے ڈرنا چھوڑ کر بہادر بننا شروع کر دیا۔

شروع میں راہ چلتے کبھی کوئی جملہ کس جاتا، ایسا واہیات کہ وہ مارے شرم کے چل ہی نہ پاتی۔ قدم کہیں رکھتی اور پڑتے کہیں اور تھے۔ کبھی کوئی گاڑی روک کر ساتھ چلنے کی پیشکش کرتا۔ شاید سے کچھ اور سمجھتا تھا۔ کبھی کوئی پاس سے گزرتے جسم چھو جاتا تو کتنے دن وہ انگارہ بنی دہکتی رہتی۔ ایسے کسی واقعے کے بعد سارے راستے وہ گرتی پڑتی، لڑکھڑاتی رہتی۔ سارے منظر دھندلا کر ہوا میں تحلیل ہو جاتے۔ وہاں اس کے اور اس کی بے عزتی کے سوا کچھ نہیں بچتا تھا۔

دماغ سائیں سائیں کرتا رہتا اور نجانے وہ کیسے گھر پہنچا کرتی۔ گھر پہنچ کر بستر پہ پڑ جاتی اور روتی رہتی۔ یوں جیسے عزت کے نام پہ کچھ بچا ہی نہ ہو۔ سوچتی کہ اب سے باہر قدم نہیں رکھوں گی مگر ضروریات اسے پھر سے سڑک پہ، آسمان تلے لا کھڑا کرتیں۔ وہ چھیتو سی لڑکی اس دوران آدھی زندگی جیتی اور آدھی زندگی مرتی۔ وہ چاہے خود کو کتنا ہی ڈھک کر، چھپا کر، سمیٹ کر نکلتی مگر لوگ اسے وہی سمجھتے جو سمجھنا چاہتے تھے۔ پھر رہی سہی کسر ملنے ملانے والے پوری کر دیتے۔

"جب دیکھو اکیلی آوارہ گردی کرتی رہتی ہے۔"

چھوٹے محلے میں رہنے والے چھوٹے ذہنوں کے ساتھ گندی زبان کے مالک بھی نکلے تھے۔ اور جب وہ پھپھو سے کہتی کہ سنی کو اسے لینے بھیج دیا کریں تو وہ صاف ہری جھنڈی دکھا دیتیں۔

"اس کے پاس وقت کہاں؟" اور وہ چپ کر جاتی کیونکہ اسی سنی کے پاس ٹی وی کے سامنے بیٹھنے اور ریکارڈ سوتے کا خوب وقت تھا، بس اسے لینے چھوڑنے کے لیے وقت تنگ پڑ گیا تھا۔ دراصل وقت نہیں دل تنگ پڑا تھا جس کا کوئی حل نہیں تھا۔

☆☆☆

پھر ایک روز اس نے اکیڈمی سے نکلتے ہوئے پتھر ہاتھ میں اٹھا لیا، بودا سا ہی سہی ہتھیار تو تھا۔ تھوڑا سا اگلے کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اتنی بھی کمزور نہیں ہے، جہاں وہ اتنا روتی تھی، دوسرے کو بھی تھوڑا رو لینا چاہیے۔

وہ دو سڑکیں عبور کر کے ذیلی سڑک پہ آئی ہی تھی کہ سامنے سے ایک سائیکل سوار گنگناتا ہوا، بڑے قریب سے گزرا اور ہلکا سا اسے چھوتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پتھر کھینچ کے اس کی کمر پہ جڑ دیا اور گلی سرپٹ دوڑنے۔ نجانے اتنی ہمت کیسے کر لی اس نے لیکن بس کر لی۔

گھر کے دروازے کے سامنے جا کر رکی اور پھر سانس لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ وہ وہیں کھڑے ہو کر پھولی سانس کو بحال کرنے لگی۔ ساتھ کھل کر ہنسنے بھی لگی۔ خود کو داد دی اس جرأت پہ۔ ٹانگیں شل تھیں، سانس پھولی ہوئی تھی لیکن وہ بحفاظت گھر پہنچ چکی تھی۔ اس رات وہ اپنی ہمت پہ روئی بھی تھی اور ہنسی بھی تھی۔

پھر ایسا بہت بار ہوا تھا۔ کبھی پتھر راہ چلتے پیادوں کو مارے تو کبھی گاڑی والوں کو۔ پھر ایسی بھاگتی کہ مڑ کر نہ دیکھتی۔ مگر ایسا کب تک چلتا تھا۔ وہ دوڑ دوڑ کر تھک چکی تھی لیکن پیچھے آنے والے نہیں تھکتے تھے۔

اس روز وہ اکیڈمی کے گیٹ سے نکلی تو ابھی

سورج ڈوبا نہیں تھا پھر بھی اس نے پتھر اٹھا لیا اور چپکے سے چادر میں چھپا لیا۔ سامنے سے ایک نوعمر لڑکا کراس بیگ پہنے، پینٹ کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے اور دوسرے سے پانی کی بوتل کو منہ لگائے اس کی جانب بڑھا تھا۔ وہ فوراً چوکنا ہوئی اور پتھر بس تیار کر لیا مارنے کو۔ لیکن اس کے قریب آنے پہ وہ ٹھٹکی تھی۔ اسے وہ بخوبی پہچانتی تھی۔ وہ کلینک کے ساتھ والے گھر میں رہتا تھا جہاں اس نے اسے آتے جاتے دیکھا تھا اور اسی اکیڈمی میں پڑھتا بھی تھا۔

''سسٹر۔'' اس کے پکارنے پہ وہ چونکی اور ذرا بغور اسے دیکھا۔

اس نے اسے سسٹر بلایا تھا تو مطلب وہ جانتا تھا کہ وہ کلینک میں نرس ہے ورنہ ٹیچر بھی تو کہہ سکتا تھا۔ خیر اس کی بلا سے جو بھی کہتا۔

''میں آپ کو چھوڑ آؤں؟'' انداز میں تعظیم تھی ورنہ اب تک ہاتھ میں تھاما پتھر اس کے سر پہ بجا چکی ہوتی۔ اس کی بات پہ وہ کچھ حیران پریشان سی اسے دیکھنے لگی۔ وجہ نہ پوچھی۔ کوئی سوال بھی نہ کیا۔ لیکن جواب بھی نہ دیا اور آگے چل دی۔ وہ خود ہی پیچھے پیچھے آنے لگا۔ اس سے اجازت طلب کیے بنا ہی۔ یوں جیسے وہ اسی خاص کام کے لیے وہاں کھڑا تھا۔

''اندھیرا پھیل جاتا ہے اور سردی کی وجہ سے سڑکیں جلدی سنسان ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں اکیلے آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ احتیاط کرنی چاہیے۔''

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ احتیاط کے نام پہ اسے کیا کرنا چاہیے یہ نہیں پوچھا اس نے۔ گھر بیٹھ جائے یا باڈی گارڈ رکھ لے؟ کون سی احتیاطی تدابیر تھیں جواب تک اسے معلوم نہیں ہو سکیں اور جنھیں ■ جانتا تھا۔

''میں اسی اکیڈمی میں پڑھتا ہوں۔ دسویں میں۔'' یہ تو وہ جانتی تھی۔

''ارسلان نام ہے میرا۔ جس کلینک میں آپ کام کرتی ہیں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں میں۔'' یہ بھی اسے پتا تھا۔

''میں روز اسی وقت فارغ ہو جاتا ہوں۔'' یہ وضاحت وہ کیوں دے رہا تھا، بس یہ نہیں سمجھ سکی۔

''اچھا۔ تو پھر؟'' اس نے ابرو اچکائے۔

''میں آپ کو روز چھوڑنے جایا کروں گا۔''

''کس نے کہا آپ سے مجھے چھوڑنے کو؟''

اس نے روکھے پن کی انتہا کر دی تھی۔

''کسی نے نہیں۔'' وہ گڑبڑایا اور تھوڑا جھجکا بھی۔

''مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' اسی رکھائی سے جواب دیا۔

''مگر مجھے لگتا ہے کہ آپ کو ضرورت ہے۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ انداز مؤدب، نظر میں حیا تھی۔

''اس روز ایک سائیکل سوار آپ کے پیچھے آ رہا تھا۔ آپ تیز تیز چلنے لگی تھیں۔'' اور نزہت کا دل یک دم تیز تیز دھڑکنے لگا پھر فوراً ہی خود پہ قابو پا لیا۔ نجانے وہ کہاں سے دیکھتا رہا تھا اسے۔

''ہاں تو؟ بھاگ گیا تھا وہ پھر۔'' لہجہ دبو سا تھا مگر جتانا ضروری تھا۔ وہ ذرا سا مسکرایا مگر سر نہیں اٹھایا۔ یوں جیسے بڑے کسی بچے کی معصوم ادا، شریری حرکت پہ مسکراتے ہیں۔

''بھاگا نہیں تھا۔ میں نے گرا کر اس کا گلا دبوچا تھا، دو تین لگائیں پھر بھاگا تھا وہ۔ آپ کیا سمجھیں کہ آپ کے تیز تیز چلنے سے وہ بھاگ گیا تھا؟'' اور اس کا سر گھوم کر رہ گیا تھا۔ وہ تو سچ مچ یہی سمجھ رہی تھی اور حیران بھی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے جان چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''سسٹر! اکیلے مت جایا کریں۔ حالات بالکل بھی اچھے نہیں ہیں لڑکیوں کے لیے۔''

''تو کیا باڈی گارڈ رکھ لوں؟'' وہ چڑ گئی تھی۔ کب سے تو یہی لگا رکھا تھا اس نے کہ اکیلی مت نکلا کریں، رات ہو جاتی ہے، سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں، حالات خراب ہیں۔ مشورہ دینا دنیا کا آسان

ترین کام ہے۔ مسئلے کا حل کوئی نہیں بتاتا۔
''ابو یا بھائی کو کہیں کہ وہ لینے آیا کریں۔'' وہ ٹھٹکی، اسے رک کر دیکھا اور پھر سے چلنے لگی۔ پہلے سے بھی تیز۔ غصے سے یوں قدم رکھنے لگی جیسے ابھی بھاگنے لگ جائے گی۔ وہ اس کے تیز قدموں کا ساتھ دے رہا تھا، ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔
''نہ ابو ہیں نہ ہی بھائی۔ اور جن کے باپ بھائی نہیں ہوتے وہ ایسے ہی میری طرح خوار ہوتی ہیں۔'' اب ٹھٹکنے اور رکنے کی باری اس کی تھی۔ پھر سارا راستہ وہ دونوں خاموشی سے ساتھ ساتھ چلتے رہے تھے۔ نجانے کیوں لیکن نزہت نے اسے ساتھ چلنے سے منع نہیں کیا تھا۔ اس کی گلی کے نکڑ تک پہنچ کر وہ رکا تھا۔
''کیا ہوا؟'' وہ مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔
''آپ جائیں، میں یہاں کھڑا دیکھ رہا ہوں۔'' وہ مسکرا دی۔
''کیوں گھر تک چھوڑنے کا کہا تھا، اب راستے میں ہی چھوڑ گئے۔'' وہ ذرا کی ذرا چوٹ کر گئی۔
''بحفاظت گھر پہنچانے کی بات کی تھی۔ وہ میں نے پوری کر دی۔ جب تک اندر نہیں چلی جاتیں، کھڑا رہوں گا۔ اور جب تک کھڑا ہوں مجال ہے کوئی کچھ کہہ دے۔''
''گیٹ تک جانے سے ڈرتے ہو؟''
''اپنے لیے نہیں آپ کے لیے ڈرتا ہوں۔ آپ کی عزت کے لیے۔ یہاں لوگ رائی سے پربت کھڑے کر لیتے ہیں۔ رائی نہ ہی بوئیں تو اچھا ہے ورنہ پربت سے برسنے والے پتھر بڑی تکلیف دیا کرتے ہیں۔'' چھوٹا سا لڑکا اور ایسی مدبرانہ گفتگو۔ وہ بس اسے لمحہ بھر کو دیکھ کر رہ گئی اور پھر کچھ بھی کہے بنا خاموشی سے چلی گئی تھی۔
اور رائی تو بوئی جا چکی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو پربت کھڑا ہونا ہی تھا۔ رستے میں آتے جاتے لوگوں نے

دیکھا بھی اور کان بھی پکڑے۔ زبانیں بھی چلائیں اور آنکھیں بھی دکھائیں۔ بس اب پتھر برسانے کی کمی باقی تھی اور وہ بھی پوری ہوگئی۔

''حلیمہ ناز! بچی رات گئے کس کے ساتھ آتی ہے؟'' برابر والی خالہ نے پوچھا تو حلیمہ ناز کے تو فرشتوں کو بھی ایسی کوئی خبر نہ تھی۔ کبھی دیکھا ہوا سے آتے جاتے تو خبر رکھتیں نا۔

''کس کی بات کر رہی ہیں خالہ؟''

''اپنی نزہت کی۔'' اور خبر دینے والے اپنے گھر کے حالات سے بے شک بے خبر ہوں مگر پڑوسیوں کے حالات سے باخبر رہنا تو حقوق و فرائض میں شمار کرتے ہیں۔

''لگام دو۔ بے لگام نہ ہو جائے۔'' کہنے والے کہہ گئے اور سننے والی نے سن بھی لیا۔ لگام تو شروع سے دے رکھی تھی، اب تو بس لگام کھینچنے کا وقت آگیا تھا۔ اور اسی رات کچہری لگ گئی۔ جج بیٹھ گئے، وکیل جرح کرنے کھڑے ہوئے اور مجرم کٹہرے میں، سر جھکائے۔

''کس کے ساتھ آتی جاتی ہو جو لوگ اتنی باتیں بنا رہے ہیں؟'' اسے آنکھیں دکھائیں اور اس کی آنکھیں نکال لینے کا ارادہ دکھائی دیا۔

''ایک اسٹوڈنٹ ہے۔'' نظریں ملائے بنا اس نے جواب دیا جیسے کسی بڑی غلطی کا اعتراف ہو۔

''وجہ؟ اب اسٹوڈنٹ گھر تک آنے لگے ہیں۔ کیا ہر ٹیچر کو چھوڑنے گھر تک جاتے ہیں؟''

''وجہ میں بتا چکی ہوں۔ سنی مجھے لینے چھوڑنے نہیں آئے گا تو جو آئے گا میں اسی کے ساتھ آؤں گی۔'' اس نے سر اٹھا کر دوبدو جواب دیا تھا۔ اپنا حق کوئی اسے دینے کو تیار نہیں تھا تو وہ ایسے ہی چھین سکتی تھی۔

''اکیلے آتے موت پڑتی ہے۔ کوئی کھا جائے گا کیا؟''

''اسی دن کے انتظار میں ہیں کہ کوئی کھا جائے؟''

''ہزاروں لڑکیاں اکیلی آتی جاتی ہیں۔''

''ہزاروں پھر کسی کے ساتھ بھی آتی جاتی ہیں۔ میں ان ہی ہزاروں میں سے ایک ہوں۔''

''شرم نہیں آتی اس کے ساتھ آتے؟'' پھپھو نے اس کی چوٹی کھینچ ڈالی۔

''آپ کو شرم نہیں آتی مجھے اکیلا بھیجتے؟'' اس نے زور لگا کر اپنی چوٹی چھڑالی۔

''لوگ باتیں کر رہے ہیں۔ تجھے سنائی نہیں دیتیں۔ بہری ہوگئی ہے کیا؟''

''بہری نہیں ڈھیٹ ہوگئی ہوں۔ لوگ تو تب بھی باتیں بناتے تھے جب میں اکیلی جاتی تھی، تب آپ کو کیوں سنائی نہ دیں وہ باتیں؟ یا شاید آپ وہی سنتی ہیں جو باتیں آپ سننا چاہتی ہیں۔'' پھپھو منہ کھولے حق دق اسے دیکھتی رہ گئیں۔ ایسی جرات تو کبھی نہیں کی تھی اس نے پہلے۔

''تیرا باپ اور بھائی تیری بوٹیاں نوچ لیں گے جو انھیں پتا لگا تو......''

''نوچ لیں پھر۔ وہ بھی خوش اور میں بھی۔''

''چاہتی کیا ہے تو؟'' وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''عزت سے جینا چاہتی ہوں اگر آپ کی اجازت ہو تو۔'' اور انھوں نے یوں گھورا کہ وہ دہل گئی۔ بدلحاظ اور منہ پھٹ فطرتاً نہیں تھی۔ بس بنتی تھی کیونکہ بنادی گئی تھی۔

''باز آجا نزہت، باز آجا ایسی حرکتوں سے۔''

''باز آجاؤں گی۔ کل سے اپنے بھائی کو کہیے گا کہ مجھے لینے آجایا کرے کیونکہ میرا بھائی تو آتا نہیں ہے میری ڈیوٹی دینے۔'' وہ بھی اول نمبر کی ڈھیٹ بن گئی۔

''اب ابا اتنی دور سے اپنی نوکری چھوڑ کر تیرے پیچھے بھاگنے آئے؟''

''باپ نہ بھاگے، بھائی نہ بھاگے تو پھر جو بھاگ رہا ہے اسے بھاگنے دیں۔'' آج وہ سارے حساب کتاب بے باق کر دینا چاہتی تھی۔ اعتراض تو جڑ دیے جاتے تھے، حل بھی تو نکالے جاتے۔

"تو نوکری چھوڑ دے۔" حل نکل آیا تھا۔
"ٹھیک ہے، چھوڑ دیتی ہوں۔ لائیں پھر میرا خرچا دیں۔ بی اے کی فیس اور کتابوں کے پیسے بھی۔" اس نے ہتھیلی آگے پھیلا دی جسے پھپھو نے پکڑ کر مروڑ دیا۔
"نی مرن جوگی۔ کہاں سے دوں میں؟"
"مرن جوگی پھر کہاں جا کر مرے، یہ بتا دیں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔
"جہاں تیری ماں مری ہے۔"
اور وہیں تو وہ جا نہیں سکتی تھی۔ دونوں انگلیوں سے آنکھوں کو مسلا۔
بس اس دن کے بعد سے یہ روز کا تماشا تھا۔ باپ بھائی کی عزت کے واسطے دیے جاتے رہے، لوگوں کا خوف دلایا گیا لیکن اب وہ کیا کہتی کہ وہ اپنی عزت کی حفاظت اور لوگوں سے خوف کھا کر ہی تو ارسلان کے ساتھ آتی جاتی ہے۔
☆☆☆
اس کی امی اور ابو کی کبھی نہیں بن سکی تھی اور نہ ابا ... لی، نبھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ امی، دادی لی ... گی تھیں۔ کم عمر، خوب صورت اور نہایت سلیقہ مند۔ دادی کو ان کی ہر ہر ادا پسند تھی اور ابو کو کوئی ایک بھی نہیں۔ وہ خالصتاً دادی کی پسند تھیں تب ہی وہ اس گھر میں تھیں اور ابو کی پسند کیا تھی یہ تو سالوں بعد جا کر کھلا تھا۔
ابو نے امی کی طرف کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، کبھی کوئی ذمہ داری نہیں نبھائی اور نہ ہی امی کبھی انھیں اپنی ذمہ داری لگیں۔ وہ تو نرا بوجھ تھیں، ایک اذیت جو دادی نے زبردستی ان کی زندگی میں بھر دی تھی۔
نزہت کی پیدائش سے قبل ہی وہ دادی کے سامنے منکر ہو گئے تھے۔
"میں نے تو کبھی اسے دیکھا تک نہیں۔" اور دادی ایسی بات پہ دل تھام کر رہ گئیں۔
"جانتے بھی ہو، یہ کیا کہہ رہے ہو علی نواز؟"
اور امی نے تڑپ کر شوہر کی جانب دیکھا جو اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ گئے تھے۔ وہ بھلے سے ان کی طرف دیکھتے نہ ہوں، بھلے بیوی نہ مانتے ہوں مگر ان کی پاکدامنی پہ ایسا رکیک الزام تو نہ لگاتے۔
"علی نواز! یہ سب نہیں چلے گا۔ وہ میری بھتیجی ہے اگر تو میرا بیٹا ہے تو۔ کھا میری قسم کہ تو نے کبھی اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" اور وہ نظریں چرا گئے۔ دادی نے غصے سے گھر سے نکل جانے کا کہا تو گھر چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ وہیں نوکری ڈھونڈ لی، وہیں رہنے لگے۔
نزہت کی پیدائش کے بعد امی کو کہیں سے ابو کی دوسری شادی کی سن گن مل گئی۔ زخمی نظروں سے پہلے بیٹی کو پھر دادی کو تکتی رہیں اور آہیں بھرتی رہیں مگر شکوہ نہیں کیا۔
"نہیں کر سکتا وہ ایسا۔ لوگ بکتے ہیں۔ میرے خلاف کبھی نہیں گیا وہ۔" دادی ماننے سے انکاری اور بیٹے کی سعادت مندی پہ نازاں تھیں۔
"اب تک وہ جو کچھ کرتے رہے ہیں آپ کے حق میں تھا کیا؟" پہلی بار وہ بولیں، رخصتی کے بعد کا پہلا سوال۔ بند عورت کی سوچ کھل گئی اور زبان بھی۔ دادی صورت تکتی رہ گئیں۔ ان کی زبان بندی کو ایک سوال ہی کافی نکلا۔
پھر ابو کبھی کبھار گھر آنے لگے۔ بیوی اور بیٹی کے لیے نہیں، ماں اور بہن کے لیے۔ دادی کے ہاتھ خرچا رکھ جاتے، شکل دکھا جاتے۔ اگلی دفعہ آنے کا کہتے اور چلے جاتے۔ ہفتے دس دن کے لیے نہ سہی لیکن دو ماہ بعد دو تین دن کے لیے تو آتے ہی تھے۔ دادی کے لیے اتنا ہی بہت تھا اور امی کے لیے بہت سے بھی زیادہ۔
پھر دادی نے آہستہ آہستہ نفیسہ اور نزہت کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی، بٹھا کر نصیحتیں کرتیں، فرائض گنواتیں، اپنے بڑھاپے اور نفیسہ کی جوانی کے واسطے دیے تو تنگ آ کر آنا ہی چھوڑ دیا۔ پھر مہینوں شکل نہ دکھاتے۔ دادی بیٹے کے لیے تڑپ تڑپ

گئیں، بیٹے کی شکل کو ترس گئیں تو بہو کو کوسنے دینے پہ آ گئیں یہ رہی سہی کسر حلیمہ ناز پوری کر دیتیں۔

بھتیجی جو پہلے ہزار گنوں والی تھی، اب کھٹکنے لگی تھی۔ ڈائن لگنے لگی تھی جو ان کے اکلوتے جوان بیٹے کو سالم نگل گئی تھی۔ جس ڈائن کو وہ بڑے شوق اور ارمانوں سے سجا سنوار کر گھر لائی تھیں۔ جس کی ہاتھوں کی مہندی کو دیکھتیں، چومتیں، آنکھوں سے لگاتیں۔ جس کے بالوں میں تیل کی مالش کر کے چوٹی گوندھا کرتیں، اب وہی بھتیجی خون آشام ڈائن کا روپ دھار چکی تھی جس کے دانتوں سے بیٹے کا تازہ خون رستا دکھائی دیتا۔ خوف ناک چھل پیری۔

جب بیٹے نے اسے بیاہ نہ بٹھایا تو وہ کیوں سینے سے چمٹا کر رکھتیں اسے؟ بھتیجی سے جتنا پیار سہی، اس کے لیے بیٹا نہیں گنوا سکتی تھیں۔ اتنی کوشش تو کی بیٹے کے دل میں اس کی جگہ بنانے کے لیے، اب اس سے زیادہ بھلا کیا کرتیں؟

بیٹے کی منتیں ترلے کرنے لگیں کہ آ کر مل جائے۔ روز فون کرتیں اور اس کے آگے روتیں، معافیاں مانگتیں۔ پھر سنی کی پیدائش کے دو ہفتے بعد ابو اپنی دوسری بیوی اور سال بھر کی بیٹی کو گود میں لیے چلے آئے تھے۔ تب امی کو معلوم ہوا کہ ابو کی پسند کون تھی۔ شادی سے قبل کالج کے زمانے سے ہی تبسم کو چاہتے تھے مگر وہ دادی کی پسند نہ تھی سو اس گھر میں نہ بس سکی لیکن ابو کے دل میں تو وہی بسی تھی۔ اور جو دادی کی پسند تھی، وہ تو کہیں بھی نہ بس سکی۔ نہ دل میں نہ گھر میں۔ دادی نے فوراً دوسری بہو کو جی جان سے کر پارٹی بدل لی اور جان کو تو وہ امی کے بھی لگ گئی تھی۔ گھن کی طرح جو اندر سے کھا کھا کر خالی کر ڈالتا ہے۔

ابو بس ملنے ملانے آئے تھے سو مل کر چلے گئے۔ نزہت کی طرح سنی کو دھتکارا نہیں تھا، سینے سے بھینچا تھا، اپنا بیٹا مانا تھا۔

اب پھپھو امی کو دن رات طعنوں کی زد پہ رکھتی تھیں۔ کبھی کوسنے تو کبھی گالیاں۔ جو کام ابو نے نہ کیے وہ پھپھو کر دیتیں۔ ابو نے تو کبھی امی کو اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ کوئی طعنہ یا گالی ہی دینے کے لیے سہی، انھیں مخاطب تو کرتے۔

"ایک اکلوتا بھائی تھا میرا، پر اسے خوش نہ رکھ سکی یہ۔" چھوٹی پھپھو کنواری تھیں اور امی سے بڑی تھیں۔ وہ امی کو دبا لیتیں اور امی کو بھی دبنا آتا تھا۔

"وہ خوش رہنا ہی نہیں چاہتے تھے آپا۔" امی نے گھٹی گھٹی آواز میں وضاحت دی۔

"اب تو بہت خوش ہے اس تبسم کے ساتھ۔"

"وہ میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتے تھے۔" نمی چھپاتے ہوئے امی معتوب ٹھہریں۔ اپنا جرم جھٹ سے قبول کر لیا۔

"تجھے ڈھنگ سے سنبھال کر رکھنا نہ آیا ایک مرد۔" وہ کنواری، ایک بیاہی کو طعنہ دے گئی تھی۔

"رکھ لیتی لیکن کہاں رکھتی جہاں سے وہ ماضی کی محبتوں کو پانے کے لیے نہ بھاگتا؟"

"اوفوہ۔ اب یہ بھی میں بتاؤں اسے؟"

"جہاں اتنا کچھ بتاتی ہیں، یہ بھی بتا دیں۔"

"زبان لمبی ہو گئی ہے۔ چلنے لگی ہے بہت۔"

اس سے قبل امی نے ہوا جو نہ لگنے دی تھی کہ وہ منہ میں زبان بھی رکھتی ہیں۔ اب تو بات کوٹھوں چڑھ رہی تھی۔

دادی ایسے میں خاموش رہتیں۔ انتظام و انصرام سارا پھپھو کو دے ڈالا۔ ابو آتے اور معقول رقم پھپھو کے ہاتھ پہ دھر جاتے۔ گھڑی دو گھڑی ماں سے لگ کر بیٹھتے اور چلے جاتے۔ ان کی اپنی دنیا تھی جہاں بیوی وہ تھی جو محبوبہ تھی۔ بچے تھے جو نظر میں بھی تھے اور دل میں بھی۔

دادی چل بسیں تو ان کی وفات پہ ابو آئے تھے۔ پھر آنا بھی محدود کر دیا۔ آتے، پھپھو سے ملتے، خرچا دیتے اور چلے جاتے۔ پھپھو نے سنی کو بھائی کی نشانی کا نام دے کر دل سے لگا لیا۔ اور نزہت وہ تو یوں بھی نفیسہ کی اولاد تھی، ان جیسی منحوس، ان جیسی بے مول۔ سنی کو اپنے ساتھ لگائے ان سے بھی

چھپائے پھرتیں اور اپنے اندر کا سارا زہر اس میں قطرہ قطرہ ٹپکاتی رہتیں۔ اس کی امی لوگوں کے کپڑے سلائی کر کے اس کا اور اپنا وہ خرچا پورا کرتیں جو ابو پھپھو کے ہاتھ میں تھما جاتے اور جس کی انھیں ہوا بھی نہ لگنے دی جاتی۔

پھر امی بیمار رہنے لگیں۔ نجانے انھیں کیا بیماری تھی کہ چند دنوں میں ہی بے حد کمزور، سوکھی چمڑ رخ ہی ہو گئیں۔ اب وہ سمجھ دار تھی اور ماں کی ہمدرد بھی سو ان کا ہر طرح سے خیال رکھتی۔ سنی لاپروا بنا پھرتا اور امی کو دیکھتا تک نہ تھا۔ پہلے ابو کیا کم تھے کہ اب وہ بھی۔ خون جو ایک تھا۔ مگر خون تو نزہت کا بھی ایک تھا پھر اسے کیوں ماں پیاری تھی؟ وہ پاؤں دباتی نازک، کمھی منی سی نزہت کو دیکھ کر سوچا کرتیں۔

اس رات ٹھنڈ بہت تھی۔ سرد موسم اور رات موت جیسی بھیانک اور سرد۔ وہ امی کے سرہانے بیٹھی ان کا سر دبا رہی تھی۔ جب امی نے اس کا ہاتھ تھاما۔

''سامنے صندوق میں کپڑوں تلے کچھ پیسے ہیں اور ایک پوٹلی میں میرے جہیز کا کچھ زیور بھی ہے۔''

''آپ کو چاہیے؟'' وہ اٹھنے کو تیار ہوئی۔

''مجھے نہیں پگلی۔ تجھے چاہیے ہو گا۔ چھپا کر رکھنا۔ کسی کو بھی بھنک نہ پڑنے دینا۔ تیرے کام آئیں گے۔''

سوکھی لکڑیاں جیسے جلنے لگیں۔ وجود میں عجیب سی ٹھنڈ اترنے لگی تھی۔ پھر منتظر نگاہیں سرد پڑ گئیں۔

وہ رات بھر کسی خوف سے سو نہ سکی اور امی اس کی برابر کی چارپائی پہ ہمیشہ کے لیے سو گئیں۔ پھر کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔

ابو آئے تھے امی کی وفات پہ، بالکل ویسے جیسے خاندان کے دوسرے مرد آئے تھے۔ اس دن امی کو دیکھا بھی تھا اور اسے یوں لگا وہ آخری نظر سے کہیں زیادہ ابو کی امی پہ پہلی نظر تھی۔ سنی کے سر پہ ہاتھ رکھا کیونکہ وہ چھوٹا تھا اور بیٹا بھی۔ وہ نہ چھوٹی تھی، نہ ہی بیٹا پھر اسے کیوں پیار کرتے۔ اس لیے ابو نے نہ اسے چھوٹوں کی طرح چمکارا نہ بڑوں کی طرح پاس بٹھا کر کچھ سمجھایا۔ سنی کو تو سب نے اپنا کہہ کر سینے سے لگا لیا تھا لیکن اسے تو ایک گالی بنا ڈالا تھا۔ تین دن ٹھہر کر ابو چلے گئے تھے۔

گھر میں تین افراد رہ گئے۔ پھپھو، سنی اور وہ۔

پھپھو کے لیے سنی اور سنی کے لیے پھپھو بہت تھے۔ اور اس کے لیے کوئی بھی نہیں تھا۔ پھپھو نے سنی کو خوب سنبھالا تھا۔ اور اسے اس نے سنبھالا جس کے سپرد اسے اس کی ماں کر کے گئی تھی۔ قدرت۔

■ روبوٹ کی طرح گھر میں رہتی جس کا ریموٹ حلیمہ ناز کے پاس تھا۔ جس کے صلے میں پھپھو نے اسے تن ڈھانکنے کو کپڑے، سر چھپانے کے لیے چھت اور کھانے کے لیے روٹی کا ذمہ لیا تھا۔ اس کے برعکس سنی بہت اچھی زندگی گزار رہا تھا۔ پہلے اسے اپنا قصور سمجھ میں نہیں آتا تھا پھر آہستہ آہستہ سب سمجھ میں آنے لگا۔

''وہ لڑکا ہے، بیٹا ہے، بڑھاپے کا سہارا بنے گا میرے۔ ساتھ رکھے گا مجھے۔ تو بھلا میرے کس کام کی؟''

اور وہ حیرت سے حضرتِ انسان کی تجارت کو دیکھتی جو کیسے کیسے سودے طے کرتا ہے۔ آج وہ سنی کا سہارا تھیں کل وہ ان کا سہارا بنے گا۔

''میرے بھائی کی نسل چلنی ہے سنی سے۔ اس گھر کا، زمین کا وارث ہے وہ۔'' اور وہ سوچتی ضرور تھی کہ وراثت میں حصہ تو لڑکیوں کا بھی ہوتا ہے۔ اس کے حصے کا ذکر پھر کیوں نہیں کیا جاتا۔

''مرد سرپرست ہوتا ہے، میرا بھائی میرا سرپرست، اس کا بیٹا میرا سرپرست۔'' اور وہ سوچتی کہ میرا باپ، میرا بھائی پھر میرے کیا ہیں؟

وہ اپنی ماں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ اس نے امی کو اس گھر میں ہمیشہ خاموش دیکھا تھا۔ گونگے کا گڑ کھا کر کام کرنے والی عورت۔ جیسے خاموشی گھٹی میں دی گئی تھی اور زبان تالو سے لگانے کا عہد لیا گیا تھا۔ پھر بھی پھپھو کہتی تھیں۔

"تیری ماں ایک زبان دراز عورت تھی۔" تو وہ سوچا کرتی لوگ کہتے ہیں خاموشی کی زبان ہوتی ہے، شاید پھپھو اسی زبان کی بات کرتی ہوں گی۔ جب پھپھو اسے خبردار کرتیں کہ ماں کی طرح زبان مت کھولنا تو وہ آئینے میں منہ کھول کھول کر زبان باہر نکال کر دیکھتی کہ وہ منہ میں موجود بھی ہے یا نہیں۔

زبان تو موجود تھی مگر کابلوں اور ڈھبریوں سے کسی ہوئی تھی۔ سو وہ وہی کرتی تھی جو پھپھو چاہتی تھیں اور وہی کرتی رہتی گر جو انھوں نے اسے کالج میں داخلے کی فیس دینے سے انکار نہ کیا ہوتا۔

"تیرا باپ فیکٹری کا مالک نہیں ہے، نہ وہ اتنی رقم دے کر جاتا ہے کہ اب تیری مزید پڑھائی پہ لگائی جائے۔ دو دو گھر چلانے ہوتے ہیں اس نے۔ کہاں سے اتنا پیسہ لائے؟ جتنا پڑھ لیا بہت ہے۔ کیا کرے گی مزید پڑھ کر؟ تیری ماں نے کیا کر لیا پڑھ کر؟ گھر کے کام کاج سیکھ، ہاتھ بٹا میرا اور وقت سے اپنے گھر جا۔"

وہ کس اپنے گھر کی بات کرتی تھیں۔ مزید کوئی گھر بھی تھا جو اس کا ہونا تھا؟ پھپھو کو اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن امی کی دی ہوئی رقم نکالی اور پرائیویٹ داخلہ بھجوا دیا۔ پھپھو تلملائیں۔

"نکلی نا ماں جیسی آخر۔ سچ کہتے ہیں کہ سانپ کو دودھ پلا کر بھلے پالو، ڈسنے سے باز نہیں آتا وہ۔"

"سانپ تو آپ نے سینے سے لگایا ہوا ہے، جس دن وہ ڈسے گا نا، پانی بھی نہیں مانگ سکیں گی آپ۔" پہلی بار اس نے جواب دیا تھا۔ پھپھو حیرت سے اسے دیکھتی رہیں اور پھر خوب سنائیں۔ اس نے کان بند کر لیے ورنہ دل بند ہو جاتا۔

پڑھائی کے ساتھ اس نے پرائیوٹ کلینک میں نوکری شروع کر دی جو چھ سات کمروں پہ مشتمل تھا۔ صبح آٹھ سے تین بجے تک وہ وہاں کام کرتی اور شام میں پڑھائی اور گھر کے کام۔ پھپھو نے ابو سے شکایت لگا دی اور انھوں نے یوں سنا جیسے کوئی نویدہ خالہ کی تیسرے نمبر والی بیٹی کی بات کر رہا ہو اور جواب بھی اسی انداز سے دیا۔

"جو اسے ٹھیک لگے کرنے دو، سمجھ دار ہے، اپنا اچھا برا سمجھتی ہے۔" وہ کمرے میں بیٹھی زخمی سا مسکرا دی کہ جب کوئی اچھا برا سمجھانے والا نہ ہو تو خود ہی سمجھنا پڑتا ہے۔

بی اے میں داخلے کے لیے اسے پہلے سے زیادہ رقم درکار تھی اور امی کی دی گئی رقم ختم ہو چکی تھی۔ پھپھو نے تو ہاتھ بالکل کھینچ لیا تھا سو وہ ڈبل ڈیوٹی کی غرض سے شام میں اکیڈمی جانے لگی تھی۔ گھر میں بیٹھ کر باتیں سننے سے بہتر گھر سے باہر رہ کر وقت گزارنا لگتا تھا، پیسے الگ ہاتھ آ جاتے۔ پھپھو بھی بول بول کر چپ ہو گئی تھیں۔ جب باپ لاپروا ہے تو وہ کیوں پرائی اولاد کی پروا کرتیں۔ الٹا اس بات کو بنیاد بنا کر انھوں نے اس کا ماہانہ جیب خرچ بھی روک کر اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ سنی تو یوں بھی اس سے ایسے اجنبیت برتتا تھا جیسے وہ امی کے نہیں حلیمہ ناز کے بطن سے جنم لے کر دنیا میں آیا ہو۔ ضرورت پڑتی تو مخاطب کر لیتا، وہ بھی برائے نام۔ وہ نہ ماں کا ہو سکا تھا نہ بہن کا۔ ابو پہ بھی نہیں گیا تھا کہ وہ کم از کم اپنی ماں اور بہن کے تو تھے۔

☆☆☆

"آپ اکیڈمی اور کلینک کے علاوہ کہیں نہیں جاتیں؟"

"جاتی ہوں۔ بازار، بورڈ آفس۔"

"بس؟"

"اور کہاں جانا ہوتا ہے؟" سادہ سا جواب جیسی وہ خود سادہ تھی۔ ویسی سادہ اس کی زندگی تھی۔

"مطلب آپ کی زندگی ان ہی پانچ جگہوں کے گرد گھومتی ہے؟"

"پانچویں جگہ کون سی؟" اس نے ابرو اچکا کر ارسلان کو دیکھا۔

"گھر۔ وہاں بھی تو جاتی ہیں نا۔"

وہ ہنس دی۔ گھر جانے کا تو وہ بھول ہی گئی تھی کیونکہ سب سے بری جگہ اسے جانے کی وہی لگتی تھی۔

"اکیلے کہیں مت جایا کریں۔" وہ پینٹ کی

جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا ہوا راستے سے پتھروں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتا تھا اور ساتھ ساتھ سر گھما کر ادھر ادھر بھی دیکھتا جاتا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

''باڈی گارڈ رکھ لوں؟'' اس نے یونہی مذاق سے پوچھا۔

''نہیں، مجھے رکھ لیں ہر جگہ جانے کے لیے۔ جہاں جانا ہوا کرے مجھے بلا لیا کریں۔ صرف ایک میسج کریں گی اور گلی کے نکڑ پہ مجھے پائیں گی۔''

نزہت نے اسے گھور کر دیکھا مگر وہ نظر انداز کر گیا۔

''میں بالکل فارغ ہوتا ہوں۔ کوئی کام کاج نہیں ہوتا اور اگر ہو بھی تو چھوڑ آؤں گا۔''

''اور اس مہربانی کی وجہ؟'' وہ کچھ تپ گئی تھی۔

''وجہ کوئی نہیں ہے۔ بس اکیلے نہیں جانا۔'' اس نے دھونس بھرے انداز سے کہا جو نجانے کیوں نزہت کو اچھا لگا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ ہمیشہ اس کے ساتھ جاتا تھا جہاں بھی جانا ہوتا تھا۔

''گھر کے باہر آ جایا کرو۔ یوں بھی جتنے پتھر مجھے پڑنا تھے، پڑ چکے ہیں۔'' پھر وہ باہر آ جاتا اور وہ بھی دھڑلے سے بنا کسی کی پروا کیے اس کے ساتھ چلی جاتی۔ پھپھو بھی گیٹ کھولتیں، ایک گھوری اس کو اور ایک ارسلان کو نوازتیں۔ وہ ڈھیٹ بنا مزے سے پلٹ جاتا۔

''کس رشتے سے آتا جاتا ہے ہر جگہ تیرے ساتھ؟''

''جس رشتے سے آپ کا بھتیجا آتا جاتا نہیں ہے۔'' وہ ٹھنڈے ٹھار لہجے میں جواب دے کر حلیمہ ناز کو بھی ٹھنڈا کر دیا کرتی۔

''رشتے وہی ہوتے ہیں جو رب بناتا ہے۔''

''جب رب کے بنائے رشتے مٹا دیے جائیں تو پھر خود بنانا پڑتے ہیں۔'' حلیمہ ناز کو بالآخر سمجھ میں آ ہی گیا کہ وہ رعب میں آنے والی نہیں ہے سو وہ خود ہی خاموش ہو گئیں۔

☆☆☆

''گھر جانے میں دیر ہوتی ہے تو گھر والے کان نہیں کھینچتے؟'' وہ جلدی فارغ ہو کر باہر ٹہلتا اس کا منتظر ہوتا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نکل آئی۔

''جانتے ہیں، میں پورے جہاں میں پھر پھرا کر گھر آتا ہوں۔ آپ کو گھر چھوڑ کر دوستوں کے ساتھ نکل جاتا ہوں یا پھر گراؤنڈ چلا جاتا ہوں میچ کھیلنے یا دیکھنے۔ رات نو بجے سے پہلے کبھی گھر میں قدم نہیں رکھتا میں۔'' بڑے فخر سے سینہ چوڑا کیے وہ بتا رہا تھا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سن رہی تھی۔

''وہ نہیں پوچھتے کچھ بھی۔ مجھے جانتے جو ہیں۔'' اس کے انداز میں خود کے لیے تمسخر تھا۔ لیکن لہجے سے عجیب سا کرب اور آنکھوں سے دکھ چھلکتا تھا۔ پھر بتاتے ہوئے اس نے رخ پھیر لیا جیسے اپنے آنسو چھپانا چاہتا ہو۔

''گھر پہ کون کون ہوتا ہے؟'' پہلی بار وہ اس کے گھر کے متعلق پوچھ رہی تھی۔

''امی، دادا، دادی اور چھوٹا بھائی۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر سارے رشتے گنوائے۔

''ابو نہیں ہیں؟'' سر کو ہلکا سا خم دے کر اس نے اسے دیکھا۔

''نہیں۔'' سر نفی میں ہلایا اور پھر مسکرا دیا۔

''واقعی میں نہیں ہیں۔'' اس نے یقین دلانے کے لیے زور دیا۔

''اس طرف ہو جائیں۔'' اسے ایک طرف ہونے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ خود گھوم کر دوسری طرف ہو گیا تھا کیونکہ سامنے سے لڑکوں کا ایک گروپ آ رہا تھا۔ اس کا خود کے لیے ایسا محتاط انداز اسے اچھا لگا تھا۔ تحفظ کا مضبوط احساس، جو زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوا، اس کے جلو میں کرتی تھی۔ مرد کسی بھی عمر کا ہو، سولہ سال کا یا ساٹھ سال کا، اس کی معیت میں عورت خود کو محفوظ ترین محسوس کرتی ہے خاص کر وہ مرد جو چلتا ہی اس کی پاسبانی کے لیے ہو۔

''آج واپسی پہ کلینک جانا ہے، ہلکا سر درد ہو رہا ہے تو وہیں سے دوائیں لے لوں گی۔'' انگلیوں سے کنپٹیاں دباتے اس نے کہا۔

''میں باہر کھڑا رہوں گا۔''

''مجھے وقت بھی لگ سکتا ہے۔ کچھ کام ہے۔''

''میں اندر بیٹھ کر انتظار کرلوں گا۔'' اگر تو وہ اسے ٹالنا چاہتی بھی تو وہ ہرگز ٹلنے والا نہیں تھا۔

''گھر چلے جانا۔''

''گھر والے سکتے میں آجائیں گے کہ اتنی جلدی کیسے آگیا۔ کچھ ہوگیا کسی کو تو الزام میرے سر آئے گا اور مزید الزام اپنے سر لینے کی ہمت نہیں ہے۔''

''مزید؟'' اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تو وہ موبائل نکال کر اس پہ لگ گیا۔ وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو وہ بھی کریدنے والی نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی تھا، کھل کھل کر بند ہو جانے والا۔ دکھا دکھا کر چھپ جانے والا۔ ملتے ملتے کھو جانے والا۔

کلینک میں اسے دس منٹ لگے تھے۔ وہ وہیں ڈاکٹر کے کمرے کے باہر کسی لڑکے سے گپیں لگاتا رہا تھا۔ دس منٹ بعد دونوں ایک ساتھ نکلے تھے۔ وہ اس کا محلہ تھا اور اسے وہاں کتنے لوگوں نے دیکھا ہوگا۔

''کسی نے پوچھا کہ ساتھ کون تھی تو کیا کہو گے؟'' پہلے وہ چونکا، بھنویں سکڑیں اور ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ پھر جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

''آپ کیا کہتی ہیں۔ کوئی پوچھے تو کیا بتاتی ہیں۔؟'' الٹا اس سے سوال کر بیٹھا۔

''کہتی ہوں کہ اسٹوڈنٹ ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ وہ زیرلب مسکرا دیا۔

''اور میں کہہ دیتا ہوں کہ سسٹر ہے میری۔'' وہ بری طرح ٹھٹکی اور اس کی طرف بغور دیکھا۔ سادہ اور مخلص لہجہ۔ کیا وہ واقعی اسے اتنا معتبر سمجھتا تھا؟

وہ اس کا انداز بھانپ گیا اور سنجیدگی سے گویا ہوا۔

''پہلی بار جب آپ کو سسٹر کہا تھا تب بھی آپ چونکی تھیں اور اب بھی۔'' وہ سنسان سڑک تھی جس پہ آتے جاتے منچلے اوباش غلط کام تو کرتے تھے مگر پہلی بار وہاں ایسے پاکیزہ جذبوں کا اظہار ہو رہا تھا۔ دو اجنبیوں اور شناسا کے درمیان۔ نہ دکھنے اور دکھ کر بندھ جانے والے پاکیزہ رشتے کا اظہار۔ دو افراد جو دور دور تھے اور قریب بھی۔

''میں دوسروں کو ان کے پیشے سے نہیں رشتے سے مخاطب کرتا ہوں۔ سسٹر سے مراد بہن ہے، نرس نہیں۔''

اس کی آنکھ کا پانی ٹھہرا نہیں تھا۔ اس نے چہرہ جھکا کر چھپا لیا۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی اس کے آنسوؤں کو۔

''بہن سمجھ کر چھوڑنے جاتا ہوں۔ اسٹوڈنٹ ہی ہوتا تو کبھی پوچھتا بھی نہیں۔''

''میرا اپنا بھائی بھی ہے اور باپ بھی جو مجھے چھوڑنے لینے کے پابند نہیں ہیں۔'' بولی تو آواز میں آنسو کی آمیزش تھی جسے اس نے چھپایا نہیں تھا۔

''جانتا ہوں۔'' ٹھہرا ہوا مضبوط لہجہ، ذرا بھی متزلزل نہیں تھا۔ اس نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اب کیا چھپانا اور کیا دکھانا۔

''کیسے؟'' آنسو اب ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے۔

''سوال یہ نہیں ہے کہ کیسے۔ سوال یہ ہے کہ کیوں؟ آپ نے کیوں کہا کہ آپ کے بھائی اور باپ نہیں ہیں؟''

''کیونکہ وہ نہیں ہیں میرے لیے۔ وہ سچ میں نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو راتوں کو، سڑکوں پہ، آسمان تلے یوں بے عزت ہوتی میں کیا؟ میری پھپھو کہتی ہیں ان کا بھائی۔ اس کا بیٹا ان کا سہارا ہیں۔ سرپرست ہیں اور میرا کون سرپرست ہے۔؟ گھر کا مرد چاہے بھائی ہو، بیٹا ہو، شوہر ہو یا باپ قوام ہوتا ہے نا۔ گلہ بان جسے اپنے ریوڑ کی رکھوالی کرنا ہوتی ہے۔ ریوڑ کا ہر مویشی اس کے لیے برابر ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ وہ تفرقہ نہیں کرسکتا، تقسیم جائز نہیں، تخصیص حرام ہے۔ پھر کیوں؟'' پول کی جلتی روشنی میں وہ اس کے آنسو دیکھ رہا تھا اور اردگرد سے اکا دکا گزرتے لوگ گردن موڑ کر ان دونوں کو۔

موتیوں کی مالا تھی جو شاید ٹوٹ کر بکھر گئی تھی اور موتی ٹپاٹپ گرتے گم ہو رہے تھے۔ موتیوں سے بھی بیش قیمت اور انمول جذبوں کے عکاس شفاف آنسو۔ کاش کوئی آنکھ ٹپکتے، گرتے آنسوؤں کی قیمت جان سکے تو اسے قدر آجائے اور وہ کبھی نہ گرنے دے۔ رونے والا ضبط کرلے اور رلانے والا قبض کرلے۔

”تم کیا کبھی اپنی بہن کے ساتھ یوں کر سکتے ہو؟“ اس نے چہرہ صاف کیا۔
”میں کر چکا ہوں۔“ وہ بولا تو سامنے والی بول نہیں سکی۔
”میں یہ سب کر چکا ہوں اپنی بہن کے ساتھ۔ تب ہی تو دوسروں کی بہنوں کو عزت دیتا پھر رہا ہوں۔“
”تم یہ نہیں کر سکتے ارسلان۔“ وہ بے یقین تھی۔
”میں نے کیا ہے۔ وہ مجھ سے چھ سال بڑی تھی۔ شاید آپ جتنی ہوگی، بے حد خوبصورت اور معصوم۔ ابو شروع سے ڈپریشن کے مریض تھے۔ جو بھی کام کرتے تھے ڈھنگ سے نہیں ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کرتے پھر چھوڑ دیتے۔ میں آٹھویں جماعت میں تھا جب ابو کو شدید اٹیک ہوا۔ پھر باجی نے ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں۔ ابو جاب چھوڑ چکے تھے اور ان کی ذمہ داریاں وہ اٹھا رہی تھیں۔ امی مجھے روزانہ شام میں کہتیں کہ بہن کو چھوڑنے، لینے کی ذمہ داری تو اٹھاؤ مگر میں ڈھیٹ بنا رہتا، دوستوں یاروں کا پابند، کھیل کود میں مگن۔ باجی بھلا کوئی چھوٹی تھیں کہ انہیں لینے چھوڑنے جاتا۔ وہ ہوم ٹیوٹر کے طور پہ کہاں جاتی تھیں مجھے قطعاً پروا نہیں تھی۔ امی کہتی رہتیں اور میں کان نہ دھرتا۔ پھر ایک شام باجی گھر نہیں پہنچیں۔ میں انہیں ڈھونڈنے نکلا اور جہاں جہاں ممکن تھا ڈھونڈتا رہا لیکن وہ نہیں ملیں۔“
”پھر؟ ملی؟“ وہ بے قراری سے پوچھنے لگی۔
”ہاں ملیں۔“ اس کی آواز، صدا الصحرا کی مانند بکھر گئی تھی۔
”بڑے نالے کے قریب سے مردہ حالت میں۔“ نزہت نے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھتے اپنی چیخ کو روکا تھا۔ بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
”ریپ کیس تھا۔ مگر کس کے خلاف تھا یہ تو تب معلوم ہوتا جب میں جانتا ہوتا کہ وہ کس علاقے میں، کن گھروں میں پڑھاتی ہیں۔“ وہ رو رہا تھا۔
”ابو تو پہلے سے ڈپریشن کے مریض تھے۔ انھوں نے اسی صدمے کے تحت ایک رات زیادہ گولیاں کھا لیں اور بس۔“ اس نے 'اور بس' اس طرح کہا کہ کہانی ختم۔ بچوں کو سنائی جانے والی کہانی کے برعکس ایسی کہانی جس کا اختتام کسی خوشی نہیں ہوتا۔
”امی کچھ نہیں کہتیں۔ کوئی کچھ نہیں کہتا مجھے۔ بس میں خود ہی گھر جانا نہیں چاہتا۔ گھر کی ہر چیز مجھ سے باجی اور ابو کے بارے
میں سوال کرتی ہے تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔“ وہ خاموش ہو گیا لیکن وہ روئے چلے جا رہی تھی۔ جیسے وہ اس کی زندگی کی کہانی اسے سنا رہا ہو۔ شاید ارسلان نہ ہوتا تو وہ بھی کسی ایسے ہی نالے کے قریب سے ملتی۔ زندہ یا مردہ۔
”جب مرد درندہ بن جائے تو وہ عورت کی عمر، حسن نہیں دیکھتا اور میں اسی بحث میں لگا رہا کہ باجی تو اتنی بڑی ہیں۔“ وہ تلخی سے مسکرایا۔
”شاید آج وہ زندہ ہوتیں اگر میں ان کے ساتھ گیا ہوتا۔“ افسوس، لعنت، ملامت۔ سب کچھ اس کے لہجے سے عیاں تھا۔
”اور اب میں سوچتا ہوں کہ روزِ قیامت وہ میرا گریبان پکڑیں گی۔ وہ نہیں پکڑیں گی تو اللہ پکڑے گا کہ جب میں گلہ بان تھا تو بن کر کیوں نہیں دکھایا؟ تب میں کیا کہوں گا اور کیسے کہوں گا؟“
وہ آنسو صاف کرتی اور پھر سے رو دیتی۔
”شاید کبھی اس نے بھی آپ کی طرح کہا ہوگا کہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔“ پہلی بار اس کی آواز کپکپائی تھی۔
”مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ارسلان۔“
”دو سال ہو گئے ہیں، مجھے بھی یقین نہیں آتا۔ لیکن گھر جاؤں تو سب یقین آ جاتا ہے۔“ اس نے آنکھوں کی نمی چھپائی۔
”آپ نے مجھے فرشتہ سمجھ لیا تھا اور شاید اپنا بنایا فرشتہ جب عام انسان بھی نہیں نکلتا تو ایسی ہی بے یقینی ہوتی ہے۔“ وہ آگے چل دیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے سست روی سے چلنے لگی۔
”تو مجھے چھوڑنے لینے کا کام اپنے پچھتاوے میں کمی کے لیے کرتے ہو؟“

”نیا الزام تو مت لگائیں۔ یہ تو پرانے الزام سے بھی زیادہ سخت ہے۔“ وہ اپنی جگہ کچھ شرمساری ہوگئی۔
رستہ کٹنے لگا۔ خاموشی اور ڈھیروں سوچوں کے ساتھ۔

☆☆☆

”بھائی جان نے تمہارے لیے ایک رشتہ ڈھونڈا ہے۔“ اس روز وہ کھانا کھا رہی تھی جب حلیمہ ناز نے نرمی سے اسے بتایا تھا۔
”اپنے جیسا۔“ سرد لہجے میں اس نے ہاتھ روک کر کہا۔
”لڑکا بہت اچھا ہے۔ ان کی کمپنی کی ایک برانچ میں ہے۔ وہ اب تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ ان کا دھیما لہجہ اس کے لیے نیا تجربہ تھا۔ جتنا حیران ہوتی کم تھا۔
”وہ میرے لیے بھی کچھ چاہ سکتے ہیں۔“ اس نے محض سوچا تھا۔
”فی الحال میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔“ حلیمہ ناز اسے رشتے کی تفصیلات سنا رہی تھیں جب اس نے نرمی سے انکار کردیا۔
”تو کیا یوں ہی شتر بے مہار پھرتے رہنے کا ارادہ ہے؟“ وہ اپنی پرانی ٹون میں واپس آگئی تھیں۔
نزہت خاموش رہی اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔
”عورت کی عزت گھر بسانے میں ہے۔“ پہلی بار وہ اس طرح اسے بٹھا کر سمجھا رہی تھیں۔ ان کی بات پہ اس کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ آگئی تھی۔ انہوں نے پہلو بدلا۔ سمجھ نہیں سکیں کہ یہ مسکراہٹ ان کے لیے تھی یا نفیسہ کے لیے۔
”شوہر کا تحفظ ملے گا، گھر بار اپنا ہوگا۔“ میٹھا، شیریں لہجہ۔
”ویسا جیسا امی کو ملا؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کہہ گئی۔
”اسے گھر نہیں بسانا آیا۔ تھی ہی ایسی۔“ وہ پوچھ بھی نہ سکی کہ ”ایسی کیسی۔“
”میں بھی ان ہی کی بیٹی ہوں۔ میں پھر کیسے بسا سکوں گی؟“ چائے یکدم بدمزہ ہوگئی۔

”تیری تربیت میں نے کی ہے۔“ بڑا مان تھا ان کے لہجے میں۔ نزہت زور زور سے ہنسنے لگی۔ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ حلیمہ ناز اسے یوں ہنستے پہلی بار دیکھ رہی تھیں۔
”کتنی خوش فہم ہیں نا آپ پھپھو۔“ جملہ مکمل کرتے ہی اسے پھر ہنسی آگئی۔ حلیمہ ناز کے نقوش تن گئے، بڑی سبکی محسوس ہوئی۔
”مجھے تمہارا یہ انداز سخت برا لگ رہا ہے لڑکی۔“
”اور مجھے آپ کا یہ مذاق۔“ وہ یک دم سنجیدہ ہوگئی۔
”جو بھی ہے۔ ایک دو دن میں تمہارا باپ آرہا ہے۔ تم ذہنی طور پہ تیار رہو۔“ انھوں نے اس کی ایک بھی سنے بنا اٹھ جانا بہتر سمجھا۔

☆☆☆

”اگر رشتہ مناسب ہے تو آپ کو شادی کرلینا چاہیے۔“ ارسلان نے ساری بات سن کر مشورہ دیا۔
”تم بھی یہی کہہ رہے ہو؟“ وہ مرجھا سی گئی۔
”میں اس معاملے میں اپنے باپ پہ اعتبار کیسے کرلوں؟“
”جیسے آپ نے اس اجنبی پہ اعتبار کیا تھا بالکل ویسے ہی۔“ اس کے جملے نے اسے کچھ کہنے کے قابل نہ چھوڑا۔ اس کا اشارہ اپنی جانب تھا۔
”باپ ہیں وہ آپ کے۔ برا نہیں سوچ سکتے، بھلے اب تک جتنا بھی برا کیا ہو۔“
”تم پہ تو خود بخود اعتبار آگیا تھا ارسلان۔“
”اعتبار ہمیشہ کیا جاتا ہے۔ آپ کی پھپھو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اس شادی سے آپ کو تحفظ ملے گا۔ شادی تو کرنا ہی ہے نا۔ پھر یوں روز روز کی خواری سے بہتر ہے کہ آپ گھر بیٹھیں اور آپ کا سرپرست آپ کا خرچا اٹھائے۔“
اس نے گہری سانس لی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ اب تھک گئی تھی۔ ہم سب بھی نہ بھی اس بھاگ دوڑ سے تھک جاتے ہیں پھر دل چاہتا ہے کہ کوئی ہمارے لیے موجود ہو۔ اسی لیے وہ بھی مان گئی تھی۔

☆☆☆

اسجد ہر لحاظ سے اچھا شوہر ثابت ہوا تھا اور اس کے

تمام خدشات جو ابو کو لے کر تھے، وہ دور ہو گئے تھے۔ محبت، توجہ، عزت، احساس سب مل رہا تھا تو اور کیا چاہیے تھا۔ اچھا لگ رہا تھا گھر بیٹھ کر سکون سے شوہر کی آمدنی پہ راج کرنا۔ ایک ملکہ کا سا احساس جو تخت پہ بٹھا دی گئی تھی۔

فیملی کے نام پہ اسجد کا بس ایک بھائی تھا جو لاہور ہوسٹل میں پڑھائی کی غرض سے رہتا تھا۔ اس کی پڑھائی کا خرچا بھی اسجد اٹھاتا تھا۔

''نزہت۔'' اس روز وہ بہت محبت سے بولا تھا۔

''جی۔'' اتنا ہی محبت بھرا جواب۔

''تم جانتی ہو نا کہ میری آمدنی کم ہے اور اس جاب کی ٹائمنگز ایسی ہیں کہ میں مزید جاب نہیں کر سکتا۔''

شادی کے دو ماہ بعد اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ یہ اچانک آمدنی کا ذکر کہاں سے آ گیا تھا۔ پہلے تو کبھی اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

''جتنی بھی ہے، ہمارے لیے بہت ہے۔'' اس نے مسکرا کر صابرو شاکر بیوی ہونے کا ثبوت دیا۔

''مگر آگے چل کر جب فیملی بڑھے گی تو بہت نہیں ہو گی۔ گزارہ مشکل ہو جائے گا۔ مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس کا رنگ اڑا تھا اور کسی خدشے کے تحت اس نے یک دم آنکھیں میچ لی تھیں۔

''اب یہ مجھ سے کہے گا کہ میں بھی نوکری کروں اور اس کا ہاتھ بٹاؤں۔ مجھے بتائے گا کہ اس نے میرے لیے ایک قریبی اسکول میں نوکری کی بات بھی کر لی ہے۔ اس لیے میں اگلے ہفتے سے جانا شروع کر دوں۔ میں نہیں مانوں گی تو بھی یہ مجھے منا لے گا۔ میں کہوں گی کہ مجھے چھوڑ آنا تو کہے گا کہ یہ دس منٹ کا پیدل فاصلہ تو ہے، خود چلی جانا۔ اتنا سا سفر بھی کوئی سفر ہے جو تم نہیں کر سکتیں۔ اور بس۔ پھر روز کا پیدل دس منٹ کا فاصلہ بیس منٹ کا لگنے لگے گا۔ میں اسجد کو بتاؤں گی تو وہ ہنسنے لگے گا کہ بدھو دس منٹ کا فاصلہ ہی ہے، تم چلتی آہستہ ہو گی۔ میری گھڑی ہی غلط ہو گی جو بیس منٹ بتائے گی، سچے تو میاں ہوں گے۔ روز پھر سے میں چادر میں پتھر چھپاؤں گی کہ جو کوئی بھی چھیڑے میں اسے اٹھا کر مار دوں۔ کیونکہ یہاں کوئی ارسلان نہیں ہو گا میرے لیے۔ میں چونکوں گی، بھیڑ میں اسے تلاش کروں گی کہ میرا محافظ کہاں ہے مگر وہ کہیں نہیں ہو گا۔ خود ساختہ رشتہ تو یوں بھی سوالیہ ہوتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عورت کے گلے میں محرم نام کا جو منکا ڈالا گیا ہے کہ حج تک محرم کے بنا ممنوع ہے تو اسی محرم نے عورت کو اکیلے باہر دھکیل کر اسے مجرم کیوں بنا ڈالا ہے۔ لیکن میں نور والے سے پوچھوں گی ضرور کہ علی نواز، سعد نواز، اسجد رحمان۔ سب میرے قوام تھے تو وہ قوام بن کر کیوں نہ دیے۔ جس عورت کا محرم اس کا قوام نہیں بنتا اس کے لیے پھر کیا حکم ہے؟''

''کہاں کھو گئیں؟'' اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے بیٹھے اسجد کو ہراساں نظروں سے دیکھا جو یہ سب اب اس سے کہنے والا تھا۔

''آپ کچھ کہہ رہے تھے؟'' تھوک نگلتے اس نے پوچھا۔

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس گھر کا خرچا الگ ہے اور وہاں امجد الگ سے ہوسٹل میں رہ رہا ہے تو اس کا خرچا الگ۔ کیوں نا میں اپنی پوسٹنگ لاہور کروا لوں؟ یوں وہ گھر میں ہی رہے گا اور ہوسٹل کا، باہر کے کھانے پینے کا اس کا خرچا بچ جائے گا تو کافی بچت ہو جائے گی۔ کیا کہتی ہو تم؟''

وہ حیران سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اب کیا بچا تھا اس کے پاس کہنے کو۔ بس بے یقینی سے میاں کو دیکھ رہی تھی۔

اس کی زندگی کے قوام نے اسے باہر کی خواری سے بچا لیا تھا۔ اب دس منٹ کبھی بیس منٹ نہیں بننا تھے۔ نہ اسے پتھر اٹھانے تھے نہ ہی ارسلان کو تلاش کرنا تھا۔ اس کی زندگی کا مشکل سفر آسان ہو گیا تھا۔ اس قوام کی وجہ سے جو اس کا شوہر تھا۔



نعیمہ ناز



عالیہ بیگم اپنی بیٹی حمنہ کے رشتے کے لیے خاندانی لوگوں کی تلاش میں تھیں۔ جب کہ ان کی ساس کا کہنا تھا کہ رشتہ کے لیے دین داری اور شرافت کو ترجیح دینی چاہیے۔

عائشہ اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ رشتوں کے نام پر اس کی ایک خالہ تھیں جن کے دو بچے فہد اور علیزے تھے۔ فہد اپنے باپ کے پاس امریکہ میں پڑھنے گیا تھا۔ اس کی والدہ سلائی کر کے اپنے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ عائشہ کی سہیلیاں اس کی بے پناہ خوب صورتی کو سراہتی تھیں۔

سید صاحب کو مسجد کمیٹی کا صدر منتخب کیا جا رہا تھا۔ ان کی بیٹی نائلہ ایک خودسر لڑکی تھی، اس کی اپنے شوہر سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ وہ آئے دن اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر باپ کے گھر آ بیٹھتی۔ اس میں ماں کے مزاج کی جھلک تھی۔ اسے اپنی خوب صورتی پر بہت ناز تھا۔ سید صاحب اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ نائلہ کے شوہر سرمد کا دوست جمال اس پر مرمٹا ہے۔

چنبلی کا تعلق بازارِ حسن سے ہے طلال شیخ ایک نامور سیاست دان اور جاگیردار کا بیٹا ہے جو چنبیلی کے حسن پر مرمٹا ہے۔

شاہ میر رسول بخش کا سب سے چہیتا شاگرد تھا، جو ان کے ساتھ ہی رہائش پذیر تھا۔



احمد فجر کے بعد جلدی جلدی گھر سے نکلا۔ آج ڈبل سواری پر پابندی کی وجہ سے پڑوس کے کامران انکل اسے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ نہیں دے سکے۔ اسے کافی انتظار کے بعد بس کی کھچا کھچ بھری چھت پر جگہ ملی۔ انتہائی تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے کچھ مسافر نیچے جاگرے جن میں احمد بھی شامل تھا۔

سرمد سو رہا ہوتا ہے تو جمال کا فون آتا ہے۔ اپنی بدقسمتی پر کڑھتی نائلہ کو جمال کی کال ایک نعمت لگتی ہے۔ جمال اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے پھر سبز باغ دکھاتا ہے۔ اچانک نائلہ کی نظر اٹھتی ہے تو سامنے کھڑا سرمد اسے عجیب نظروں سے دیکھتا نظر آتا ہے۔

طلال چنبیلی کے شادی پر اصرار کرنے پر ہامی بھر لیتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد مہک جان سے بات کرے گا۔ مہک جان سے بات کر کے وہ اس کی شرائط مان کر چنبیلی سے نکاح کر کے لے جاتا ہے۔

احمد کے انتقال کے بعد عائشہ اور اس کی امی بہت سارے مسائل کا شکار ہوتی ہیں لیکن اپنی غیور طبیعت کی وجہ سے کسی سے قرض ادھار نہیں لیتیں۔

ایک سلائی کے سوٹ کے لیے لیس اور دھاگہ خریدنے کے لیے عائشہ کو بازار جانا پڑتا ہے۔ شام زیادہ ہو جاتی ہے، وہ بس کے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے مانی بصد اصرار اسے لفٹ دیتا ہے۔ مانی کی امی اور بہن ماریہ گاڑی میں مانی کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھتی ہیں لیکن پہچان نہیں پاتیں۔ مانی پوچھ گچھ پر ماریہ کے سامنے عائشہ کا نام لے دیتا ہے۔

جمال دوپہر میں فون کر کے نائلہ کو ہوٹل لے جانے کی بات کرتا ہے۔ دروازہ بجنے پر دو باپ کو دیکھ کر وہ حیران رہ جاتی ہے۔ سید صاحب اس کا فون اٹھاتے ہیں۔ سید صاحب کے جانے کے بعد نائلہ جمال سے ملنے نکل جاتی ہے جہاں وہ ایک دوسرے سے التفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جمال اسے اپنے نوتعمیر شدہ بنگلے میں لے جاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ یہ تمہارا گھر ہے۔

چنبیلی طلال کے ساتھ شادی ہو جانے پر بہت خوش ہے۔ طلال اسے بتاتا ہے کہ ہر چیز جو اسے پسند آجائے وہ قید کر لیتا ہے اور اس قید سے رہائی اس کی مرضی کے بغیر ممکن نہیں۔

سید صاحب اپنے بیٹے فرحان سے اس کی شادی کی بات کرتے ہیں تو وہ پھر ٹال دیتا ہے حمنہ کے نکاح والے دن مانی عائشہ کا انتظار کرتا ہے۔ ماریہ جو اس کی دوست ہے اس سے پوچھتا ہے تو وہ بتاتی ہے کہ وہ اپنی امی کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آسکتی۔

عائشہ کی خالہ کا فون آتا ہے وہ عائشہ کی امی سے کہتی ہے کہ جوان بچی کے ساتھ اکیلی کیسے رہو گی میرے پاس آجاؤ، عائشہ کی امی انکار کر دیتی ہیں اور سوچتی ہیں کہ کب تک بہن کو انکار کروں گی اگر مجھے کچھ ہو گیا تو عائشہ کا کیا ہوگا۔ وہ عائشہ کے رشتے کی بات کرتی ہیں۔

جھمکا جان بڑی بی کو ڈانٹتی ہے کہ تم اس انتظار میں رو رو کے کیوں مر رہی ہو، وہ نہیں آئے گا۔ پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مر مرا گیا۔ تارا جھمکا جان کو کبیر صاحب کے آنے کی اطلاع دیتا ہے۔

نائلہ جمال کے گھر سے آنے کے بعد بھی اسی تصور میں کھوئی ہوئی تھی۔ سرمد آتا ہے تو اسے بخار ہوتا ہے۔ وہ نائلہ سے چائے بنانے کا کہتا ہے نائلہ منع کر دیتی ہے اور گلی کے نکڑ سے اسے چائے لانے کا کہتی ہے۔ واپس آکر سرمد، نائلہ سے پوچھتا ہی ہے کہ وہ آج دن میں کہاں گئی تھی۔

چنبیلی طلال کو ماں بننے کے متعلق بتاتی ہے تو وہ ناراض ہوتا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں ہمارے یہاں خاندانی بیوی سے بچہ پیدا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ کہتا ہے کہ ہم چھ بھائی ہیں اور چھٹا بھائی لاڈلا چہیتا یہ شادی کے چھٹے مہینے پیدا ہوا تھا۔

ماریہ، عائشہ کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ اس کے رشتے کے لیے شام میں کچھ لوگ آرہے ہیں۔ مانی اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے سن لیتا ہے۔

ظفر صاحب کی بیٹی کو فائرنگ کے ذریعے ڈرا کر ان کو عملی دھمکی دی جاتی ہے۔

چنبیلی بیٹے کی پیدائش پر طلال کی توجہ پا کر پھر اپنا خیال رکھتی ہے لیکن طلال نشے میں چور گھر آکر اس سے کہتا ہے کہ وہ اپنی محبوبہ کے پاس سے آرہا ہے۔ چنبیلی کے سوال پر کہتا ہے کہ تو تو بیوی ہے محبوبہ تو وہ ہے جو فلیٹ میں رہتی ہے۔

جان محمد کی بیٹی کو ایکسیڈنٹ کے ذریعے مروا دیا جاتا ہے۔ اس کی بیوی بین کرتی ہے اور چلا چلا کے قاتلوں کے نام

لیتی ہے اس کی رشتہ دار اسے چپ کرانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی۔ میڈیا کے لیے یہ بہت بڑی خبر تھی کیس کے اہم گواہ کی بیٹی کی ایکسیڈنٹ میں موت۔ میڈیا کی بڑی تعداد اس کے گھر جمع تھی۔

ماریہ، شاہ میر کے ہاتھ کا سلا سوٹ دیکھ اس کی تعریف کرتی اور اسے کہتی ہے کہ تم اپنے چاچا کو تنگ کیوں کرتے ہو۔ انہوں نے تمہاری شکایت کی ہے۔ نائلہ سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود اپنی کیفیت خود نہیں سمجھ پاتی۔ وہ ڈرتی ہے کہ باہر جانے پر پہچان لی جائے گی۔ جمال اس کا یہ حل نکالتا ہے کہ اسلام آباد شفٹ ہو جائے۔

امداد بروہی پریس کانفرنس کر کے صفائی پیش کرتا ہے کہ جان محمد کی بیٹی کو مارنے میں اور ظفر صاحب کی بیٹی پر فائرنگ میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔

جان محمد کے جیل میں سارے عیش و آرام ختم ہو چکے تھے، اسے انتہائی بدبودار اور غلیظ کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تھا۔ جب سے اس نے گولی نہ چلانے کا بیان دیا تھا اس پر شدید ٹارچر ہو رہا تھا۔

ترنم نے روتے روتے ارمانوں سے کرایہ پر لیا گھر خالی کیا، اماں دو ملازم ساتھ لائی تھی جو سارا سامان پیک کر رہے تھے۔ اسے تو ہوش نہ تھا ایک سوچ پریشان کر رہی تھی کہ ایسی کیا بات تھی جو اس نے دل پر لے لی اور دل دھڑکنا ہی بھول گیا۔

سامان لوڈ ہو گیا تو اماں نے اسے اور بچوں کو ٹیکسی میں بٹھایا۔ خلیل نے جاتی ٹیکسی دیکھ کر کہا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں ایک عورت چاچا سے ملنے آتی ہے اور پوچھتی ہے کہ میری امانت ہے تمہارے پاس۔ کیسا ہے وہ۔ چاچو کہتے ہی کہ ٹھیک ہے۔ وہاں ماریہ بھی چاچا سے ملتی ہے، وہ اپنی دوستوں کے ساتھ وہاں آتی ہے۔ عورت اٹھ کر چلی جاتی ہے، چاچا کسی سوچ میں گم تھے۔ شاہ میر ایک یتیم خانے میں اپنی آمدنی کا بڑا حصہ خرچ کرتا ہے۔

عالیہ بیگم بیٹی کی شادی کے لیے زیورات نکالتی ہیں، شوہر مانی کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کی پسند کی لڑکی کے گھر کب جانا ہے، وہ انکار کر دیتی ہیں۔

عائشہ کی خالہ کا بیٹا ذوہیب گھر والوں کو سرپرائز دینے کے لیے ایک ہفتے پہلے آ جاتا ہے۔

ظفر صدیقی صاحب کو وفاقی وزیر بجل شاہ پولیس کے اعلا افسر کے ہمراہ اپنے گھر بلا کر انہیں مقدمے کو ختم کرنے کا کہتا ہے۔ پولیس افسر کرم الٰہی بھی انہیں سمجھاتا ہے کہ جان محمد اب بیان ولی شاہ کے حق میں دے گا۔ بجل شاہ ایک لفافے میں بلینک چیک دیتا ہے کہ اپنی مرضی کا اماؤنٹ بھر لیں۔ مانی یہ جان کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ ظفر صاحب نے قصاص کے پیسے لے لیے۔

ترنم کی عدت ختم ہو جاتی ہے۔ ماں اسے کہتی ہے کہ وہ کچھ ہار سنگھار کر لے۔ ترنم اپنے بیٹے کی بسم اللہ کرنے کے لیے کہتی ہے۔

جمال فون سن کر زرد پڑ جاتا ہے۔ وہ نائلہ سے کہتا ہے کہ اپنا پرس اٹھاؤ اور چلو۔ وہ نائلہ کو خوب پیدل گھماتا پھراتا آگے بڑھتا ہے وہ کسی گھبراہٹ کا شکار تھا۔ ایک جگہ جا کر وہ موٹر سائیکل کی پاس رکتا ہے اور اس پر بیٹھے ایک عجیب و غریب حلیے والے لڑکے کو کہتا ہے کہ نائلہ کو محفوظ جگہ پہنچا دے۔ وہ اسے انتہائی نچلے متوسط علاقے کے ایک گھر میں لے آتا ہے اور وہاں ایک عورت آ کر پوچھتی ہے کہ تم کون ہو۔

طلال کے پاس اس کے باپ کا فون آتا ہے کہ وہ ظفر صدیقی والے کیس سے دور رہے کیونکہ ان کے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ جھنڈے والی گاڑی کا خواب طلال کو اس کیس سے دور کر دیتا ہے۔

پریا طلال کی دیوانگی سے تنگ آ جاتی ہے۔ طلال اسے کہتا ہے کہ جو چیز اس کی ہوتی ہے وہ کسی اور کے قابل نہیں رہتی۔ وہ اس کے چہرے پر تیزاب ڈالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ نائلہ کو پتا چلتا ہے کہ وہ جمال کا گھر ہے، راکٹ اس کا بھائی اور وہ لڑکی اس کی بھابھی ہے۔

چنبیلی طلال سے لڑ کر اپنا سامان پیک کرتی ہے۔ طلال اسے مارتا ہے اور دھمکی دیتا ہے کہ باہر نہ جانا۔ چنبیلی انتہائی بری حالت میں کوٹھے پر پہنچتی ہے۔ سب اس کی حالت دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہیں۔

اچانک چنبیلی کی چیخوں سے پورا گھر لرز جاتا ہے۔

چنبیلی کی چیخ سن کر جب سب اس کے کمرے میں پہنچتے ہیں تو اس کا چہرہ تیزاب کی وجہ سے موم بتی کی طرح پگھل رہا

تھا۔

ترنم کا بیٹا سپارہ پڑھنا شروع کر چکا ہے۔ ترنم بہت خوش ہے۔ اس کی ماں کہتی ہے کہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچو۔ وہ اسے شیخ صاحب کا بتاتی ہے۔ ترنم کہتی ہے کہ میں اپنے دونوں بچوں کو نہیں چھوڑوں گی۔

سومی، نائلہ کو بتاتی ہے کہ جمال پہلے یہاں ہی رہتا تھا۔ چھ مہینے پہلے گیا ہے اور وہ راکٹ کا بڑا بھائی اور اس کا جیٹھ ہے۔ راکٹ کے آنے پر بات ٹل جاتی ہے۔

جھمکا جان طلال کے خلاف ایف آئی آر درج کراتی ہے۔ چاچڑ اسے سمجھاتا ہے کہ پرچہ تو کٹ جائے گا مگر طلال کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

عائشہ جس اسکول میں پڑھاتی ہے وہاں کچھ غنڈے آکر ان کا سامان اٹھا کر پھینکتے ہیں اور انہیں ڈرا دھمکا کر جاتے ہیں۔

مائی کے لیے یہ بات انتہائی صدمے کا باعث تھی کہ شاہ زین کے گھر والوں نے اس کے قاتلوں سے مذاکرات کرکے کیس ختم کردیا تھا۔

کھانا کھاتے ہوئے ذوہیب اپنی امی سے باتیں کررہا تھا عائشہ خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی کہ اچانک ذوہیب ماں کی آواز پر چونکتا ہے وہ بتاتی ہیں کہ ان کے سینے میں شدید درد اٹھا ہے۔ ذوہیب عائشہ سے کہتا ہے کہ ڈرائیور سے کہو گاڑی نکالے۔ خالہ کی حالت پر عائشہ خود پریشان ہوجاتی ہے۔

انیسویں اور آخری قسط

خاتون خانہ نے گلاس ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ دروازہ بجا۔

"میرے شوہر آگئے شاید، میں دروازہ کھول دوں، پھر آپ کو پانی لا کر دیتی ہوں، وہ باہر چلی گئی۔ چند لمحوں بعد صحن سے مانوس آواز آئی، جھمکا کے اندر جیسے ایک کرنٹ سا دوڑ گیا۔ وہ بے اختیار کھڑی ہوگئی۔ اس وقت کا، اس لمحے کا انتظار کتنی شدت سے کیا تھا اس نے۔"

جھمکا نے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے مگر اس کے پیروں کو جیسے زمین نے جکڑ لیا تھا، اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس نے بے بسی کی ایک نظر اپنے چاروں طرف دوڑائی، کمرے کی دیواروں پہ قرآنی آیات کا کیلنڈر اور مقدس مقامات کے طغرے لگے تھے۔ ایک پیلے سے میٹرس پہ ایک طرف بچہ سو رہا تھا فرش پہ بچھی چٹائی پہ جو بچی بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی، وہ باپ کی آواز سنتے ہی باہر دوڑ گئی تھی۔ چولہے پہ پکتی ہنڈیا کی خوشبو پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی اور خاتون خانہ کے مہربان اور نرم لہجے کی خوشبو جھمکا کے آس پاس موجود تھی۔

"گھر، پیارا گھر، ہنستا بستا گھر۔" جھمکا کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی۔

گھر بنانے اور بسانے میں کتنا وقت لگتا ہے مگر بگاڑنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا، جھمکا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ ان ہی بھیگی آنکھوں سے اس نے عارف کے سوئے ہوئے معصوم چہرے کو دیکھا، اسے پیار کرنے کی اپنی شدید خواہش کا گلا گھونٹتے ہوئے اس نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔

"یہ لیں بہن! پانی پی لیں۔"

جھمکا نے کسی معمول کی طرح گلاس ہاتھ میں لے کر ایک ہی سانس میں چڑھا لیا، اس کا چہرہ اب وہ نہیں رہا جو کچھ دیر قبل تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں، میں اپنے شوہر سے معلوم کرتی ہوں، ہوسکتا ہے، وہ کچھ بتا سکیں۔" خاتون خانہ

نے ہمدردی سے جمکا کا متغیر چہرہ دیکھا۔
"آپ لوگ نئے آئے ہیں، آپ کو کیا معلوم، میں کسے ڈھونڈ رہی ہوں؟"
جمکا نے غائب دماغی سے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھا دیے۔ گھر کے دروازے سے باہر نکلتے وقت آنسو کسی ضدی بچے کی طرح آنکھوں کی منڈیر سے باہر آنے کو زور لگا رہے تھے مگر جمکا نے بہت سختی سے اپنی آنکھیں اور چہرہ رگڑا تھا۔ چہرے کو سیاہ چادر سے چھپائے اس گھر اور گلی سے دور جاتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان دونوں، بہن بھائیوں کا سامنا اب بائیس برس بعد ہوگا۔

☆☆☆

رنگ برنگے لہراتے آنچل چہار طرف نظر آ رہے تھے، فضا خوشبوؤں سے مہکی ہوئی تھی، بھانت بھانت کی آوازیں بھی تھیں، مرد، خواتین، بچے، لڑکے، لڑکیاں تقریب اپنے عروج پر تھی، نکاح کا مرحلہ سر ہو چکا تھا۔ دلہن کو لا کر دولہا کے پہلو میں بٹھا دیا تھا۔ دونوں کے چہرے الوہی خوشی سے چمک رہے تھے، ان دونوں سے وابستہ رشتے بھی خوش اور مطمئن تھے۔ سید صاحب بھی بظاہر خوش اور پرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اندر ہی اندر جو فکر اور پریشانی تھی۔ وہ چہرے پر سجی مصنوعی خوشی اور اطمینان کے نیچے سے نظر آنے لگی تھی ہر اک کو تو نہیں، مگر ابو جان کی زیرک نگاہیں کچھ بھانپ گئی تھیں۔
"ارے سید صاحب! بھولے جا رہے ہیں آپ، بیٹی تھوڑی رخصت کر رہے ہیں۔ پریشان کیوں ہیں؟"
"نہیں نہیں، پریشانی کی کیا بات ہے، خوشی کا موقع ہے۔ دراصل طبیعت ابھی تک سیٹ نہیں ہوئی تو بس اسی لیے۔" سید صاحب نے فوراً وضاحت کی۔
"بہو گھر آ جائے گی تو طبیعت خود بخود ٹھیک ہو جائے گی آپ کی۔" ابو نے مسکرا کر انہیں تسلی دی۔
"اللہ کرے۔" سید صاحب بڑبڑائے۔
ابو جان کا رخ اب مانی کی طرف تھا جو اسٹیج سے اتر کر نیچے آ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا حال بھی سید صاحب کے چہرے سے مختلف نہ تھا۔ بظاہر مسکراتا ہوا مطمئن چہرہ مگر باطن جوار بھاٹا تھا۔
"صاحبزادے! آپ کے منہ پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" ابو نے اسے پکڑ لیا۔
"بارہ، میرے منہ پہ نہیں گھڑی میں بجے ہیں۔ یہ دیکھیے۔" مانی نے کلائی کی گھڑی انہیں دکھائی۔
"چہرے کا وقت بھی گھڑی کے وقت سے میچ کر رہا ہے۔" ابو نے بغور دیکھا۔
"اتنا غور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" مانی سنجیدہ ہو کر دھیمے سے بولا۔
"غور تو تم کر رہے ہو میاں صاحبزادے، اتنا زیادہ غور و فکر کرو گے تو وقت سمیت بہت کچھ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔" ابو کی آواز بھی دھیمی ہوئی۔
"کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ابو! کیا کروں؟"
مانی اس وقت بالکل کسی ایسے چھوٹے بچے کی طرح لگ رہا تھا جس سے بھرے میلے میں، باپ کی انگلی چھوٹ گئی ہو اور وہ حیران پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا ہو۔
"بس ایک فیصلہ کر لو جی کڑا کے۔"
"وہی تو نہیں ہو رہا، نہ جی فیصلہ ہو رہا ہے، نہ ہی جی کڑا کیا جا رہا ہے، مانی کی بے بسی ایک مسکراہٹ میں ڈھل گئی اور نگاہ جو سامنے تھی، وہ یونہی وہیں جم گئی، جہاں عائشہ اندر آتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سفید اور سنہری امتزاج کے سوٹ میں ملبوس وہ کتنی حسین لگ رہی تھی، مانی ایک لمحے کو بے اختیار ہوا، اگلے ہی لمحے عائشہ کی ہمراہی میں زوہیب کو دیکھ کر اس نے ہونٹ بھینچ لیے جو عائشہ کی طرف جھک کر کچھ کہنے لگا تھا اور عائشہ کی

مسکراہٹ بے حد دلکش تھی۔

"ٹھیک ہے پھر؟" ابو جان اس کی نگاہوں کے ارتکاز اور حالت و کیفیت سے بے خبر اپنی دھن میں جانے کیا بول گئے تھے۔ مانی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی، وہ اب مانی کے جواب کے منتظر تھے۔

"جی؟" مانی چونکا تھا، عائشہ اور زوہیب سے نظریں ہٹا کر اس نے ابو جان پہ مرکوز کیں۔

"جیتے رہو بیٹا، خوش رہو۔" ابو جان کے چہرے پہ رونق اور بشاشت نے ڈیرا ڈالا، انہوں نے بہت خوش ہو کر بیٹے کا کندھا تھپتھپایا تھا اور آگے بڑھ گئے۔

"مگر آپ کہہ کیا رہے تھے؟" مانی کچھ دیر بعد پریشان ہو کر ان کے پیچھے لپکا مگر اس کی کاوش بے سود رہی، اس کے پہنچنے سے قبل امی جان اپنے مجازی خدا کے قریب پہنچ گئی تھیں، کچھ فرمایا اور ان کے ساتھ سامنے ٹیبل کی طرف چل دیں جہاں ان کے رشتے دار بیٹھے تھے۔

مانی نے بے بسی سے پہلے امی، ابو کو دیکھا پھر عائشہ اور زوہیب کو دیکھنے لگا جو اسی کی جانب آ رہے تھے۔

☆☆☆

صاف ستھری، ہموار سڑک پہ لینڈ کروزر تیز رفتاری سے یوں بھاگ رہی تھی جیسے نشیب کی طرف تیزی سے بڑھتا پانی۔

طلال کے لیے آگے کا سفر کچھ مشکل نہ تھا نہ ہی آگے کے معاملات اپنے اور پریا کے یادگار دنوں کے دور کی ایک نشانی اس کے پاس تھی، جو اس وقت اس کے کام آ رہی تھی۔ اس کے پاس اس فلیٹ کی چابی تھی۔ اپنی جیب میں موجود پستول کو اس نے تھپکا جو پہلے بھی کئی بار اس کے کام آئی تھی۔ چھپکلی اور کاکروچ سے ڈرنے والی مخلوق کے لیے یہ چھوٹا سا ہتھیار بھی کسی توپ سے کم نہیں، ایک استہزائیہ مسکراہٹ طلال کے لبوں پہ کھیلنے لگی، ڈرائیو کرتے ہوئے اس نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھا۔ اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں تھی۔

"اب یہ چوہیا پوری طرح گھیرے میں ہے۔ بھاگ کر کہاں جائے گی۔" بلڈنگ کے بیسمنٹ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس کے خیالات میں بھی اور چہرے پر بھی گھمنڈ چھایا ہوا تھا۔

☆☆☆

بڑی بی کا جھریوں بھرا چہرہ آج بہت غم زدہ لگ رہا تھا۔ آنکھیں کھولے چھت پہ گھومتے پنکھے کو دیکھتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہی تھیں۔ نیچے قالین پہ بیٹھی نائلہ نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ آج خلاف معلوم وہ بہت دیر سے خاموش تھیں ورنہ اتنی دیر میں تو وہ کئی بار اپنے بیٹے کو یاد کر کے رو لیتی تھیں۔

"اور رونے کے لیے تمہارے پاس کیا کم ہے جو اس بڑی بی کے آنسوؤں کی فکر ہو رہی ہے؟"

نائلہ کے اندر سے کوئی بولا تھا اور وہ چپ چاپ سر جھکا کر اپنے ہاتھوں اور ناخنوں کو گھورنے لگی، پچھلے چند دنوں میں اتنا روئی تھی کہ رو رو کر تھک گئی تھی، بلکہ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بے زار ہو گئی ہو، آنسوؤں سے بھی، لوگوں سے بھی اور زندگی سے بھی، دونوں گھٹنوں پہ سر رکھے وہ اپنے غم کا سوگ منا رہی تھی، تب ہی اس کے قریب لیٹی جھمکا نے کروٹ لی تھی۔ وہ بھی بہت دیر سے بس آنکھیں بند کیے لیٹی تھی، ادھر سے ادھر کروٹیں بدلتی رہی مگر اس کمرے میں موجود ان تینوں نسلوں سے نیند روٹھی ہوئی تھی۔ آتی بھی تو ہزار نخروں اور شدید انتظار کے بعد۔

"ایک بات تو بتا۔" جھمکا نے نائلہ کو مخاطب کیا۔

"کیا؟" نائلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا، جب سے جمال گرفتار ہوا تھا، اسے جھمکا سے ایسی نفرت محسوس ہوتی تھی جو بیان سے باہر ہے مگر یہاں رہتے ہوئے بلکہ وہ کہیں اور بھی ہوتی تب بھی، جھمکا جان کا کچھ

بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ بلکہ زیادہ دیر اپنا منہ بھی نہیں بگاڑ سکی تھی اس سے۔
وہ ایسی تلخ باتیں مگر حقیقت بیان کرتی تھی جو نائلہ کی برداشت سے باہر تھیں۔ اس وقت بھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اب یہ کڑوی عورت کیا پوچھنے والی ہے۔
''تیرے ماں باپ نے بھی اچھا برا نہیں بتایا مجھے؟ کچھ سکھایا نہیں کہ کیا کام صحیح ہے کیا غلط؟'' جھمکا کا سوال اور انداز دونوں ہی نائلہ کی توقع سے ذرا کم تلخ تھے۔
''میں دس سال کی تھی جب ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور ابا بہت کم گو تھے مگر......'' نائلہ بولتے بولتے چپ ہو کر اپنا ناخن چبانے لگی۔
''تو نہیں جانتی، تو نے خود کو ایسی سولی پہ ٹانگ لیا ہے جہاں زندگی ہے نہ موت۔'' جھمکا بڑبڑائی۔
نائلہ اس کی بڑبڑاہٹ سے بے خبر بڑی بی کو دیکھ رہی تھی جن کے گلے سے عجیب خرخر کی آوازیں نکل رہی تھیں۔
''انہیں کیا ہوا؟'' نائلہ تیزی سے اٹھی اور اس سے زیادہ پھرتی جھمکا نے دکھائی اٹھنے میں۔

☆☆☆

ولیمے کی تقریب سے فارغ ہو کر سب نے ہی سکون کا سانس لیا تھا، کسی کی بھی نیندیں پوری نہیں ہوئی تھیں تھکن اور نیند سے سب ہی بے حال تھے۔
''شکر ہے دو، دن ہالی ڈے ہے، میں تو صرف اور صرف سوؤں گا اور بس۔'' صوفے میں دھنستے ہوئے مانی نے اعلان کیا۔
''دو دن میں سے ایک دن تو تمہارا بک ہے، اسے تو اپنے آرام کی لسٹ سے نکال دو۔'' ابو جان نے لقمہ دیا۔
''بک؟ کیا مطلب، کسی معاملے میں بک ہے ایک دن؟'' مانی نے چونک کر انہیں دیکھا۔
''سنڈے کو تمہاری اور علیزے کی میٹنگ ہے۔ تم نے خود ہامی بھری تھی۔''
''میں نے؟ میں نے کب ہامی بھری تھی؟'' مانی یوں اچھلا جیسے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔
''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ ہماری عمر سے تو بہت دور ہو ابھی، پھر یادداشت کا یہ عالم؟ فروا کی شادی والے روز تم سے بات ہوئی تھی اور تم نے ہاں کہا تھا، ابو نے اپنے بیٹے کو یوں دیکھا جیسے طفل نادان۔''
''مگر......؟'' مانی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔
''اگر مگر مت کرو مانی، کبھی کبھی تم بالکل بچوں کی طرح بی ہیو کرتے ہو، تم ایگری ہوئے تو میں نے تمہاری امی کو بتایا اور پھر معاملہ آگے بڑھا ہے۔ ساری بات ہو گئی ہے۔ وہ لڑکی بھی بہت مصروف رہتی ہے، شاید تم سے بھی زیادہ۔ اس کے پاس یہی سنڈے ہے تم سے ملنے کے لیے، اس کے بعد تم دونوں ڈیسائیڈ کر لینا، ایک بار ملنے میں حرج ہی کیا ہے؟'' ابو جان اس بار تو زچ ہو گئے تھے۔
مانی کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ الفاظ بہت تھے اس کے پاس، مگر سب کے سب گونگے بنے مایوس اور بے بس کھڑے تھے۔

☆☆☆

بہت برسوں بعد گھر میں کسی نسوانی وجود کی خوشبو مہکی تھی اور چوڑیاں اور آواز کھنکی تھی، ولیمے کے بعد عارف اور فروا ماہ عسل منانے شمالی علاقہ جات کی طرف نکل گئے تھے۔
سید صاحب نے کمرے کی کھڑکی سے آتی دھوپ کو دیکھا جو زرد ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اٹھے اور باہر آ گئے۔

اور یہ آج، اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا، وہ نہ جانے کیا تھا۔ زندگی کا ایک اور مذاق؟ تقدیر کا ستم، مکافات عمل یا کچھ اور بھی تھا۔ یہ مگر معجزہ تو نہیں تھا۔

☆☆☆

اف کتنے مہینوں کے بعد آج چھٹی کا ایسا دن آیا تھا جسے اپنی مرضی سے گزارنے کا موقع ملا تھا، بستر پہ پڑے اینڈتے رہو یا ورزش کے نام پہ چھلانگیں مارو۔ موبائل پہ اپنی پسند کے گانے، ڈرامے، فلمیں دیکھو یا دادی جان کے پاس گھس گھس کر انہیں تنگ کرو، اب تو اور باقی کاموں کے ساتھ ساتھ دادی کو ستائے ہوئے بھی کئی ہفتے بلکہ مہینے گزر گئے تھے۔

کچھ خیال آتے ہی وہ تیزی سے اٹھی اور دو چار چھلانگوں کے بعد دادی کے تخت پر تھی۔

"دادی جان!" ماریہ نے تکیے میں منہ دیا۔

"ہوں۔" وہ گاؤ تکیے کے غلاف کی ڈوریاں ٹھیک سے کس رہی تھیں۔ موئے ہر تھوڑی دیر بعد کھل جاتے تھے۔

"شکر ہے شادی کی تیاریاں اور ہنگامے ختم ہوئے۔"

"اللہ کا شکر ہے، تمہارے اماں باوا اپنے فرض سے سبکدوش ہوئے۔ اللہ دونوں کو خوش رکھے بات بنائے رکھے، دل سے دل ملائے رکھے۔"

"آمین، آمین، ثم آمین!" صدق دل سے کہتی ہوئی ماریہ کہنیوں کے بل اونچی ہوئی۔ "تھکن کے مارے براحال ہو گیا۔ جی بھر کے سونے کو ترس گئی میں، پہلے سب کے شاہی ملبوسات کی تیاریاں پھر تقریبات کی مصروفیات۔"

"دادی، کیا آپ کے زمانے میں بھی شادیاں ایسے ہی ہوتی تھیں یا سادگی سے کام لیتے تھے لوگ؟"

"ارے بھئی، ہمارے دور میں بھی ایسے ہی تام جھام اور دھوم دھام سے شادی بیاہ ہوتے تھے۔ سب ہوت کے جوت ہے، ہر زمانے میں یہی ہوتا ہے کہ جس کو اللہ نے جتنا دیا ہے وہ اتنا ہی خرچ کرتا ہے، جو بے چارے غریب غربا ہوتے ہیں، وہ سادگی اختیار کر لیتے ہیں۔ بہرحال ہمارے خاندان میں تو بڑے دھوم دھام سے بیاہ ہوتے تھے۔ بہت سے رسم و رواج تھے، کئی کئی روز تقاریب ہوتی تھیں، اب تو بہت سی پرانی ریت رواج رسمیں ختم ہوتی جا رہی ہیں، نئے دور کی نئی باتیں، نئے لوازمات، ان تقاریب میں شامل ہوتے جا رہے ہیں دادی نے گاؤ تکیہ سرہانے لگایا اور خود اس سے ٹیک لگالی۔

"فضول رسم و رواج کو تو خیر ختم ہو جانا چاہیے۔ شادی تو سادگی سے ہونی چاہیے۔ ہم نے ایک آسان سے کام کو خود ہی بہت مشکل بنا لیا ہے۔" ماریہ نے رائے دی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بی بی! شادی بیاہ میں نمود و نمائش اور اسراف نہ ہو، یہ صاحب حیثیت لوگوں کے چونچلے ہیں۔ وہ اپنی دولت کا ضیاع کرتے ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی کم حیثیت طبقہ احساس محرومی کا شکار ہوتا ہے یا خود کو زیر بار کر کے اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش کرتا ہے ٹھیک ہے کہ بے جا دکھاوا اور اسراف نہیں ہونا چاہیے مگر بھئی، وہ جو چھوٹے چھوٹے معصوم رسم و رواج ہیں۔ انہیں تو ختم نہیں ہونا چاہیے۔ وہ تو ہماری تہذیب، ثقافت اور خوشیوں کی علامت ہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ ختم کر کے ان کی جگہ بدتر رواج فروغ پائیں گے۔ یہ تو بڑی بری صورت حال ہو گی۔"

"ویسے شادی کوئی اتنا ضروری کام تو نہیں جو لازمی ہی کیا جائے؟" ماریہ کو ایسے ہی انوکھے خیالات آتے تھے جنہیں وہ من و عن پیش کر دیتی تھی۔

''کیوں نہیں بھئی، لنڈورے انسان کی بھی کوئی زندگی ہے بھلا؟'' دادی نے تعجب سے پوتی کو دیکھا۔
''ہاں، اچھی خاصی، اچھی بھلی زندگی ہوتی ہے۔ شادی تو بس ذمے داریوں اور پابندیوں کا نام ہے۔''
''بٹیا! عورت ہو یا مرد، ذمے داریاں اور پابندیاں تو دونوں کے لیے ہی ہیں بس یہ ہے کہ عورت کے ذرا زیادہ ہیں۔''
''ذرا نہیں بہت زیادہ۔ ہمارے معاشرے میں عورت سے بہت سی امیدیں اور توقعات وابستہ ہیں جن پر اسے پورا اترنا ہے۔ مگر مادر پدر آزادی تو اس مسئلے کا حل نہیں، ہر پابندی اور ذمے داری سے آزاد فرد، یہ تو خود اپنی جگہ بڑا خوفناک مسئلہ ہے۔'' دادی نے بڑے سبھاؤ سے اسے سمجھایا۔
''پتا نہیں۔ ویسے مجھے دوسروں کی شادیاں تو بہت اچھی لگتی ہیں۔ خوشی ہوتی ہے۔ مزا آتا ہے مگر، اپنے لیے یہ سب سوچ کر بڑی الجھن محسوس ہوتی ہے۔'' ماریہ نے دھیرے سے کہا۔
''کیسی الجھن بھئی؟'' دادی نے آنکھیں سکیڑ کر پوتی کو دیکھا۔ ''ایک تو یہ آج کل کے بچے، ہماری سمجھ سے باہر۔ جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ سوچتے رہتے ہو۔'' بہت زیادہ سوچ بچار میں بھی انسان الجھ جاتا ہے۔
''ٹھیک ہے دادی! چلیں چھوڑیں، ویسے بھی یہ بحث اگلے سال تک بھی چلتی رہے تو کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔'' ماریہ نے بال سمیٹ کر پونی بناتے ہوئے بحث بھی سمیٹ لی۔

☆☆☆

وہی کمرا تھا، وہی بیڈ جس پر وہ نحیف و نزار وجود سراپا انتظار تھا۔ پردے سمٹے ہوئے تھے اور کھلی کھڑکی سے روشنی اور دھوپ فراخ دلی سے اندر آرہی تھی۔
دروازے سے بستر تک کا فاصلہ کوئی بہت زیادہ نہیں تھا مگر اتنے ذرا سے فاصلے کو طے کرنے میں جیسے صدیاں لگ گئی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا وہ بستر تک آیا تھا۔ جس پر ترنم لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں چہرے کی جھریوں میں جیسے عمر بھر کی داستان پھیلی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں چاند کو یہ چہرہ اجنبی معلوم ہوا۔ برسوں پہلے جب وہ یہاں سے گیا تھا تو ترنم اتنی لاغر، اتنی نحیف اور اس قدر بوڑھی نہ تھی، بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر وہ بیٹھ گیا، ترنم کا کمزور استخوانی ہاتھ، اس نے اپنے ہاتھ میں لیا۔
''کون ہے؟'' بوڑھے وجود میں ہلچل سی مچی، آنکھیں کھول کر ترنم نے سر گھمایا۔
''چاند! میرا بچہ آ گیا!'' بیٹے کو پہچاننے میں، ماں کو بالکل بھی تردد نہیں کرنا پڑا۔ اس کا لمس ہی شناخت کے لیے کافی تھا۔ تب ہی وہ اس بری طرح چونکی تھی۔
''امی!'' چاند نے وہ ہاتھ، لبوں سے لگا لیا اور ذرا سی دیر میں اسے آنسوؤں سے گیلا کر دیا۔ کیا پانے کے لیے وہ کیا چھوڑ کر گیا تھا؟
عمر بھر کا نقصان چند لمحوں میں پورا نہیں ہوتا، پوری زندگی جو بات سمجھ میں نہیں آئی تھی، آج اس لمحے اس کا ادراک ہوا تھا۔ عزت جس ہستی کے ہاتھ میں ہے، وہ تو ہر جگہ موجود ہے، یہاں بھی اور یہاں سے باہر کی دنیا میں بھی، انہوں نے انسانوں سے عزت چاہی اور اس کے لیے سگے رشتوں کو چھوڑ گیا، یہی عزت، اللہ سے مانگتا تو وہ عزت بھی دیتا اور رشتے ناتے بھی قائم رہتے۔ مگر یہ انسان، اس کی سمجھ میں بات ہمیشہ بہت دیر سے آتی ہے، اتنی دیر سے کہ پھر باقی کچھ نہیں بچتا سوائے آنسوؤں کے اور یہی پشیمانی کے، پچھتاوے کے آنسو چاند کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔
''میں کہتی تھی نا کہ میرا بیٹا آئے گا۔ ضرور آئے گا، کہاں ہے وہ قطامہ۔ ارے کوئی بلائے اس کو آ کے دیکھے، میرا بیٹا آ گیا میرے پاس۔''

ترنم کی کانپتی ہوئی آواز میں ایسی خوشی تھی جیسے عمر بھر کسی غم کا منہ ہی نہ دیکھا ہو۔

☆☆☆

باہر شام کے سناٹے پھیل رہے تھے۔ اندر کمرے میں لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین پہ وہ نگاہیں جمائے بیٹھا تھا۔ دماغ کی اسکرین پر کچھ اور ہی منظر چل رہا تھا۔

جھک کر کچھ کہتا ہوا زوہیب اور دلکشی سے مسکراتی ہوئی عائشہ۔ کبھی ایک منظر، بہت سے دوسرے مناظر دھندلا دیتا ہے۔ مدثر احمد کے اندر بھی دھند چھا رہی تھی۔ مگر عجیب بات تھی، دماغ جو کچھ سوچتا تھا۔ دل اس پر یقین کرنے سے انکاری تھا اور یہ دل بھی بس بہت ہی خوب شے ہے۔ کبھی تو آنکھوں دیکھی پر بھی یقین کرنے پہ آمادہ نہیں ہوتا، اپنے کانوں سے سنی بات کو جھٹلا دیتا ہے یہ دل تو واقعی ایک بچہ ہی ہے، کبھی سادہ، معصوم سا، کبھی اڑیل، ضدی، کبھی ہنستا کھیلتا، کبھی روتا بسورتا، مگر جیسا بھی ہے، یقین اسی پر کرتا ہے جس پہ کرنا ہو، فائدہ ہو یا نقصان، اپنے ہی کہے پہ چلتا ہے، اپنے ہی نقش قدم پہ پاؤں دھرتا ہے۔

"اف ف......!" اتنی دیر سے پلک جھپکائے بغیر اسکرین پہ نظریں جمائے جمائے، اب آنکھوں میں پانی آنے لگا تھا۔ مانی نے جلتی ہوئی آنکھیں سختی کے ساتھ بند کیں۔ مگر بند آنکھوں سے بھی مناظر غائب نہیں ہوئے، کانوں پہ ہاتھ رکھ لینے سے آوازیں خاموش نہیں ہوتیں، سماعتوں میں گونج باقی رہتی ہے۔

راستہ چاہے کتنا ہی دھندلا کیوں نہ ہو۔ ایک دن یہ ساری دھند چھٹ جائے گی، راستے، مناظر، چہرے سب واضح اور نمایاں ہو جائیں گے انجام کار وہ نہیں ہے جو میں دیکھتا، سنتا اور سمجھتا ہوں بلکہ وہ ہے جو میں چاہتا ہوں۔"

دل اسے یقین دلا رہا تھا اور مدثر احمد یقین کر رہا تھا، کیونکہ وہ اپنے دل پر ہی یقین کرنا چاہتا تھا۔

"اگرچہ یہ ایک بہت بڑی خوش فہمی بلکہ بے وقوفی بھی ہو سکتی ہے۔" عقل اپنے سارے ہتھیار سنبھالے میدان میں آگئی۔

"جب کی جب دیکھی جائے گی، فی الحال تو مایوسی اور ناامیدی کے لیے میرے پاس کوئی جگہ نہیں۔" دل نے اپنا فیصلہ صاد کر دیا۔

☆☆☆

بالکونی میں وہ آج اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں برسوں پہلے بھی کھڑے ہو کر اندھیروں اور اجالوں کی آنکھ مچولی دیکھا کرتا تھا۔ آسمان دیکھتا تو اسے چھونے کی تمنا کرتا، خود کو معلق محسوس کرتا تو زمین پہ پاؤں جمانے کی خواہش ہوتی، اپنی آرزو پوری کرتے کرتے اتنی دور نکل آیا تھا کہ واپسی کے سفر میں نڈھال ہو کر تھک ہار کر گر پڑا تھا۔

سید صاحب عرف چاند نے اپنے قدموں کو ڈگمگاتا ہوا پایا تو قریب رکھی کرسی کا سہارا لیا، جس پر پچھلے دو گھنٹے سے بیٹھا جھمکا کوسن رہا تھا۔ جس کی باتیں، باتیں نہیں، تازیانے تھے جو بری طرح لگ رہے تھے لہولہان کر رہے تھے مگر وہ اس تکلیف کو سہنے پر مجبور تھا۔

"نائلہ یہاں کیسے؟" باپ کو تو سوال میں لفظوں کو ترتیب دینا بھی نہیں آیا مگر جھمکا پھٹ پڑی تھی۔

"آپ کی بیٹی یہاں کیسے؟ پھر کہاں ہونا چاہیے تھا اسے؟ وہاں؟ جس کے پلے باندھا تھا آپ نے، بغیر دیکھے بھالے، بغیر سوچے سمجھے؟ کبھی غور سے دیکھا تھا اپنی بیٹی کو، خوب صورت روشن سویرے کو کنویں میں ڈال دینے سے وہ اندھا کنواں روشن نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ اجالا بھی تاریکی میں بدل جاتا ہے۔ اس لڑکی کے اپنے بھی کچھ خواب تھے، خیالات تھے، اس کی تسلی کے لیے کچھ تو ہوتا اس رشتے میں، ایک کم رو، کمزور، غریب اور دبو قسم کے مرد کو اس کی زندگی میں داخل کر کے آپ مطمئن ہو گئے کہ بس اپنا فرض ادا کر دیا۔ بیٹی کی مرضی، پسند ناپسند

جاننے کی ضرورت نہیں تھی آپ کو؟'' جھمکا نے انتہائی کاٹ دار لہجے میں سوال کیا۔
''اس کا مطلب ہے کہ جو عورت اپنے شوہر یا زندگی سے خوش نہ ہو، اسے صحیح غلط، حرام حلال، جائز ناجائز کی پروا کیے بغیر اپنی خواہشات کے پیچھے پیچھے بھاگنا چاہیے؟ یہ درست قدم ہے؟ صحیح رویہ ہے؟'' سید صاحب کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''ہاں۔ اس نے غلط کیا، گناہ کیا، مگر ہر گناہ اور جرم کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ اس وجہ کو بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آئندہ کوئی اور فرد اس گناہ یا جرم میں ملوث نہ ہو۔''
جھمکا کی آواز پست ہو گئی، چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ دوبارہ بولی۔
''اور ویسے نائلہ کا یہاں پہنچنا تقدیر کے اس کھیل کا حصہ بھی ہو سکتا ہے جو وہ ہر انسان کے ساتھ کھیلتی ہے۔''
''تقدیر کو سارے کھیل ہمارے ساتھ ہی کھیلنے تھے؟'' سید صاحب کے تلخ لہجے میں مزید کڑواہٹ کے ساتھ ساتھ شکوہ و شکایت بھی آ گئے۔

''اولاد کو والدین سے وراثت میں محض شکل و صورت، رنگ و قد کی شباہت ہی نہیں ملتی بلکہ عادت، مزاج، خصلت، کردار، بہت سے رنگوں کا تال میل دو نسلوں کے درمیان ہوتا ہے۔ ذات کے کچھ دھاگوں کی بنت اور گرہیں جوں کی توں آگے منتقل ہو جاتی ہیں، کبھی کوئی اولاد اسی نقش قدم اور راستے کو منتخب کر لیتی ہے جس پر والدین چلے ہوتے ہیں۔''
جھمکا سوچتی رہی مگر خلاف عادت کچھ کڑوی کسیلی کہنے کے بجائے اس نے غور سے اس شخص کو دیکھا جو سر جھکائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ جو اتنا بوڑھا نہیں تھا جتنا کہ اس وقت نظر آ رہا تھا اور کیا اس شخص کو کبھی اندازہ ہو سکے گا کہ اس سے ایک نہیں بلکہ دو عورتوں نے محبت کی ہے؟
''اگر وہ پانچ مہینے اور صبر کر لیتی تو......'' سر جھکائے جھکائے سید صاحب گویا ہوئے۔
''کون؟'' جھمکا کو فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس کی بات کر رہے ہیں۔
''پانچ مہینے بعد کرنٹ لگنے سے سرمد کا انتقال ہو گیا تھا۔'' انہوں نے مدھم آواز میں بتایا اور جھمکا کتنی ہی دیر ساکت بیٹھی رہی۔
''تو، نائلہ نے بھی وہی جلد بازی کی جو کبھی آپ نے کی تھی؟'' اس کی نگاہیں سامنے پھیلتے شام کے سرمئی آنچل پر تھیں۔
''آپ بھی تو جلد بازی میں نکلے تھے گھر سے۔ اپنی ماں اور بہن کو ساتھ لے جانا ہی بھول گئے؟''
جھمکا کو خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی زندگی کا سب سے کڑوا سچ، جسے وہ سوچ کر ہی نیلو نیل ہو جاتی تھی۔ وہ سچ آج اس نے کتنی آسانی سے اور سادہ سے لہجے میں کہہ دیا۔
شاید اسے آج بھی اپنے بھائی پہ رحم آ رہا تھا، ترس آ رہا تھا۔ جس کا چہرہ، جھمکا کی زبان سے سچ سن کر بالکل تاریک پڑ گیا تھا۔ زبان یوں اکڑ گئی کہ ایک لفظ بھی منہ سے نکلنا محال ہو رہا تھا۔ بے شک وہ شرمندگی اور معذرت کے الفاظ ہوں، مگر اب ان سب لفظوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟
عمر کی آخیر سانس تک وہ شرمندہ رہیں گے خود سے مگر یہ ندامت ان دونوں عورتوں کے کس کام کی جس میں سے ایک بستر پہ لیٹی اپنی سانسوں کی گنتی پوری کر رہی ہے اور دوسری چلتی پھرتی عمر کے ایک ایک لمحے کا قرض ادا کر رہی ہے۔

☆☆☆

ترنم کے مردہ تن میں جیسے کسی نے روح پھونک دی تھی۔ برسوں سے مردہ پڑی زمین اک دم لہلہا اٹھی۔

''دیکھا، دیکھا بہری بوا! میں کہتی تھی نا، تم سب سے، میرا بیٹا آئے گا اور ضرور آئے گا، دیکھو آ گیا میرا شہزادہ، بلاؤ تو ذرا یہ ہے کہاں، جو منہ بھر بھر کے بددعائیں دیتی تھی، آ کے دیکھ، اپنے پھوٹے دیدوں سے، ارے میرے اللہ نے میری سن لی، زندگی بھر اس حرافہ کی خوشامدیں کرتی رہی اور نامراد رہی اور جیسے ہی اپنے اللہ کو پکارا، میری جھولی بھر گئی۔''

بے انتہا خوشی اور بے پایاں جوش کے عالم میں اپنی لرزتی، کانپتی آواز میں ترنم اتنا بولی کہ ہانپ ہانپ گئی۔

''تمہاری لگن سچی تھی، جو چاند کو یہاں کھینچ لائی۔'' بہری بوا نے رشک سے بڑی بی کو دیکھا۔

''اب تو، تو میرے پاس ہی رہے گا نا؟'' ترنم نے بے حد آس سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا، جس کی گرفت میں اس کا بوڑھا، کمزور ہاتھ تھا، ترنم نے اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔

''ہاں کیوں نہیں، خیر سے تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ، بیٹا آ گیا ہے تو اب کہاں جائے گا۔'' چاند کے جواب دینے سے پہلے ہی بہری بوا بول اٹھیں۔

''اب تم اتنا زیادہ مت بولو، آرام کرو۔'' بوا نے لگے ہاتھوں نصیحت بھی کر ڈالی۔

''تھکن تو مجھے بالکل بھی نہیں ہے، اب تو بس آرام کا وقت آ گیا ہے۔'' ترنم نے بولتے بولتے آنکھیں موند لیں۔

''اب جانا نہیں۔'' آنکھیں بند کیے وہ بڑبڑائی اور چاند کے ہاتھ پہ اپنی گرفت اور بھی مضبوط کی۔

☆☆☆

کفن کی طرح سفید چہرہ اور پورا وجود لاش بن کر حنوط زدہ ہو رہا تھا۔

''کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب؟'' پھٹی پھٹی آواز میں اس کی سرگوشی میں بھی کافور کی مہک آ رہی تھی، جھمکا نے جو کچھ اسے بتایا تھا، وہ بری طرح ہل کر رہ گئی تھی۔

''آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔'' نائلہ کا انداز ایسا تھا جیسے اپنی بات پہ خود بھی یقین نہ ہو۔

''کاش کہ جھوٹ ہی ہوتا۔'' وہ ہونٹوں میں ہی بدبدائی۔

''میرے لیے کچھ ہے؟ کچھ ہے زندگی کے دامن میں؟'' نائلہ نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''میرا دل چاہ رہا ہے، ساری دنیا کو آگ لگا دوں اور خود بھی اس میں جل مروں۔''

''تو تو پہلے ہی مری ہوئی ہے اور کیا مرے گی؟ اری بے وقوف، ہم اور تم مردہ ہی تو ہیں، ہمارا شمار زندوں میں کب ہوتا ہے۔'' شدت ضبط سے جھمکا کا چہرہ سرخ تھا، آنکھیں ویسے ہی خون چھلکا رہی تھیں۔

''میرا کیا قصور تھا؟'' نائلہ نے بولتے بولتے یکسر فراموش ہی کر دیا کہ وہ کن حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچی تھی۔ اپنی خواہشات اور گناہوں کو زینہ بنا کر اوپر جانے کی کوشش کی تھی۔ بلندی کے بجائے پاتال میں جا گری۔

''اور میرا کیا قصور تھا؟'' جھمکا نے کچھ کہے بغیر اپنی سرخ نگاہیں نائلہ کے چہرے پہ گاڑ دیں۔ پتا نہیں کیا بات تھی اسے اب کسی پر بھی بلکہ اپنے آپ پر بھی غصہ کے بجائے ترس آ رہا تھا۔ کچھ دیر تک وہ نائلہ کا سفید لٹھے جیسا چہرہ دیکھتی رہی جسے اس نے پہلے پہل اپنے غصے اور لعنت ملامت کا ہدف بنایا تھا۔

''پتا نہیں، اس کا قصور کتنا ہے اور کتنا نہیں؟ اس نے صبر اور سمجھوتے کی راہ اپنانے کے بجائے بغاوت اور فرار کی روش اختیار کی جو مذہبی، معاشرتی، اخلاقی ہر لحاظ سے سراسر غلط ہے، مگر یہ بھی تو ہے کہ جسے سمجھانے والا، رہنمائی کرنے والا کوئی نہ ہو، وہ ترغیب اور گناہ کی ڈھلوان پہ بہت جلدی پھسلتا ہے۔'' جھمکا خود ہی خود سوچتے ہوئے بھتیجی کو سارے الزامات سے بری کر رہی تھی۔

''تو فکر مت کر، تیرا کچھ نہ کچھ بندوبست کر دوں گی میں۔''

جھمکا کو بالآخر اس پر رحم آ ہی گیا جو شاید باقی دنیا والوں کی نظروں میں یقیناً قابل رحم نہ ہوتی اگر جو اس کی اصلیت دنیا پہ کھل جاتی تو وہ یقیناً راندۂ درگاہ ٹھہرتی مگر جھمکا کو محسوس ہو رہا تھا کہ نائلہ کو اپنے کیے کی سزا اور سبق دونوں مل گئے ہیں۔ اگرچہ آگے کے بارے میں وہ بالکل لاعلم تھی کہ یہ سزا کہاں تک اور کب تک چلے گی؟ وہ تو بس یہ سوچ رہی تھی کہ نائلہ کے لیے ایسا کیا کرے کہ اس کی باقی ماندہ زندگی اور سزا کچھ نرم کچھ آسان ہو جائے۔

☆☆☆

چہار طرف نیم تاریکی کا راج تھا۔ الیکٹرک پولز پہ نصب بلب اس اندھیرے کا مکمل خاتمہ کرنے سے قاصر تھے۔ مزید روشنی کے لیے ایمرجنسی لائٹس کا انتظام و اہتمام کیا گیا تھا۔ آس پاس روشنی تھی۔ باقی اطراف میں دور دور تک خاموشی اور نیم تاریکی، لوگ تھوڑے تھے اور کام بھی بہت زیادہ دیر کا نہیں تھا۔ زمین کی امانت، زمین کے سپرد کر کے مٹی بھی ڈالی جا چکی تھی۔ مولوی صاحب دعا کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ سب کے ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور زبانیں آمین کہہ رہی تھیں۔

قبرستان سے باہر آتے آتے چاند بابو کے قدم شل ہو رہے تھے۔ سہارے کے لیے نہ جانے کس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ وہی ہاتھ جس میں چند گھنٹے قبل ماں کا ہاتھ تھا۔ جب وہ تاکید کر کے سوئی تھی۔ ''اب جانا نہیں۔'' بیٹے کو تاکید کر کے آنکھیں موندتے وقت شاید کسی کو بھی اندازہ تھا نہ آگہی کہ اب ترنم کے اپنے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ ہاں پہلے بیمار تھی مگر بیٹے کو دیکھتے ہی اس میں جیسے نئی روح، نئی زندگی آ گئی تھی۔ اس وقت اسے دیکھنے والا کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تھوڑی ہی دیر میں اتنی آسانی سے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند لے گی۔

اور اب چاند کو یاد آ رہا تھا، کہتے ہیں کہ چراغ کی لو مکمل طور پر بجھنے سے پہلے بھڑکتی ضرور ہے ایک مکمل شعلہ، تیز روشنی اور پھر اندھیرا، ترنم نے بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کیں، ایک مکمل شعلہ بن کر زندگی اور توانائی اس میں دکھائی دی اور جب بیٹے کا ہاتھ، اپنے ہاتھ میں لے کر آنکھیں بند کیں تو ذرا دیر بعد ہی یہ گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

چاند نے سرد ہاتھ کو دوبارہ تھاما مگر زندگی کی گرمی ختم ہو چکی تھی۔ پنچھی پنجرے سے اڑ گیا تھا۔ مسافر اپنے ابدی سفر پہ روانہ ہو گیا تھا۔

اور رات کے اس پہر قبرستان سے نکلتے وقت چاند بابو سوچ رہے تھے کہ آج صبح گھر سے نکلتے وقت انہوں نے بالکل نہیں سوچا تھا کہ واپسی پر وہ کتنے لٹے پٹے کتنے اکیلے اور کتنے غمگین ہوں گے۔

پتا نہیں کیسے وہ اپنے گھر تک پہنچ سکے تھے۔ تہی داماں اور تہی دست ہونے کا جیسا احساس آج ہو رہا تھا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بستر پر لیٹتے ہوئے دل کا درد اور عمر بھر کی پشیمانی پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلی۔ اس بہتے پانی میں کہیں کہیں ایک چہرے کی جھلک نظر آ رہی تھی جسے دیکھا نہیں تھا مگر دیکھنے کی خواہش اب شدید تر ہو گئی تھی اور اگر اسے ایک بار گلے لگا کر اپنے گناہ کی معافی مانگ لوں تو شاید وہ معاف کر ہی دے۔

ایک ننھا منا سا وجود نگاہوں کے سامنے پل کر جوان ہو گیا جوان کی نفرت اور بے اعتنائی کی نذر ہو گیا تھا۔ نفرت بھی کسی دیمک یا آکاس بیل سے کم نہیں ہوتی، انسان کو اور اس کی زندگی کو، سب کو کھا جاتی ہے۔ آخر میں کچھ بھی تو نہیں بچتا ہے، زندگی بھر کے وہ سارے پچھتاوے جن سے وہ آنکھ چرائے بیٹھے تھے، آج انہیں اپنے گھیرے میں لے رہے تھے۔

☆☆☆

گوشت بھونے جانے کی مہک اور مسالے کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ شاہ میر بڑے انہماک سے

ہنڈیا بھون رہا تھا۔ موسم اب اچھا ہو چلا تھا۔ کچن میں کام کرتے ہوئے پسینے نہیں آ رہے تھے۔ اچھی طرح گوشت بھون کر اس میں تھوڑا سا پانی ڈال کر آنچ دھیمی کر کے وہ لاؤنج میں آ گیا۔

چاچا بڑی سی میز پر کپڑا رکھے، ناپ تول کر رہے تھے اگرچہ اب وہ اپنی درزی کی دکان پہ کم ہی کام کرتے تھے، کمر کی تکلیف اور درد مستقل ہو گیا تھا، ذرا سا جھکنا عذاب تھا مگر پھر بھی کچھ پرانے قدر دان اور مہربان ایسے تھے جو اصرار کرتے تھے کہ وہ کم از کم ان کے کپڑے کو ہاتھ لگا دیں اور چاچا ان پرانے قدر دانوں کے آگے مجبور ہو جاتے تھے۔ کپڑا کاٹنے سے قبل انہوں نے نگاہ اٹھائی اور شاہ میر کو دیکھا، انہیں اچانک ہی کچھ یاد آیا تھا۔

"جناب شاہ میر جی۔"

"جی جناب؟" شاہ میر گیلے ہاتھ تولیے سے پونچھ رہا تھا۔

"ملک صاحب کا فون دوبار آ چکا ہے میرے پاس۔"

"میرے پاس بھی آیا تھا۔" شاہ میر اب اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"بلا رہے ہیں تجھے، اسلام آباد میں بہت بڑا پروجیکٹ شروع کر رہے ہیں۔ بھانجے کی کپڑے کی مل ہے فیصل آباد میں، اس کے ساتھ مل کر بوتیک بھی کھول رہے ہیں۔ بہت اصرار کر رہے تھے کہ تجھے بھیج دوں۔" چاچا نے قینچی ایک طرف رکھ دی تھی کہ کٹنگ کا کام وہ پورے اطمینان انہماک اور خاموشی سے کرتے تھے۔

"مجھے بھی کچھ اسی قسم کی آفر کی تھی مگر......"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ تو یہیں ٹھیک ہے، مگر بہت تگڑی آفر دے رہے ہیں۔ چند سال بھی لگا دیے تو مستقل سنور جائے گا تیرا۔" چاچا نے کچھ سوچتے ہوئے اسے دیکھا۔

"زندگی میں پیسہ ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔" شاہ میر نے کچن میں جا کر چولہا بند کیا پھر واپس آ کر بیٹھ گیا۔

"مگر بہت کچھ تو ہوتا ہے۔"

"میں نے منع کر دیا ہے انہیں۔" شاہ میر نے انکشاف کیا۔

"تب ہی تو مجھے کہہ رہے تھے کہ تجھے سمجھاؤں؟"

"میں یہیں ٹھیک ہوں، ہاتھ میں بے شک پیسے کچھ کم ہیں مگر آنکھوں کے سامنے وہ چہرے تو ہیں جنہیں میں دیکھنا چاہتا ہوں۔" شاہ میر نے پہلا جملہ با آواز بلند اور دوسرا دل ہی دل میں ادا کیا۔

"سوچ لے اچھی طرح، ایک ہفتے کا ٹائم دیا ہے انہوں نے۔"

"چاچا! تم یہ کٹنگ مکمل کرو۔ سالن تیار ہے، میں روٹیاں لے کر آتا ہوں۔" شاہ میر اٹھ کھڑا ہوا۔

"نہ جانے کی کوئی ٹھوس وجہ تو بتا دے۔" چاچا نے پیچھے سے فقرہ کسا۔

"آپ خود ہی سراغ لگا لیں۔" شاہ میر مسکراتا ہوا چل دیا۔

"ہائیں، یہ پتھر میں کب سے جان پڑ گئی؟ بولنے بھی لگا، دھڑکنے بھی لگا۔" چاچا نے دانتوں تلے انگلیاں دبا لیں۔

☆☆☆

چھٹی کا دن، سب کی الگ الگ مصروفیات تھیں۔ ممی، ڈیڈی "غزل شام" سننے آرٹس کونسل گئے ہوئے تھے۔ علیزے دن بھر جم اور پھر بیوٹی سیلون میں مصروف تھی۔

ذوہیب اپنی ہونے والی منگیتر کے ساتھ لنچ کر کے واپس آیا۔ اسپورٹس چینل دیکھتے دیکھتے وہیں صوفے پہ لڑھک گیا۔ شام میں اٹھا تو ممی ڈیڈی جا چکے تھے۔ علیزے آ چکی تھی اور کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹ چکی تھی۔ اسے رات میں ایک پارٹی میں جانا تھا۔ ذوہیب نہا دھو کر فریش ہو گیا، جینز اور ٹی شرٹ میں ملبوس، خود پر پرفیوم

اسپرے کر کے باہر آ گیا۔
عائشہ لان میں بیٹھی تھی۔
"تم تو شاید "غزل شام" میں جا رہی تھیں؟" ذوہیب وہیں آ کر بیٹھ گیا۔
"ہاں ارادہ تو تھا پھر موڈ نہیں ہوا۔"
"تمہارا موڈ اکثر چھٹیوں پر کیوں رہتا ہے؟"
"پتا نہیں۔" ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔
"پتا کرو پھر مجھے بتاؤ۔ تمہارا باہر جانے کا موڈ نہیں ہوتا، بولنے کا، ہنسنے مسکرانے کا، کھانے پینے کا، کسی تفریح کا، کسی بات کا موڈ نہیں ہوتا آخر کیوں؟"
ذوہیب نے سوالات کی بوچھاڑ کرتے ہوئی عائشہ کا جائزہ لیا۔ موسم اور فیشن کے حساب سے خوب رنگین پیراہن، فراخ آنچل، ہلکی سی لپ اسٹک، کانوں میں پہنے ننھے منے سے ٹاپس اور کلائی میں موجود منفرد سا بریسلیٹ، وہ خاصی دلکش اور دیدہ زیب لگ رہی تھی مگران سب لوازمات کے باوجود بھی چہرے کی اداسی تھی کہ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی، جو بقول ذوہیب اس ٹریڈ مارک اور شناختی علامت بن گئی تھی۔
"خوشی خوشی مسکرانے میں زیادہ محنت نہیں لگتی، یقین کرو۔"
"اتنی بار بتا چکے ہیں کہ حفظ ہو گیا ہے۔" عائشہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
"گڈ ل گرل اینڈ گڈ ورک۔ اب بتاؤ، کیا پروگریس ہے؟"
"کوئی پروگریس نہیں، وہی حالات ہیں جو تھے۔"
"یعنی کہ محبت کی گاڑی عرصے سے ایک ہی جگہ رکی ہوئی ہے، جب کہ آگے پیچھے کوئی ٹریفک جام بھی نہیں۔"
"کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انسان کے راستے میں کوئی دوسرا رکاوٹ نہیں بنتا۔ مگر انسان خود ہی کبھی اپنا راستہ روک لیتا ہے۔ غلط فہمیوں اور شکوک وشبہات کی دیوار اپنے آگے خود ہی کھڑی کر لیتا ہے اور پھر اس دیوار کے پار سے نہ وہ آگے دیکھ سکتا ہے، نہ آگے جا سکتا ہے۔" عائشہ کا لہجہ دھیما تھا اور آواز اس سے بھی زیادہ دھیمی۔
"غلط فہمیاں اور شکوک وشبہات ختم ہو بھی سکتے ہیں۔ یہ کوئی اتنا مشکل کام تو نہیں۔" ذوہیب نے آگے جھک کر تجویز پیش کی۔
"ہاں، مشکل تو نہیں مگر سوال یہ ہے کہ یہ درمیان میں آئے ہی کیوں؟ محبت اتنی بے اعتبار تو نہیں ہوتی؟ ہونی بھی نہیں چاہیے۔"
عائشہ نے اعتراض اٹھایا بلکہ یہ دراصل اس کا شکوہ تھا جو اصل میں اس شکوے کا حق دار تھا۔ اس تک تو یہ گلہ پہنچا نہیں سکی، بس یہ رازدار اور مددگار تھا جس سے دل کی باتیں کچھ کچھ کر لیتی تھی۔
"دیکھو لڑکی! یہ محبت نام کا جو جزیرہ ہوتا ہے نا، یہ چاروں طرف سے کئی لہروں کی زد میں ہوتا ہے۔ ڈر اور خوف کی لہر، بے اعتباری اور شکوک وشبہات کی لہر۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ بھروسے و یقین کی، حوصلے کی اور امید کی لہریں بھی ہوتی ہیں۔ آگے پیچھے ایک ایک کر کے ساری لہریں آتی ہیں۔ آنے دو نا نہیں۔ تم اپنی جگہ ڈٹی رہو چٹان کی طرح، جتنی بھی ناپسندیدہ لہریں ہیں نا، خود ہی دم توڑ جائیں گی۔"
ذوہیب کسی مدبر، فلسفی کی طرح اسے سمجھا رہا تھا اور عائشہ آنکھیں پھاڑے اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔
"کچھ آیا عقل شریف میں؟" ذوہیب اس کی حیرانی دیکھ کر مسکرایا۔
"میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میرا خیال تھا، آپ کو سمجھتی ہوں مگر ہر بار آپ کا ایک نیا روپ ہی سامنے آ

ہے۔ بے شک اچھا والا مگر...... مگر......"

"مگر یہ کہ ان موصوف کا بھی اچھا والا نیا روپ سامنے آئے گا۔ پریشان مت ہو، بس تھوڑا انتظار اور...... اب چائے اٹھاؤ اپنی۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

ذوہیب نے بولتے ہوئے چائے کے مگ کی جانب اشارہ کیا جو کچھ دیر پہلے ملازمہ رکھ گئی تھی۔ عائشہ نے مگ اٹھا لیا مگر چائے پیتے ہوئے بھی دماغ مختلف سوالات اور خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ذوہیب کی یا کسی کی بھی نصیحتوں پر عمل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

باہر روشن دن پوری طرح پھیلا ہوا تھا۔ روشنی اور دھوپ اس کمرے میں اچھی طرح پہنچ رہی تھی۔ پھر بھی انہیں بہت گھٹن اور گھبراہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے ہی انہیں یہاں آنے کا پیغام ملا۔ وہ بغیر کسی توقف کے فوراً چلے آئے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ جھمکا نے انہیں یہاں بلوایا ہو، اسے جب بھی سال میں ایک بار ملنا ہوتا تھا وہ ایک مخصوص ریسٹورنٹ میں آتی تھی اور چاچا سے شاہ میر کے بارے میں پوچھ کر، اس کی باتیں سن کر چلی جاتی تھی مگر اس بار اس کا چاچا کو بلانا یقیناً حیرت کی بات تھی۔

"میں نے آپ کو یہاں اس لیے بلایا ہے کہ جو بات کہنی ہے، وہ میں اس جگہ نہیں کر سکتی تھی۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے؟" جھمکا کا ازحد سنجیدہ چہرہ دیکھ کر چاچا بھی سنجیدہ ہو چلے تھے۔

"شاہ میر اور چاند بھائی کے بارے میں آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ ان کی ایک بیٹی ہے......" جھمکا نے آہستہ آہستہ بولتے ہوئے انہیں نائلہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"میں کیا مدد کر سکتا ہوں لالی! میں تو خود چراغ سحری ہوں، اب بجھا کہ تب بجھا۔" چاچا کی آنکھوں میں الجھن کے ساتھ یاسیت بھی تیر گئی۔

"چاچا! میں اسے یہاں نہیں رکھنا چاہتی۔ آپ شاہ میر کو سب کچھ بتا دیں، آپ ہمیشہ کہتے تھے نا مجھ سے کہ اسے سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ میں ہی منع کرتی رہی ہمیشہ مگر اب...... میری مجبوری سمجھ لیں یا خود غرضی، اگر وہ اپنی بہن کی ذمہ داری قبول کر لے تو بڑا احسان ہوگا۔ اگرچہ میں اس قابل تو نہیں ہوں کہ اس سے ایسی کوئی التجا کروں یا امید رکھوں مگر یقین کریں، میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا ہے۔ روشنی کی اگر کوئی کرن ہے تو وہ بس وہی ہے اور تو مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا جس کے سپرد کروں اسے۔ باپ اور بھائی تو اسے دفنا چکے ہیں، وہاں جانا بھی ممکن نہیں ہے۔ دنیا والے، تینوں میں سے کسی کو جینے نہیں دیں گے، میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔" جھمکا نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

"میں بات کرتا ہوں شاہ میر سے، مگر میں کسی خوش گمانی کا وعدہ نہیں کر سکتا۔" چاچا کی پیشانی پہ عمر کی ہی نہیں، سوچ کی لکیریں بھی نمایاں تھیں۔

☆☆☆

دھوپ ابھی بہت تیز نہیں ہوئی تھی۔ وہ جلدی ہی نکل گئے تھے۔ جھمکا نے کہا بھی تھا کہ کسی کو ساتھ کر دے گی مگر سید صاحب نے منع کر دیا تھا۔ پتا اتنا مشکل نہیں تھا۔ ایک دو دکان داروں سے پوچھ کر وہاں تک پہنچ ہی گئے۔ یہ شہر کا وہ بازار تھا جہاں گیارہ بارہ بجے تک دکانیں کھلنا شروع ہوتی ہیں مگر وہ جہاں جا رہے تھے اور جن سے ملنا تھا، ان کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ وہ دس بجے پہنچ جاتے ہیں اور انہیں ٹھیک ہی بتایا گیا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو دونوں وہاں موجود تھے۔

''السلام علیکم انکل!'' ماریہ نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا تھا۔
''خیریت تو ہے، آپ اس وقت یہاں؟'' ماریہ سچ مچ بہت حیران تھی۔
''ہاں بس وہ، ایک کام کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ سوچا، آپ سے بھی ملتا چلوں۔''
انہوں نے ذرا اٹک کر مگر اپنے مخصوص پرتکلف انداز میں بات کی۔ اتنے میں شاہ میر اندر سے نکل کر آیا۔ ان سے علیک سلیک کرتے ہوئے وہ بھی حیران ہوا مگر اپنی حیرانی کا اظہار کرنے سے گریز کیا۔
''وہ جو میرا سوٹ تھا، بہت اچھا تھا۔ بس واسکٹ ذرا تنگ لگ رہی تھی۔'' سید صاحب نے شاہ میر کو مخاطب کر کے یوں ہی بات بنائی، اگرچہ ان کے لیے کچھ کہنا مشکل ہو رہا تھا۔ حلق میں کوئی گولا سا اٹک رہا تھا۔ آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش تو کر رہے تھے مگر اس میں کامیاب تھے یا ناکام، اس کا اندازہ خود ان کو نہیں ہو رہا تھا۔
''اوہ!'' شاہ میر کے چہرے پہ تاسف کے رنگ آ گئے۔
''اگر آپ اس وقت ٹرائی کر لیتے جب میں نے کہا تھا تو آپ کو پریشانی نہیں اٹھانی پڑتی۔''
''ہاں غلطی ہو گئی بہت بڑی۔'' انہوں نے ایک آہ بھری۔
(''ایسی غلطی کہ اب جان دے کر بھی کفارہ نہیں ادا کر سکتا۔'') دل میں سوچا تھا۔
''آپ لے آتے، میں ٹھیک کر دیتا۔'' ان کے خیالات سے بے خبر شاہ میر بے حد اخلاق سے بات کر رہا تھا۔
''بس خیال ہی نہیں رہا۔'' سید صاحب نے جیسے ندامت سے سر جھکایا۔
''(اور تم کیا جانو، مجھے زندگی میں ہر اس بات کا خیال نہیں رہا، جس کا خیال ہونا چاہیے تھا۔'')
اپنے خیالات چھپانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہے تھے۔ سنا ہے کبھی خیالات کا عکس انسان کے چہرے پہ بھی جھلکنے لگتا ہے۔ خوف زدہ ہو کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
''ارے انکل! ایسے کیسے، بیٹھیے نا۔ کیا پئیں گے، ٹھنڈا، گرم یا باری باری دونوں؟'' ماریہ بہت اچھی میزبان بن کر آخر میں مسکرا دی۔
''بس بیٹا! میں اب چلوں گا۔ ایک ضروری کام سے آیا تھا۔ وہاں دیر ہو جائے گی۔''
وہ بس اٹھ ہی کھڑے ہوئے، ماریہ اور شاہ میر کے بے حد اصرار پر بھی نہ رکے۔ وہاں سے نکلے تو آنکھوں کی نمی، پانی بن کر چھلک چھلک جانے کو تیار تھی مگر بڑی دقت سے وہ خود کو اور آنکھوں کو چھلکنے سے روکتے رہے۔
جھمکا نے جب انہیں، ان کے بیٹے کے بارے میں بتایا تو بے یقین سے ہو گئے تھے۔
''وہ...... وہ میرا بیٹا ہے؟'' ان کی نگاہوں کے سامنے اس لڑکے کا چہرہ گھوم گیا، جس سے چند بار ہی ملے تھے مگر ہمیشہ ہی بے حد اپنا اپنا سا اور شناسا سا محسوس ہوتا تھا۔
''تو یہ ہے میرا بیٹا۔ اتنا قابل، اتنا باصلاحیت اور اتنا سمجھ دار مگر اس کی کسی خوبی کو پروان چڑھانے میں میرا کوئی حصہ نہیں۔ میں نے باپ ہونے کا تو کیا، انسان ہونے کا فرض بھی نہیں نبھایا۔ واپسی کے سفر میں ہمیشہ کی طرح پچھتاووں کے ناگ انہیں بری طرح ڈس رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نائلہ کا بھی خیال کچوکے لگا رہا تھا اور نہ جانے اس لڑکی کا کیا ہوگا؟ میں کیا کروں، اسے کہاں لے جاؤں؟''
گھر پہنچتے پہنچتے وہ بری طرح نڈھال ہو چکے تھے۔
''ایک باپ اپنی بیٹی کو معاف کر سکتا ہے مگر دنیا والے کب کسی کو معاف کرتے ہیں؟'' ان کے خیال کی سوئی بھی بس یہیں آ کر اٹک گئی تھی۔

☆☆☆

"اور تو سب خیریت ہے۔"

عزیز من!

السلام علیکم!

بعد سلام عرض یہ ہے کہ میں خیریت سے ہوں۔ خداوند تعالیٰ سے امید ہے کہ تم بھی خیریت سے ہو گے۔ اگر تو میں شبلی نعمانی یا حالی، ہوتا تو خط اسی طرح شروع کرتا مگر......

نہ ہم تین میں نہ تیرہ میں، تو بس اتنا کہنا کافی سمجھو کہ سب خیریت ہی ہے۔ بس یوں ہوا کہ بٹیا کی شادی میں سونے کا کچھ زیور بنانا چاہا، معلوم ہوا کہ سنہری ذرات کی قیمت آسمان سے نہیں بلکہ ساتویں آسمان سے باتیں کررہی ہے۔ سونا اب صرف کچھ دوپہر اور کچھ رات کا رہ گیا ہے، ہاں بعض دفعہ اعلا افسران سے لے کر نائب قاصد کے گھروں پہ چھاپے میں برآمد ہوجاتا ہے۔

ہم جیسے عام لوگوں کی بات یہ ہے کہ سو کر تو خواب دیکھ سکتے ہیں مگر سونے کا خواب دیکھنا گویا "عشق ممنوع" ہے۔ ہماری اداسی اور مایوسی پر بٹیا نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

چھوڑیے ابا جان! اتنا مہنگا سونا اگر خرید بھی لیا جائے تو پہنے گا کون؟ چوروں، ڈاکوؤں کا خطرہ ہی لگا رہے گا۔

اچھا بھئی، دل کے بہلانے کو بلکہ باپ کے دل کو بہلانے کو یہ خیال بھی اچھا ہے۔ یار دوستوں کا لطیفہ یہ ہے کہ اسلام میں سونا مردوں پہ حرام ہے۔ اس عہد میں میں سونا عورتوں پہ بھی حرام ہوگیا ہے۔

تم نے ہماری خیریت دریافت کی تھی تو سب خیریت ہی ہے، بس وہ جو نصف صدی سے ہماری نصف بہتر ہیں، اب آلو گوشت بھی کبھار ہی پکانے لگی ہیں۔ عید، بقرعید کے علاوہ سال میں ایک دو بار اور پھر ستم یہ کہ اس پر ہرے دھنیے کا چھڑکاؤ بھی بند کردیا ہے۔ اعتراض + احتجاج کرو تو فرماتی ہیں بلکہ سچ کہوں تو پھٹ پڑتی ہیں۔

"اے نوج، بیس تیس روپے کی گڈی دھنیے پودینے کی، کبھی دیکھی سنی تھی؟ یہ تو سبزی والے روکن میں یونہی مفت دے دیا کرتے تھے۔ اب انہیں کون سمجھائے، لد گئے وہ زمانے۔ جب چینی چھ آنے سے آٹھ آنے ہوئی تو بادشاہ وقت کے خلاف عوام سڑکوں پہ نکل پڑے۔ اب سو دس اور ایک سو پندرہ روپے کلو پر بھی عوام الناس اپنے اپنے گھروں میں ہیں، شاید دو سو روپے فی کلو تک پہنچنے کا انتظار کررہے ہو؟ میرے ناچیز خیال میں وہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اگر بیگم صاحبہ تک یہ زرین خیال پہنچا تو فوراً مجھے لتاڑیں گی۔

اے نوج! کیوں بدفال نکالتے ہو منہ سے؟ کوئی نیک خیال نہیں آتا دماغ میں؟

دوست کیا کہوں، جب چاروں طرف "بد" ہو تو فال بھی "بد" ہی نکلتی ہے، اچھی نہیں۔ ویسے یہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس معمول کے مطابق گرانی اپنے عروج کے بھی عروج پر ہے، پہلے قیمتیں روزانہ بڑھتی تھیں۔ اب صبح، دوپہر، شام بڑھتی ہیں۔ دوائے دردِ دل بیچنے کا دعوا کرنے والوں نے دکان ہی بڑھا دی اور کمر توڑ، ہوش ربا مہنگائی بھی، گوشت کا یہ حال "گوشت خریدنے کی بات کرتے ہو، دل جلانے کی بات کرتے ہو" اس لیے اب بازار کی اس گلی میں جانا اور دل کو جلانا چھوڑ دیا مگر سبزیوں اور دالوں نے بھی اپنی قدر خوب کروائی، ہم جیسے "شرفاء" اور ناقدرے جو پہلے انہیں منہ لگانے کے قائل نہ تھے۔ غریب الدیار جان کر ہنس ہنس پکارتے تھے۔ اب انہیں سر آنکھوں پہ بٹھا کر چوم چاٹ کر کھاتے ہیں۔ کوئی سبزی پچاس، ساٹھ روپے پاؤ سے کم نہیں، اس میں ڈالنے کے لیے ٹماٹر اور ہری مرچیں بس گن کر دو چار خریدتے ہیں۔ ادرک بھی اب پاؤ کے بجائے چھٹانک میں قیمت بتاتا ہے سبزی والا۔

یہ دیکھو میں تمہیں سبزیوں کا احوال سنانے بیٹھ گیا اور آٹے دال کا بھاؤ تو بتایا ہی نہیں تو عرض یہ ہے کہ ویسے

تو ہمارے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں خیر خیریت ہی ہے بس ذرا آٹے کے دام ہر روز دن میں دو بار اوپر چلے جاتے ہیں اور ہمارے ہاں کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ جس شے کی قیمت اوپر چلی جائے، وہ پھر نیچے واپس نہیں آتی، بالکل ایسے ہی جیسے کوئی ذی روح اگر ایک بار اوپر چلا جائے تو واپس نیچے نہیں آتا۔

اگر جو ہم کچھ تن و توش کے مالک ہوتے تو ڈائٹنگ کے بہانے تین وقت سے دو وقت کا کھانا کر لیتے مگر کیا کریں، یہ پاپی پیٹ صبح، دوپہر، رات، تینوں وقت تقاضے کرتا ہے۔ بس یہ ہے کہ کچھ ہفتے پہلے روٹیاں گن کر کھاتے تھے، اب نوالے گن گن کر (اپنے ہی) کھاتے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ ہمارے حکمران نالائق اور نااہل ہیں۔ انہوں نے تو ہمیں اخلاقیات سکھائی ہیں کہ رزق کی قدر کرو، انہوں نے اناج کو اتنا قیمتی کر دیا ہے کہ ہر کس و ناکس اس کی عزت قدر کرنے پر مجبور ہے۔ مٹھی بھر روپوں کے بدلے مٹھی بھر دال کو نہایت عزت کے ساتھ لاتے ہیں اور احترام کے ساتھ پکاتے ہیں پھر انتہائی عقیدت سے کھاتے ہیں۔ دودھ اور انڈے کی عیاشی چھوڑ دی ہے۔

سنا ہے کسی زمانے میں گائے بھینسیں دودھ دیتی تھیں، اب ہمارے ہاں کے ہر فن مولا سائنس دان مختلف کیمیکلز ملا کر خود ہی دودھ بنا لیتے ہیں پھر اسے بھی مہنگا کر کے بیچتے ہیں۔ سو اب ایسا دودھ کون خریدے؟ رہی بات انڈوں کی تو بلند فشار خون کا مریض ہوں مگر انڈا کھانے سے پہلے اس کی قیمت سن کر ہی بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ پھر ہم بھی دکان دار کو بائی بائی کر کے گھر آ جاتے ہیں۔ ماضی کی ایک دھندلی سی یاد آتی ہے کہ کبھی ہم پھل بھی کھایا کرتے تھے، اب تو بقول جون ایلیا......

کیا ستم ہے کہ تیری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

میرے اس بہت کہے کو بس تھوڑا ہی سمجھو۔ داستان طویل ہے، شب طویل تر...... اپنی اور وطن عزیز کی خیریت کا باقی احوال اگلے خط میں بتاؤں گا۔

فقط تمہارا یار دل دار
مرزا غالب ثانی!

☆☆☆

کھانے کے بعد شاہ میر نے اپنے لیے کافی بنائی اور مگ لے کر بیٹھ گیا۔ چاچا کھانے کے بعد نہ چائے پیتے تھے نہ کافی۔ وہ توتھ پک سے دانتوں میں خلال کر رہے تھے۔

"یار! ایک بات کرنی تھی تجھ سے۔" بہت دیر تک سوچنے اور شاہ میر کو غور سے دیکھنے کے بعد چاچا گویا ہوئے۔

ایک ہی بات ہے جسے آپ روزانہ مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔" شاہ میر کا اشارہ شادی کی بات کی طرف تھا۔

"نہیں، ایک دوسری بات ہے۔" چاچا کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔

"دوسری کیا بات ہے؟" چاچا کے غیر معمولی لب و لہجے اور زبان کی لڑکھڑاہٹ پہ شاہ میر چونک اٹھا۔

"میں سوچ رہا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے، تجھے وہ سب کچھ بتا دوں جس سے تو بے خبر ہے۔"

"کیا؟" شاہ میر کا دل اک دم ہی دھڑک اٹھا، چاچا کو اتنا سنجیدہ اور اتنا پریشان اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"تو اتنا سا تھا جب تیری پھوپھی میرے پاس تجھے لائی تھی۔ تیرا باپ تجھے چھوڑ گیا تھا، اس کا نام......"

چاچا نے اٹکتے ہوئے، جھجکتے ہوئے ساری داستان اسے سنادی تھی۔ چاند عرف سید صاحب کے بارے میں، نائلہ اور جھمکا کے بارے میں، ترنم کے بارے میں، وہ سب کچھ جو انہیں معلوم تھا اور وہ جو جھمکا نے انہیں بتایا تھا۔ ان سے کہا تھا، وہ سب انہوں نے شاہ میر سے کہہ دیا، جس کا چہرہ کچھ کا کچھ اور ہی ہو گیا تھا۔

چاچا نے اس کا متغیر چہرہ دیکھا اور پھر نگاہیں چرالیں۔

"دیکھ پتر! میں سمجھ سکتا ہوں کہ یہ تیری زندگی کا بہت مشکل مرحلہ ہے۔ تو ہمت اور حوصلے سے کام لے اور ہو سکے تو اعلا ظرفی سے بھی۔" وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئے۔

"اچھی طرح سوچ سمجھ لے، تیرا فیصلہ کچھ بھی ہو۔ چاچا تیرے ساتھ ہے اور رہے گا۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر شاہ میر کے کندھے پہ تھپکی دی۔ اس نے چاچا کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں کسی زخمی پرندے کی سی کیفیت تھی۔ تکلیف، بے بسی، درد۔

"زندگی ایسی بھی ہوتی ہے بچہ! یہ مہربان ہو نہ ہو۔ جو مہربانی انسان دوسرے انسان کے ساتھ کر سکتا ہے، وہ کرلے۔" چاچا نے اس کی نظروں میں لکھا سوال پڑھ لیا تھا۔

☆☆☆

فیصلہ کرنا تھا انہیں اور جلدی کرنا تھا مگر جو سزا وہ اپنے لیے تجویز کر رہے تھے، اس پر عمل کا سوچ کر ہی دل ڈوب رہا تھا۔ سزا کوئی بھی ہو، آسان نہیں ہوتی۔ خود ہی مجرم تھے، خود ہی مصنف بنے اپنے لیے سزا تجویز کر رہے تھے۔ جب دروازے پہ دستک ہوئی۔

عارف اور فروا تو کچھ دیر پہلے ہی نکلے تھے۔ اتنی جلدی واپس نہیں آسکتے تھے پھر کون ہے اس وقت؟ انہوں نے دروازہ کھول دیا اور شاہ میر کو کھڑا دیکھ کر ساکت ہو گئے۔

"آپ نے واسکٹ کا بتایا تھا کہ وہ تنگ ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ سے لے کر ٹھیک کر دوں۔" اس لیے چلا آیا۔ اندر آکر بیٹھتے ہوئے شاہ میر نے اپنی آمد کا مدعا بیان کیا۔

"اچھا......وہ......ہاں، اسے ٹھیک کر دینا، مہربانی ہوگی۔" انہیں ٹھیک سے یاد بھی نہیں آرہا تھا کہ اس دن کیا بہانا بنایا تھا۔

"آپ اکیلے ہیں گھر میں؟" شاہ میر نے گھر میں چھائی ہوئی خاموشی اور سناٹے کو محسوس کیا اور ان کی آنکھوں کی نمی کو بھی۔

"بچے باہر گئے ہوئے ہیں گھومنے پھرنے۔ تو بس اس لیے میں اکیلا ہوں۔" بے ربط بولتے ہوئے زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

کچھ دیر کے لیے دونوں کے مابین خاموشی چھا گئی، ایک معنی خیز چپ جسے شاید دونوں ہی محسوس کر رہے تھے۔

"آپ اس روز مجھ سے ملنے آئے تھے پھر ملے کیوں نہیں؟" شاہ میر نے ان کے سامنے کھڑے ہو کر نرم لہجے میں پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

"میں آیا تھا مگر......میں تو معافی کے بھی قابل نہیں ہوں۔" وہ بے آواز چلا اٹھے۔

ان میں اتنی ہمت اور سکت بھی نہیں تھی کہ نظر اٹھا کر اس لمبے چوڑے دل نواز اور دل آویز وجود کو دیکھ سکتے جسے وہ اپنی نفرت اور ملامت کا نشانہ بنا کر چھوڑ گئے تھے اور وہ بچہ آج بڑا ہو کر ان کے گناہوں پہ ملامت کرنے اور مصلوب کرنے نہیں آیا تھا۔

شاہ میر نے ایک بوڑھے ہوتے ہوئے کمزور اور نادم شخص کو معاف کر دیا تھا۔ ان کے گلے لگ کر وہ یقین

دلا رہا تھا کہ اس نے مڑ مڑ کر ماضی کو دیکھنے کے بجائے حال اور مستقبل میں جینے کا فیصلہ کیا ہے۔

☆☆☆

سارا اہتمام اور انتظام رشنا آنٹی نے اپنے گھر پر ہی کیا تھا۔ رشتے کی بات انہوں ہی شروع کی تھی۔ اس لیے لڑکے اور لڑکی کی ملاقات اپنا اخلاقی فریضہ سمجھ کر اپنے ہی گھر پہ رکھی۔

مدثر احمد کو والد صاحب اپنے ہمراہ خود یوں لے کر آئے جیسے کسی چھوٹے بچے کو والدین پہلے دن اسکول چھوڑنے جاتے ہیں مگر مانی کے لیے تو آج امتحان کا دن تھا۔ زندگی کا سب سے بڑا امتحان، محبت نہ جانے کتنے اور کیسے امتحان لیتی ہے۔ ہر ہر قدم اور موڑ پہ اسے اندازہ ہو رہا تھا۔

''بہت ہی اوڈ لگ رہا ہے، اس طرح آنا اور جانا۔'' رشنا آنٹی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا وہ ابو جان سے مخاطب تھا۔

''ناشکرے مت بنو صاحب زادے! لوگ تو ایسے مواقع ڈھونڈتے ہیں، تمنا کرتے ہیں۔'' ابو جان نے اعتراض کو ہوا میں اڑا دیا۔

''مانی بیٹا! اوپر چلے جاؤ۔'' رشنا آنٹی نے اسے مخاطب کیا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر لاؤنج میں پہنچا تو محترمہ سامنے ہی کھڑی تھیں۔ دریچے کے آگے باہر کا منظر شاید زیادہ دلچسپ، حیرت انگیز اور خوب صورت تھا۔ مانی کی جانب ایک نسوانی پشت تھی۔

''میں بس کھڑے کھڑے دو باتیں کہنا چاہتا ہوں، آپ بے شک یوں ہی سن لیں۔'' مانی نے بغیر کسی تمہید کے اس وجود کو مخاطب کیا۔ جسے دیکھتے ہوئے اسے شدت سے کسی اور کا خیال آیا تھا۔

اس نے شاید مدثر احمد کی پیش کش کا فائدہ اٹھایا اور یوں ہی کھڑی دریچے سے باہر جھانکتی رہی۔ مڑ کر دیکھنے کی یا آنے والے کو مخاطب کرنے کی زحمت قطعی نہیں کی گئی۔

''میں یہاں آنا نہیں چاہتا تھا مگر بس...... پیرنٹس کبھی کبھی بہت مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کی بات کا بھرم رکھنے کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا مگر...... مجھے بس یہ کہنا ہے کہ میرا راستہ اور ہم سفر کوئی اور ہے۔ میں ایک اسیر فرد ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ بہت اچھی اور قابل لڑکی ہیں۔ خدا کرے کہ آپ کو وہ ہم سفر ملے جو آپ ڈیزرو کرتی ہیں۔ یقین مانیں، میں کسی طور آپ کے قابل نہیں۔ آپ کو جو زحمت ہوئی، اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

مانی نے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو ابھی یہاں کھڑے کھڑے اس کے ذہن میں آیا، گھر سے یہاں تک راستے میں وہ بہت کچھ سوچتا رہا، الجھتا رہا مگر کچھ باقاعدہ اور مربوط نہ سوچ سکا یہاں سیڑھیاں چڑھتے وقت یکا یک ہی اس کے دماغ نے کلک کیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے، اس کی محبت وقتی تھی نہ ہی جذباتی۔ عائشہ کا مقام اس کی زندگی میں کیا ہے، اسے اچھی طرح ادراک ہو گیا تھا۔

''آئی ایم سوری اگین۔'' مانی نے ایک بار پھر معذرتی کلمات دہرائے اور واپسی کے لیے مڑا۔

''آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں آپ کس کے اسیر ہیں؟'' سوال مختصر تھا۔ آواز دھیمی پھر بھی...... وہ یوں مڑا جیسے کرنٹ لگا ہو۔

''تم......؟'' مدثر احمد کی بے یقین اور حیرت زدہ نگاہیں سامنے کھڑی عائشہ کے وجود پر جم گئیں۔

☆☆☆

میز پہ رکھے کھانے پینے کے سب لوازمات ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ شاہ میر نے بولنا شروع کیا تو بس دھیرے دھیرے بولتا ہی رہا۔ ماریہ کی آنکھیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اسے کچھ کھانا یاد رہا نہ پینا۔

''ایسے لگ رہا ہے جیسے کوئی ڈرامہ یا کسی ڈائجسٹ کا ناول سن رہی ہوں۔'' ماریہ نے جھرجھری لی۔

''کہانی نہیں ہے، حقیقت ہے۔اسی لیے تلخ بھی ہے۔''

''تو تم نے سب کو معاف کر دیا اور تم اپنی بہن اور آنٹی کو لے کر اسلام آباد جا رہے ہو؟ تم مجھے بھی چھوڑ کر جا رہے ہو؟'' اس نے منہ پھلایا۔

''اسی لیے تمہیں سب کچھ بتایا ہے تاکہ تم میری بات کو اور مجبوری کو سمجھ سکو۔''

''اور تمہیں یہاں سے جانے دوں، بالکل بھی نہ روکوں؟'' ماریہ نے اس کی بات کاٹی۔

''میں تمہیں بالکل اکیلا نہیں چھوڑ دیا۔ دو کاریگروں کا بندوبست کر کے جا رہا ہوں۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں رابطے رکھنا کوئی اتنا مشکل نہیں، کام کے حوالے سے کوئی بھی مسئلہ تم شیئر کر سکتی ہو پھر میں ہر مہینے چکر بھی تو لگاؤں گا۔ یہاں ابو ہیں میرے، بھائی، بھابھی ہیں۔'' شاہ میر نے خود سے وابستہ رشتوں کا ذکر بالکل ایسے ہی نارمل انداز میں کیا، جیسے وہ سب ہمیشہ سے ہی اس کے پاس تھے

''تم کو تو فلمی انداز میں اپنے سارے بچھڑے رشتے مل گئے اور وہ ملک صاحب مل گئے' میرا اتنا اچھا دوست اور پارٹنر مجھ سے جدا ہو گیا۔ بالکل بھی اچھی کہانی نہیں ہے یہ۔'' ماریہ کا منہ ہنوز پھولا ہوا ہی تھا۔

''پتا بھی ہے، کتنا مس کروں گی تمہیں؟'' اپنے مخصوص لاپروا اور مگن انداز میں وہ بغیر لاگ لپیٹ کے کہہ رہی تھی۔

''معلوم ہے مجھے، میری جگہ کوئی بلی، کبوتر، طوطا ہوتا تو اسے بھی اسی طرح ''مس'' کرتیں۔'' شاہ میر مبہم سا مسکرایا پھر اسے کچھ یاد آیا۔

''میرا کام یاد ہے نا؟''

''کون سا وہ بچوں والا، ہاں میں وزٹ کرلوں گی وہاں کا۔ مہینے میں تین چار بار، جیسے تم کرتے تھے، بس تم بے فکر ہو جاؤ۔''

ماریہ نے اسے یقین دلایا۔ وہ یتیم خانے کے بچوں کی طرف سے بہت فکر مند تھا جو شاہ میر سے بہت مانوس تھے۔ یہ ذمہ داری وہ ماریہ کو سونپ کر جا رہا تھا۔ اب تو وہ ماریہ سے بھی مانوس ہو گئے تھے۔

اور اگر امی جان تک یہ داستان پہنچی تو یقیناً قیامت ہی آ جائے گی۔

ماریہ کو خیال آیا مگر اگلے ہی لمحے اس نے اپنی توجہ ٹیبل پہ رکھے لوازمات کی طرف کی۔ کچھ تو کھاؤ۔ بل پے کرنا ہے ان سب کا۔'' ایک نگٹس اٹھا کر اس نے منہ میں رکھا۔

☆☆☆

اپنی خوش بختی پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ صحرا میں آبلہ پا چلتے چلتے اچانک سامنے نخلستان آ جائے تو کچھ دیر اپنی ہی آنکھوں پہ یقین نہیں آتا۔ جھمکا کو بھی اعتبار نہیں ہو رہا تھا کہ شاہ میر صرف اپنی بہن ہی نہیں بلکہ خود اس کی ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہے اور اس نے کیا کہا تھا؟ شاہ میر کے الفاظ، جھمکا کے دل پر نقش ہو گئے تھے۔

''میں کوئی احسان نہیں کر رہا آپ پر...... یہ اس غلطی کا کفارہ ہے جو والد صاحب سے سرزد ہوئی تھی اگر وہ برسوں پہلے آپ کے اور نانی کے محافظ بن جاتے تو شاید یہ سب نہ ہوتا جو ہوا ہے۔ میں اس غلطی اور اس کہانی کو دوبارہ نہیں دہرانا چاہتا اور احسان تو آپ نے کیا ہے مجھ پر۔ مجھے ایک اچھے انسان کے سپرد کیا، وگرنہ میں آج جمال کی طرح کا کوئی انسان بن سکتا تھا۔''

شاہ میر کے چند الفاظ نے جھمکا کو پاتال سے اٹھا کر آسمان پر بٹھا دیا تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں معتبر ہو گئی تھی۔ شاہ میر نے اسے خود سے وابستہ رشتے کے حوالے سے مان دیا، اعتبار دیا، عزت دی اور بھلا اسے کیا چاہیے تھا؟ آج اسے ساری دنیا، سارے لوگ، سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ کالا، سوکھا چرخ شمسو بھی، جسے اپنے

ہاتھوں سے مٹھائی کھلائی تھی۔

☆☆☆

"میرے بیٹے! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے خود سے پیار کرنے والوں کو چھوڑ کر اپنے لیے ایک الگ جنت بنانے کی کوشش کی تھی مگر وہ میرے لیے دوزخ بن گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ اس آگ کی ذرا سی بھی آنچ تم تک پہنچے۔ اسی لیے اپنی زندگی یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا، یہی سب سے بڑا احسان ہوگا۔"

دوسرا خط اظہار صاحب کے نام تھا جو نسبتاً طویل تھا۔ کیونکہ اس میں ان کی پوری زندگی، پوری کہانی موجود تھی۔ اس خط کی شروعات ان الفاظ سے ہوتی تھی۔

"میری ماں مجھے پیار سے چاند بابو کہتی تھی......"

اور خط کے اختتام میں انہوں نے لکھا تھا۔

"میرے گناہوں اور غلطیوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیجیے گا ورنہ جو سزا میں نے اپنے لیے منتخب کی ہے اس کی اذیت دوہری ہو جائے گی۔"

اظہار صاحب نے خط پڑھ کر عالیہ بیگم کے حوالے کر دیا۔ وہ خود تو گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے اور عالیہ بیگم نے اسے پڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ ان کے چہرے پہ جیسے زلزلے کے آثار تھے۔

"یہ...... یہ سب......" انہوں نے اپنے شوہر کو مخاطب کیا۔ وہ بس پھٹ پڑنے والی تھیں مگر اظہار صاحب نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

"بس عالیہ بیگم! جو کچھ پڑھا اور جانا ہے، اسے خاموشی سے پی جائیے۔ آپ کسی سے کچھ نہیں کہیں گی اور عارف اور فروا سے تو بالکل نہیں۔ وہ دونوں اپنے گھر خوش ہیں، انہیں ہنستا بستا رہنے دیجیے۔"

اظہار صاحب کے لب و لہجے میں قطعیت اور سختی تھی۔ عالیہ بیگم جہاں کی تہاں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔

☆☆☆

ماریہ کے ہوتے ہوئے اس کی کیا جرأت کہ کسی اور ڈیزائنر کا جوڑا پہنتا۔ لہٰذا اپنی بہن کا ڈیزائن کیا ہوا شلوار قمیص اور واسکٹ پہن کر معمول سے ذرا زیادہ ہینڈسم لگ رہا تھا اور جب وہاں پہنچے جہاں پہنچنا تھا تو سب کے ساتھ ساتھ ذوہیب نے بہت گرم جوشی سے استقبال کرتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا۔

"ہمیں دعائیں دیجیے صاحب! ہمارے دل نے عائشہ کو ان نظروں سے نہیں دیکھا جن سے آپ دیکھتے تھے ورنہ آج تو ایک دوست کے بجائے اپنے رقیب سے مل رہے ہوتے۔" ذوہیب کی ہنسی بڑی خوب صورت مگر شرارتی تھی۔

"اور اس سازش میں کون کون شریک تھا؟" مانی نے اپنی مسکراہٹ بالکل بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"سب سے پہلے یہ محترمہ جنہوں نے مجھے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ ان کے دل اور زندگی میں آپ کے علاوہ کسی اور کی گنجائش نہیں اور پھر جب علیزے کے لیے آپ کا نام لیا جانے لگا تو ماما بدولت بالکل ہی میدان میں آ گئے۔ انکل اظہار کو راز دار بنایا۔ علیزے کو ہم راز بنایا اور اس کی جگہ عائشہ سے تمہاری ملاقات کروادی۔" ذوہیب بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بیان کر رہا تھا۔

"وہ بھی کوئی ملاقات تھی؟ محترمہ پانچ منٹ اور پانچ ڈائیلاگز کے بعد ہی نیچے بھاگ لی تھیں۔" مانی کی حسرتوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔

”اب کیا مشکل ہے، نکاح ہو رہا ہے آج۔ سارے جملہ حقوق تمہارے نام ہو رہے ہیں۔ جتنے چاہو ڈائیلاگز بولنا۔“

”ویسے ایک بات ہے یار۔“ مانی کو چپکے چپکے مسکراتا دیکھ کر ذوہیب گویا ہوا۔

”کیا؟“

”کہتے ہیں، محبت حسین ہوتی ہے اور محبت کی کہانی حسین ترین۔ اس حسین ترین کہانی کا اصل ہیرو میں ہوں۔“ ذوہیب نے کالر اکڑایا۔

”ہرگز نہیں۔ کہانی کا ہیرو میں ہوں۔ محبت میں نے کی اور اس محبت میں خوار بھی بہت ہوا۔ تم ہیرو کے دوست ہو فقط۔“

”ہیرو کا نہیں، ہیروئن کا۔ پہلے مدد اسی نے مانگی تھی۔“

”ٹھیک ہے یار! تم اس کہانی کا سب سے عظیم کردار ہو۔ اب مجھے وہاں بیٹھنے کی اجازت ملے گی۔“ مانی نے بیچارگی سے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں وہ دشمن جاں سر جھکائے بیٹھی تھی اور بلا کی خوب صورت لگ رہی تھی۔

”اتنے انتظار اور کٹھنائیوں کے بعد یہ موقع آیا ہے۔ اب رخصتی کے لیے جانے کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔“ مانی بڑی بے چارگی سے جھک کر عائشہ سے پوچھ رہا تھا اور اس کی شرمیلی ہنسی کی کھنک بتا رہی تھی کہ وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔

☆☆☆

عارف پاگلوں کی طرح اپنے باپ کو ڈھونڈ رہا تھا مگر ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نگل گیا ہو۔ اسپتال اور مردہ خانوں سے لے کر چھوٹے بڑے ہوٹلوں تک، محلے کے دو چار دوستوں اور احباب سے بھی پوچھا۔ سب جگہ تلاش کر چکا تھا مگر ہر جگہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

”کہاں چلے گئے، کہاں جا سکتے ہیں؟“

قیاس کے گھوڑے دوڑا کر اندازے لگا لگا کر وہ اولڈ ہومز اور دارالامان جیسی جگہیں بھی دیکھ آیا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ شاہ میر نے بھی انہیں ڈھونڈنے میں زمین آسمان ایک کر دیے مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اسلام آباد روانگی قریب تھی۔ ادھر یہ نا گہانی۔

دونوں بھائیوں کی طرح جھمکا اور نائلہ بھی بہت پریشان تھیں۔

عارف کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دو روز قبل وہ جس اولڈ ہوم میں ان کی تصویر دکھا کر پوچھ رہا تھا اور انکار پر مایوسی کے عالم میں واپس آیا ہے، وہ وہیں ہیں۔ انہوں نے انچارج کی منتیں کیں، انہوں نے کہا کہ انہیں پوچھنے اگر کوئی آئے تو بالکل کچھ نہ بتائیں، انکار کر دیں۔

”مگر کیوں بڑے صاحب! اگر کوئی لڑائی جھگڑا ہے تو مل بیٹھ کر صلح صفائی کی بات کر لیتے ہیں۔ ایسی کیا بات ہے جو آپ اتنی سختی اور شدت سے انکار کر رہے ہیں۔“ انچارج حیران ہوا۔

”کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہے، دراصل یہ میری سزا ہے جو میں نے اپنے لیے خود تجویز کی ہے۔ اس سزا کو کاٹنے میں آپ میری مدد کریں۔ خدا کے واسطے کسی کو مت بتائیے گا میرے بارے میں۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”ٹھیک ہے بڑے صاحب! جیسے آپ کی مرضی۔“

انچارج ایک گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹ گیا۔ جہاں وہ سر جھکائے بیٹھے سوچ رہے تھے کہ جس شخص

نے اپنی ماں کو اپنے وجود سے، اپنے لمس سے، اپنی محبت سے محروم کر دیا ہو، اسے بھلا کیا حق ہے کہ وہ اپنی اولاد کی توجہ، محبت اور خوشیاں سمیٹے۔ اگرچہ انہیں تکلیف ہو رہی تھی۔ بہت اذیت محسوس ہو رہی تھی مگر ان کے اندر سے کوئی کہتا تھا۔ تمہاری ماں بھی یوں ہی تڑپی ہوگی تم سے دور رہ کے۔

اور دوسری طرف انچارج سوچ رہا تھا کہ اب اگر ان بڑے صاحب کو ڈھونڈنے کوئی آیا تو وہ ضرور بتا دے گا۔

☆☆☆

پہلی بار وہ اپنا استحقاق استعمال کر کے نگاہیں جمائے ہوئے تھا، اس کے صبیح رنگ چہرے پر، جس پر نہ جانے شفق کے کتنے رنگ باری باری پھوٹ رہے تھے۔ خود کو اور آنچل کو سمیٹنے میں وہ ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔

"تو پھر...... کیا تمہیں یقین تھا؟" ساحل پہ پڑے بڑے بڑے پتھروں میں سے ایک پر وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ مانی تو کسی اعلا سے ہوٹل یا ریسٹورنٹ کی خواب ناک فضا میں اس کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ کھانے پینے کا شغل بھی ساتھ ساتھ چلتا مگر عائشہ بی بی کو سمندر، ساحل، ہوا، ریت اور لہروں کا تال میل یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ سو اس کی فرمائش پر وہ اپنی منکوحہ کے ساتھ پہلی بار سمندر کنارے آیا تھا اور اب یہاں بیٹھ کر کوئی رومانوی ڈائیلاگ جھاڑنے کے بجائے کسی صحافی کی طرح سوال کر رہا تھا۔

"کبھی کبھی مایوسی ہوتی تھی مگر زیادہ تر یقین تھا۔"

"تمہارا دل سادہ اور معصوم ہے۔ اسی لیے تمہارا یقین پختہ ہے۔ میں تو بس پنڈولم کی طرح ادھر اور اُدھر جھولتا رہتا تھا۔ کبھی یقین، کبھی بے یقینی۔" مانی مسکرایا۔ چمکتی دھوپ میں اس کی مسکراہٹ اور بھی اجلی لگی۔

"آگے چل کر آپ کے دل میں شک آ گیا تھا۔" عائشہ نے دھیمی آواز میں شکوہ کیا۔

"مجھے لگا شاید ذوہیب...... دیکھو، میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو وہ بھی ایسے ہی سوچتا شاید...... مگر تم پلیز مجھے شرمندہ مت کرو۔ میں پہلے ہی ان سب باتوں پہ اتنا شرمندہ ہو چکا ہوں۔"

"چلیں چھوڑیں، کوئی اور بات کریں۔" عائشہ کو شاید اس پہ ترس آ گیا تھا۔

"تمہارے سامنے تو تمہاری ہی بات ہو سکتی ہے، کوئی اور بات کیا کروں؟" مانی نے ایک گہری سانس لی۔ عائشہ کا نرم و نازک، حنائی ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

"کاش میں شاعر ہوتا یا ادیب، خوب صورت لفظوں میں اپنے دل کی بات کہنے کا ہنر جانتا ہوتا۔ میں بتاتا کہ تمہارے بارے میں کیا سوچتا ہوں۔ کیسے تمہیں چاہتا ہوں۔ میرے پاس خوب صورت الفاظ نہیں ہیں۔"

"محبت خود ہی بہت خوب صورت ہوتی ہے۔ وہ محتاج نہیں ہوتی نہ حسین لفظوں کی، نہ لمبے چوڑے اظہار کی۔ کبھی تو بس ایک نگاہ بھی کافی ہوتی ہے۔" عائشہ کی جھکتی اٹھتی پلکیں مانی کی نگاہوں سے الجھ رہی تھیں۔

"یار! تم تو بہت اچھا بولتی ہو، کچھ اور کہو۔"

مانی نے یوں فرمائش کی جیسے مشاعرے میں کسی شاعر کی خوب صورت غزل سن کر سامعین دوسری غزل کی فرمائش کرتے ہیں۔

"کچھ اور کیا کہوں؟" عائشہ نے جھاگ جھاگ سمندر اور بے قابو لہروں پہ نظر دوڑائی۔

"کچھ بھی...... اس سمندر پہ، ہوا پہ، زمین آسمان، سورج چاند ستارے، ہماری محبت...... کسی پر بھی کچھ بھی کہو۔" مانی کے دل کی طرح آواز میں بھی ترنگ تھی۔

عائشہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر گویا ہوئی۔

"اور کچھ یہ کہ ہر دل میں ایک شہرِ تمنا ہوتا ہے، وہ دل خوش نصیب ہوتا ہے۔ جہاں یہ شہر آباد ہو جاتے ہیں۔"

☆

شازیہ جمال طارق



شکایت

''مجھے تم سے سخت شکایت ہے روحینہ! تم کبھی مجھے خوش نہیں رہنے دوگی۔ میری ہنستی مسکراتی زندگی میں آگ لگانا چھوڑ دو خدا کے لیے......''

روحینہ نے حیرت اور صدمے کی زیادتی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا۔ وہ جو بھابھی بننے سے پہلے اس کی بہترین دوست ہوا کرتی تھی۔ آج سراپا شکایت بنی اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ روحینہ کے چہرے پر پھیلی پژمردگی میں کئی گنا اضافہ ہوا تھا۔ اس کی ویران آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ خشک لبوں پر زبان پھیرتے اس نے پوچھا۔

''میں؟ جس کی اپنی زندگی میں دکھ ہی دکھ ہوں وہ بھلا کسی کو کیا دکھ دے گی۔ جو خود خوشیوں کے لیے ترسی ہوئی ہو، وہ کیا کسی کی خوشیوں کو برباد کرے گی؟''

''اسی بات کا ہی تو دکھ ہے۔ تمہیں اپنی زیادتی کا احساس تک نہیں۔''

''ایسا مت کہو۔ تمہیں مجھ پر ذرا ترس نہیں آتا؟''

''نہیں، مجھے تم پر غصہ آتا ہے۔''

روحینہ سن سی رہ گئی۔

☆☆☆

''کیا ہوا ہے میری بچی؟ تم ٹھیک تو ہونا؟''

پھپھو کی پریشان آواز سن کر آس کے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے قدم تھم گئے تھے۔ وہ یقیناً فون پر روحینہ سے بات کر رہی تھیں۔ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی۔ تین بھائیوں کی نازک اندام بہن۔

''تم فکر مت کرو۔ میں بس ابھی کے ابھی آرہی ہوں۔'' جلدی سے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے انہوں نے الماری کھول کر اپنا دوپٹہ نکالا۔

''کیا ہوا پھپھو؟ سب خیریت تو ہے نا؟'' آس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''روحینہ کا فون تھا، کہہ رہی تھی، رات سے طبیعت بہت خراب ہے۔ کچھ کھایا پیا نہیں جارہا۔ بچوں نے الگ سر میں درد کر رکھا ہے۔ اپنے حصے کا کام نہ کرنے پر ساس، جٹھانی نے منہ بنایا ہوا ہے۔ ہائے میری روحینہ! کن ظالموں کے چنگل میں پھنسا دیا تجھے تیرے ابا نے۔''

پھپھو نے ہمیشہ کا رونا رویا۔ آس نے شکر کیا کہ اس وقت پھوپھا ناشتہ کر کے گھر سے نکل گئے تھے۔ ورنہ ان کے کانوں تک بیوی کا طعنہ پہنچتا تو پھر ایک نیا دنگل شروع ہو جاتا۔ پھپھو کو روحینہ کے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے آس کو گھر کا خیال رکھنے کی تاکید کرتی، چادر اوڑھ کر چلی گئیں۔

آس گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔ بیٹی کی خراب طبیعت کا سن کر پھپھو ہاتھ پاؤں پھلائے یہ بھول گئیں کہ آج انہوں نے آس کے ساتھ مل کر ہفتہ بھر کے میلے کپڑے دھونے کا کہا تھا۔ جو یقیناً اب آس کو اکیلے ہی دھونے تھے۔

وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ پھپھو کے جاتے ہی وہ کاموں میں جت گئی۔ برتنوں کی دھلائی سے فارغ ہوتے ہی مشین لگالی۔ ساتھ ساتھ صفائی اور ڈسٹنگ بھی کرتی رہی۔

چھت پر گیلے کپڑے نچوڑ کر جھٹک جھٹک کر تار پر پھیلانے کے بعد نیچے اتر کر ابھی کمر سیدھی کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نظر گیلے بال ماتھے پر بکھیرے، ریموٹ سے چینل سرچنگ کرتے اسرار (دیور) پر پڑی جو ''آس بھابھی'' کے ہاتھ سے بنے تگڑے سے ناشتے کا منتظر تھا۔ اس کی صبح روزانہ بارہ بجے ہی ہوتی تھی۔

آس کچن میں جا کر اس کے لیے ناشتہ تیار کرنے لگی۔ اسرار سے سال بھر چھوٹا اقرار کالج جاتے ہوئے بریانی کی فرمائش کرنا نہیں بھولا تھا۔

آس کا دل چاہا، سارے کام چھوڑ کر اپنے ننھے

''عزین'' کو گود میں اٹھا کر ڈھیر سارا پیار کرے۔ جو نیند سے اٹھ کر کسمساتے ہوئے ماں کو ایک کے بعد ایک کام نبٹاتے معصومیت سے تک رہا تھا اسے فیڈ کروانے کے بعد اس نے پھر سے کاٹ میں لٹا دیا تھا۔
کھانے کے بعد پھپھا کو الائچی والی چائے بنا کر دی۔ اظہار کی واپسی کا ٹائم ہو رہا تھا۔ ساری تھکان پس پشت ڈالتے اس نے نہا کر کپڑے بدلے، ہلکی نمی لیے بالوں کو سلجھا کر پشت پر ڈالا اور لپ اسٹک اٹھالی۔
عقب میں آتے اظہار کا آئینے میں ابھرتا عکس دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے پلٹی تھی۔
''جانتی ہو، تمہاری یہ ایک مسکراہٹ میرے دن بھر کی ساری تھکاوٹ اتار دیتی ہے۔'' اظہار نے محبت



سے اسے دیکھا جس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لبوں پر مسکراہٹ کی سنہری تتلیاں ہمیشہ رقصاں رہتیں۔

''اور آپ کی یہ توصیفی نگاہ مجھے ہر بار میری اپنی ہی نظروں میں معتبر کردیتی ہے۔''

باہر سے پھپھو اس کو آواز دے رہی تھیں۔ وہ اپنے کندھوں پر رکھے اظہار کے ہاتھ نرمی سے ہٹاتی باہر نکلی۔

''آپ آ گئیں پھپھو! کیسی طبیعت ہے روحینہ کی؟''

''اے ہٹو، میں سارا گھر تمہارے حوالے اس لیے نہیں کر کے گئی تھی کہ تم سج سنور کر سر شام ہی میاں کے ساتھ کمرے میں گھس کر بیٹھ جاؤ۔ ایک میری روحینہ ہے جسے کنگھا تک کرنے کی فرصت نہیں۔''

آس نے لب کاٹے۔ پھپھو کا موڈ بہت خراب تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر دفعہ روحینہ کے گھر سے واپس آنے کے بعد ان کا مزاج برہم ہی ہوتا۔ آس کے ہر کام میں انہوں نے کیڑے نکالے۔

''اقرار کے بستر کی چادر کیوں نہیں دھوئی؟''

ڈھیر سارے دھلے ہوئے کپڑوں میں انہیں اقراء کی بیڈ شیٹ یاد آئی۔

''وہ ابھی اجلی تھی پھپھو! اس لیے نہیں دھوئی۔ ابھی دو تین دن پہلے ہی تو میں نے اسے سرف میں بھگو کر دھویا تھا۔''

''حد ہے بھئی! ایک کام بھی تم سے ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ بہت ہی کاہل لڑکی ہو۔ ایک میری روحینہ ہے سارا دن پھرکی کی طرح گھومتی رہتی ہے۔'' بات گھوم پھر کر پھر سے روحینہ پر ہی آ رکتی۔

''اور یہ بریانی میں مٹھی بھر مسالے کس خوشی میں جھونکے ہیں؟ غضب خدا کا معدے میں آگ سی لگی ہے۔ اگر پکانے کا موڈ نہیں ہوتا تو پہلے سے بتا دیا کرو۔ ہم روکھی سوکھی کھا کر گزارا کرلیں گے۔ نرا رزق کا ضیاع......''

''تو یہ طے ہے آج کی تاریخ میں پھپھو کو میرا ہر سیدھا کام بھی الٹا نظر آئے گا۔'' آس نے یاسیت سے سوچا۔

☆☆☆

صبح مطلع صاف تھا۔

گرجنے برسنے کے بعد پھپھو ایک دم ہلکی پھلکی ہوگئی تھیں۔ آس کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ روحینہ کے گھر کا از خود قصہ چھیڑ دیا کہ کیسے اس کی ساس، جٹھانی اور شادی شدہ نندوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا ہے۔

''سارا قصور اس کے میاں کا ہے۔ بیوی کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اللہ پوچھے تمہارے پھپھا سے، نجانے کیا سوچ کر میری نازوں پلی بیٹی کا ہاتھ ایسے ناقدرے لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا۔''

شومئی قسمت پھپھا اس وقت گھر پر ہی تھے اور پھپھو کا واویلا ان کی سماعتوں تک بخوبی پہنچ گیا۔

''واہ بیگم! کیا خوب پینترا بدلا ہے۔ اس وقت تو تم بھی ان ''ناقدرے'' لوگوں کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ سونپنے کے لیے مچل رہی تھیں۔ اب سارا الزام میرے سر کیوں؟'' کمر پر ہاتھ رکھے دھان پان سے پھپھا لڑاکا عورتوں کی طرح عین سامنے آ کھڑے ہوئے۔ ''تو مجھے کیا پتا تھا وہ کم بخت ایسے نکلیں گے۔''

''تو تمہارا کیا مطلب ہے میں نے سب کچھ جانتے بوجھتے اپنی بیٹی کو اس جہنم میں دھکیلا ہے؟'' آس نے جلدی سے غزین کو پھپھو کی گود سے اٹھا لیا۔ جو ٹکر ٹکر دادا، دادی کو ایک دوسرے پر غوری میزائل داغتے دیکھ رہا تھا۔

''جو ہو گیا سو ہو گیا۔ روحینہ دو بچوں کی ماں ہے۔ اسے اب اسی گھر میں ان ہی لوگوں کے ساتھ رہنا ہے۔ آپ لوگ تو لڑ جھگڑ کر اپنے گھر کا ماحول خراب نہ کریں۔ بندہ دو منٹ سکون سے بیٹھ بھی نہیں سکتا۔''

موبائل پر مصروف اسرار ماں باپ کی تکرار سے تنگ آ کر بڑبڑ کرتا اٹھ کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

آج روحینہ آئی تھی۔

فاخر کا ارادہ تو اسے اور بچوں کو گیٹ پر ہی اتار کر واپس جانے کا تھا۔ لیکن پھپھو بصد اصرار داماد کو اندر لے آئیں۔ کم وقت میں جتنی زیادہ سے زیادہ خاطر مدارت ہو سکتی تھی، کی لیکن داماد صاحب کلف لگے کپڑوں میں ماش کی دال کی طرح اینٹھے بیٹھے رہے۔

''دیکھا اماں! آپ نے۔ مجال ہے جو اس آدمی

کے ماتھے کے بل کبھی سیدھے ہوئے ہوں۔ ماں بہنوں سے تو ہنسی ٹھٹھول کرتے منہ نہیں دکھتا اس کا۔" فاخر کے جانے کے بعد اس نے پرانا دکھڑا رو دیا۔

مزاج کی تلخی تیکھی تو وہ شروع سے ہی تھی۔ لیکن شادی کے بعد تلخی اس کے مزاج کا مستقل حصہ بن گئی تھی۔ اپنے حلیے سے لاپروا، کوفت زدہ، ہر وقت جھنجلائی سی رہتی۔

پھپھو جوں جوں اس کے دکھڑے سنتی جا رہی تھیں، ان کا فشارِ خون بلند ہوتا جا رہا تھا۔ جو آخر میں ہائی بلڈ پریشر پر منتج ہونا تھا۔

آس نے روحینہ کو ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتوں میں لگانے کی بہتیری کوشش کی لیکن وہ غیر دلچسپی سے ہوں، ہاں کرنے کے بعد اب "جٹھانی نامہ" کھول کر بیٹھ گئی۔

"جادوگرنی ہے پوری۔ ایسا کوئی جادو کر رکھا ہے اس عورت نے فاخر پر جب بھی درمیان میں دیوار اٹھانے کی بات کرتی ہوں، جلتے توے پر جا بیٹھتا ہے۔ مجھ سے بات کرتے وقت انگارے چبانے والا "بھابھی" سے ایسے مسکرا مسکرا کر بات کرتا ہے گویا دنیا جہاں کی ساری خوش اخلاقی اسی ایک شخص پر ختم ہو۔"

کسی ناخوش گوار منظر کی یاد نے روحینہ کی آنکھوں میں مرچیں سی بھر دی تھیں آنسوؤں کا گولہ اندر اتارتے ہوئے گردن میں ایک گلٹی ڈوب کر ابھری تھی۔ پھپھو نے بہت دکھ سے اسے دیکھا تھا اور آس نے پھپھو کو۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔

اقرار اور اسرار اپنے دوستوں کے ساتھ شمالی علاقہ جات کی سیر کو نکل گئے۔ پھپھو نے اظہار کو آفس سے جلدی آنے کی تاکید کی تھی۔ آس نے غزین کو تیار کر کے پھپھو کی گود میں ڈالا اور خود تیار ہونے اپنے کمرے میں آ گئی۔ سرخ و سبز لان کے پرنٹڈ سوٹ پر نیٹ کا ہم رنگ دوپٹہ لیے۔ نفاست سے ترتیب دیے بالوں کو ایک سائیڈ پر ڈالا۔ کٹاؤ دار ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک کی تہہ جمائی۔ کلائیوں میں سرخ کانچ کی چوڑیوں نے جلترنگ سی بجا دی تھی۔ سیاہ کھسہ پہنتی وہ لاؤنج میں آ گئی۔

جہاں پھپھو اور اظہار اسی کے منتظر تھے۔

آج ان کی روحینہ کے ہاں دعوت تھی۔ اس کے ساس، سسر کی عمرے کی منظوری آ گئی تھی۔ اسی خوشی میں انہوں نے گھر میں دعوت رکھی تھی۔ جس میں اپنی دونوں شادی شدہ بیٹیوں، روحینہ کے میکے والوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ اظہار نے ماں کے سامنے کچھ کہنے سے بمشکل خود کو روکا تھا۔ البتہ سراہتی نگاہوں میں چھپا "پیغام" اس تک بخوبی پہنچ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے سر جھکا لیا۔

یہ منظر پھپھو کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا تھا۔ بغیر کچھ کہے انہوں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ وہاں پہنچ کر انہیں جھٹکا سا لگا۔

روحینہ کا وہی معمول والا حلیہ تھا۔ کئی بار کے پہنے ہوئے لان کے ٹوپیس پر کسی اور سوٹ کا دوپٹہ لاپروائی سے گلے میں ڈالے، جوڑے سے نکلتی گھنگھریالے بالوں کی لٹیں کان کے پیچھے اڑستی جٹھانی اور نندوں کے ساتھ دعوت کا انتظام کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے بیٹا! آج تو ڈھنگ سے تیار ہو جاتیں۔ باقی سب کو دیکھا ہے؟"

کھانے کے بعد موقع ملتے ہی پھپھو نے دبی آواز میں اسے سرزنش کی۔

"چھوڑیں اماں! جب دل مر جائے تو پھر کیا سجنا سنورنا۔ ویسے بھی کس کے لیے تیار ہوں، وہ جو مجھ پر ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنا گوارا نہیں کرتا۔" رندھے ہوئے لہجے میں وہ کڑھ کر بولی تھی۔

اسی وقت اس کا دو سال کا بیٹا پیچھے سے آ کر ٹانگوں سے لپٹ کر کسی چیز کے لیے ضد کرنے لگا۔ روحینہ نے غصے سے اسے تھپڑ دے مارا۔ وہ روتا ہوا دادی کی گود میں منہ چھپا کر سسکنے لگا۔ فاخر کی اپنے دونوں بچوں میں جان تھی۔ روحینہ کو سخت سست سناتے ہوئے بیٹے کو اٹھا کر باہر چلا گیا۔

اچھا خاصا ماحول مکدر ہو کر رہ گیا تھا۔

آتے وقت وہ لوگ جتنے پرجوش تھے جاتے وقت اتنے ہی خاموش۔

گھر آ کر اظہار تو فوراً اپنے کمرے میں چلا گیا۔ البتہ پھپھو جو سارا راستہ دل ہی دل میں جلتی

کڑھتی آئی تھیں، کسی معمولی بات پر بگڑتے ہوئے آس کو بری طرح بے عزت کرکے رکھ دیا۔

"کیا ضرورت تھی ان کے ہاں اتنا سج سنور کر جانے کی؟ مردوں سے ان کا گھر بھرا ہوا تھا۔ کیا سوچتے ہوں گے کہ ان کی ہاں کی عورتوں کو خودنمائی کا اس قدر شوق ہے۔ یہ بناؤ سنگھار اپنے میاں کے لیے ہی کرو تو بہتر ہوگا۔"

آس سرخ چہرہ لیے سنتی رہی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی پھپھو ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔

☆☆☆

"تمہیں مجھ پر غصہ آتا ہے؟"

روحینہ کے لبوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی تھی۔

"ہاں بہت، بہت زیادہ۔" آس نے براہ راست اس کی بے یقین آنکھوں میں جھانکا تھا۔

آس سے آج رہا نہیں گیا۔ آج جب ہمیشہ کی طرح اس نے میکے آکر رونا مچایا تو آس نے بہت ضبط سے پھپھو کے اپنے کمرے میں چلے جانے تک انتظار کیا تھا اور پھر پھٹ پڑی۔

"جانتی ہو، ایک ماں کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے؟ یہی کہ اس کی بیٹی اپنے گھر میں خوش رہے۔ کیونکہ اولاد کی خوشی میں ہی والدین کی خوشی اور سکون چھپا ہوتا ہے۔"

اور جن کی اولاد ناخوش ہو انہیں بے سکونی زندگی بھر چین نہیں لینے دیتی۔ تم اپنے گھر خوش نہیں ہو اس غم کو سینے سے لگائے پھپھو اندر ہی اندر گھلتی جا رہی ہیں۔ وہ اپنے اندر کی ساری بھڑاس مجھ پر نکالتی ہیں۔

زندگی پھولوں کی سیج کسی کے لیے بھی نہیں ہوتی روحینہ! اپنی اپنی راہ کے کانٹے چنتے سب ہی کی انگلیاں فگار ہوتی ہیں۔ تم یہ کیوں دیکھتی ہو کہ گلاس آدھا خالی ہے۔ یہ کیوں نہیں دیکھتیں کہ گلاس آدھا بھرا ہوا بھی تو ہے۔ کس چیز کی کمی ہے تمہیں گھر بار، بچے، کوئی معاشی مسئلہ نہیں اور جہاں تک بات ہے شوہر کی بے اعتنائی کی تو تم نے کبھی تنہائی میں اپنا تلخ لہجہ سنا ہے؟ آئینے میں کبھی خود کو غور سے دیکھا ہے؟

کون کہے گا، تم بیاہتا عورت ہو؟ ایسی ہوتی ہیں سہاگنیں؟ شوہر کو جب اپنی بیوی سے وہ نہیں ملتا جو وہ اپنی بیوی سے چاہتا ہے تو پھر کسی اور عورت میں تلاش کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ روز روز باہر کا کھانا وہی کھاتا ہے جیسے کبھی گھر میں اچھا کھانے کو نہ ملے۔

"تمہیں کیا لگتا ہے سسرال میں مسئلوں سے دوچار صرف تم ہی ہو۔ باقی سب کسی جنت میں رہ رہے ہیں؟ تمہاری ماں میری ساس ہے اور جب وہ بغیر کسی قصور کے مجھے بے نقط سناتی ہیں تو مجھے کتنا دکھ ہوتا ہے۔ لفظوں کے تیر سہنا آسان ہوتا ہے کیا؟

لیکن میں میکے ہمیشہ ہنستی مسکراتی جاتی ہوں کہ مجھے خوش اور مطمئن دیکھ کر میری ماں کا سیروں خون بڑھ جاتا ہے۔ اور تم کیا کر رہی ہو؟ اتنی تکلیف پھپھو مجھے نہیں دے رہیں جتنی تم اپنی ماں کو دیتی آ رہی ہو۔ خدا کے لیے رحم کھاؤ اپنی ماں پر۔"

آس بولتے بولتے جیسے تھک کر چپ ہوگئی تھی۔

روحینہ سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی اسے دیکھے گئی۔

"میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا، میں تو بس......" روحینہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔

یہ تصویر کا کون سا رخ تھا جو وہ آج اسے دکھا رہی تھی؟ خودساختہ مظلومیت کا حصار ٹوٹنے لگا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے جان لیا، وہ اپنا کتنا نقصان کر چکی ہے۔

"کتنی خودغرض ہوں میں، کبھی اپنی ماں کا سوچا ہی نہیں۔" آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔

"تم ٹھیک کہتی ہو آس! مجھے اب خود کو بدلنا ہوگا۔ اپنے لیے، اپنے پیاروں کے لیے، آئندہ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

بھیگی آنکھوں سے آج وہ پورے دل سے مسکرائی تھی۔ آس نے اسے گلے لگالیا۔

اور ادھ کھلے دروازے کے باہر کھڑی پھپھو کی آنکھیں تشکر سے بھیگتی جا رہی تھیں۔

☆

صدف ریحان گیلانی

عناد

''یہ لوبیسن کے لڈو سوجی کی پنجیری دیسی گھی کا۔''

''کیا مطلب ہے آپا۔ کیا یہ سارا راشن آپ میرے ساتھ بھیجیں گی؟ کتنی بار کہا ہے اتنا تردد مت کیا کریں۔ آپ اتنا وقت لگا کر یہ سب چیزیں تیار کرتی ہیں۔ اور ادھر میرے وہ چٹورے دوست سب کا سب منٹوں میں چٹ کر جاتے ہیں۔ مجھے تو آپ کی اس محنت کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ سب کچھ رکھیں ادھر ہی۔ میں کوئی گدھا ہوں جو اتنا وزن ان کمینوں کے لیے ڈھو کر لے جاؤں۔''

ایک دو تین ٹفن کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد پر وہ جلے دل کے پھپھولے ان کے سامنے پھوڑنے پر مجبور ہوا تھا۔ حسب توقع شمسہ آپا کا منہ کھلا پھر ہلکی سی سرخی رخساروں پر چھلکی۔

''نابندہ پوچھے، تم نے ان مسٹنڈوں کو اتنا سر پر ہی کیوں چڑھا رکھا ہے۔ ہاتھ ہی کیوں لگانے دیتے ہو ان کو۔ صاف منع کر دیا کرو۔ تمہارے پاس وہاں الماری ہے پھر تمہاری ماں کی نشانی بڑا سا رائٹرنک بھی تو ہے۔ اس میں رکھ کر تالا لگا دیا کرو۔ سارے سامان کو۔ یا پھر کہہ دیا کرو میرے میاں جی نے ان سب پر خاص دم کیا ہوا ہے۔ یہ کھاتے سے تم۔'' اس نے ان کی بات کاٹی۔

''الو بن جاؤ گے۔ سر کے بال اڑ جائیں گے۔ یا پھر دم نکل آئے گی؟ آپ کیا سمجھتی ہیں میں نے بچاؤ کا کوئی طریقہ نہیں کیا ہوگا۔ کوئی تدبیر نہیں لڑائی ہوگی؟ یقین مانیں، ایک سو ایک نسخے آزما چکا ہوں۔ اور سب کے سب بے کار رہے۔ ان کم بختوں کے آگے کیا دروازے، کیا تالے یوں کھل جاتے



مکمل ناول



ہیں۔ جیسے کوئی منتر ہوان کے پاس۔ وہ جو پچھلی بار آپ نے بادام کا شربت بنا کر دیا تھا ناں۔ وہ بس ایک ہی گلاس میرے نصیب کا تھا جو آپ کے ہاتھ سے یہاں پیا تھا۔ وہاں تو پہنچتے ہی بوتل ایسے خالی ہوئی تھی۔ جیسے ہمارا قومی خزانہ ہو۔"

"ہاہ۔۔ ہائے بڑے ہی کوئی بھوکے اور ندیدے ہیں تمہارے دوست۔ دے مجھے ان کی ماؤں کا فون نمبر میں ذرا کان کھینچوں ان کے۔ کیا وہ اپنے بچوں کو کچھ نہیں کھلاتیں پلاتیں۔ کچھ نہیں بنا کر دینے جوگی انہیں۔ تو تھوڑی تمیز ہی سکھلا دیتیں۔ جو وہ دوسروں کے بچوں کے بکسوں میں تو نہ گھستے پھرتے۔"

شمسہ جو اس سے عمر میں گیارہ برس بڑی ہوں گی اور جو میاں جی کی دوسری بیوی کا درجہ رکھنے کے علاوہ اس کی سوتیلی ماں کا رتبہ بھی رکھتی تھیں۔ اس کی اپنی ماں کب دنیا سے گئی۔ اسے یاد نہیں اس نے ہوش سنبھال کر انہیں اپنے آس پاس دیکھا تھا۔ میاں جی مسجد میں پیش امام تھے۔ ان کا سارا دن مسجد میں گزرتا تو شمسہ بچیوں کو گھر پر قرآن پاک پڑھایا کرتیں۔ ساری بچیاں انہیں آپا جی پکارتی تھیں۔ بس ان ہی کی دیکھا دیکھی وہ اس کی بھی آپا ہو گئیں۔

اتنے لاڈ تو کبھی میاں جی نے باپ ہو کر نہیں اٹھائے تھے جتنا کہ وہ اسے ہتھیلی کا چھالہ بنائے رکھتی تھیں۔ وہ تو اس کے بچپن میں اس کے برتن میں ٹھونگا مارنے والے کوے کو بھی اس کے گھونسلے تک پہنچا کر آیا کرتی تھیں۔ تو اب ان مفت خوروں پر کیسے نہ غصہ ہوتیں۔

"اوہو۔ اب چھوڑیں ان ساری باتوں کو۔ بس آنے ہی والی ہوگی۔ مجھے ابھی تیار بھی ہونا ہے۔ میرے کپڑے کہاں ہیں؟" وہ جان بچاتا لپک جھپک واش بیسن کی جانب دوڑ پڑا۔

"ہاہ۔۔ ہائے۔" شمسہ نے گھبرا کر یوں ماتھے پر ہاتھ مارا کہ مسجد سے واپس آتے میاں جی بوکھلا کر رہ گئے۔

"یا اللہ خیر۔۔ کیا ہوا ہے باذل کی ماں۔ سب ٹھیک ہے ناں؟" وہ تیز قدموں سے چلتے ان تک آئے تھے۔

"کہاں سب ٹھیک ہے۔ بس کے آنے میں کچھ ہی وقت رہ گیا ہے۔ اور میری مت دیکھیں رات باذل نے مجھے اپنے کپڑے دیے تھے استری کرنے کے لیے۔ جو میں بالکل ہی بھول گئی۔ ہائے میں نے تو سارا سامان بھی باندھ دیا۔ اوہو۔ کہاں رکھ دیے وہ کپڑے؟" انہوں نے سارا بیگ الٹ پلٹ کر ڈالا تھا۔ میاں جی نے گھور کر دیکھا۔

"حد ہو گئی۔ تم نے تو تراہ ہی نکال دیا تھا میرا۔ اب جلدی کرو۔ کہیں بس نہ نکال دینا۔ ویسے پتا ہے ناں یہ بھولنے کی بیماری کن لوگوں کو لگتی ہے؟" انہیں تو موقع مل گیا تھا چڑانے کا۔ اکثر کام بھولنے پر انہیں بوڑھے ہونے کا طعنہ دینے والی شمسہ آج خود بھول گئی تھیں۔ اور انہیں جلدی نہ ہوتی تو ضرور کرارا سا جواب دیتیں۔ وہ کپڑوں کے ڈھیر میں ہاتھ مار رہی تھیں۔ ادھر باذل خوب رگڑ رگڑ کر صابن ملنے کے بعد پانی سے منہ دھو رہا تھا اور یونہی آئینے میں دیکھتے نظر برابر والی منڈیر پر کہنی ٹکائے کھڑی اس لڑکی پر جا ٹھہری تھی۔ صبح کی اجلی کرنوں میں نہائی' سنہرا سا روپ لیے جس کے بے داغ چہرے پر اک الوہی سی مسکان تھی۔ جو دوسرے ہاتھ سے شمسہ آپا کو اشارے کر رہی تھی۔

انہوں نے اس کی ایک شرٹ اٹھائی۔ جس پر اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔ وہ شرٹ پھینک کر انہوں نے دوسری پکڑی۔ وہاں سے پھر انکار۔ تیسری شرٹ۔ اور وہ تار سے تولیہ کھینچتے ہوئے پلٹا۔

"مجھے روکنے کا دل چاہ رہا ہے تو صاف بتا دیں۔ یہ آنے بہانے وقت کیوں ضائع کر رہی ہیں۔" اس نے بھی صاف اسے سنایا تھا جو اس سے نظریں چار ہوتے ہی بوکھلا کر دیوار پر پھیلائے

کپڑے درست کرنے لگی تھی۔

وہ زیر لب مسکرا دیا۔ جانتا تھا آپا کا لاڈلا وہ ہے تو ان کی اک لاڈلی بھی تھی۔ بڑی خواہش تھی ان کی۔ اللہ نے بیٹھے بٹھائے بیٹا تو دے دیا تھا۔ کیا جاتا جو ایک بیٹی بھی دے دیتا۔ مگر دیوار پار رہنے والی اک من موہنی سی لڑکی میں انہیں اک پیاری سی سہیلی مل ہی گئی تھی۔ جس کا کوئی کام ان سے مشورہ کیے بنا نہیں ہوتا تھا تو ان کا بھی اس سے صلاح لیے بنا گزارا نہیں تھا۔ جو اس نے ابھی دیکھا تھا۔ ایسے مظاہرے دن بھر میں کم وبیش دسیوں بار پیش آیا کرتے ہیں یہاں۔

شمسہ آپا نے جلدی سے نشان دہی کی گئی شرٹ اٹھاتے کمرے کی راہ لی تھی۔ اس نے دیکھا، اب منڈیر پر صرف گیلے کپڑے رہ گئے تھے۔ وہ لب دبائے باقی چیزیں بیگ میں ڈالنے لگا۔

اور سامنے کی چھت پر کبوتروں کے کابک میں سر دیے سجاد کی بھنویں تن گئی تھیں۔

''ہونہہ۔ یہاں تو وہی قصہ ہے کہ صورت مومناں اور کرتوت کافراں۔ سارے زمانے کے سنگ یاریاں۔ کیسے دندیاں (ہنسی) نکل رہی تھیں۔ اور میرے ساتھ تو بات کرتے منہ ٹوٹتا ہے اور ہنستے تو خورے موت ہی پڑ جائے۔ کوئی گل نہیں شہزادیے دیکھ لوں گا تجھے بھی اب تو۔''

وہ یہ سب اشارے بازیاں ضرور باذل کے ساتھ ہی کر رہی ہے۔ اس کے بدبودار دماغ میں ایک یہی بات آسکتی تھی۔ اس نے مارے طیش کے معصوم سے کبوتر کو زور سے ہوا میں اچھالا تھا۔

☆☆☆

''بیڑا غرق۔ ستیاناس۔ مجھ سے تو بیر ہے ان کم بختوں کو۔ میرے ہاتھ لگاتے تو موت ہی پڑ جاتی ہے۔ کتنی بار کہا ہے اماں سے کہ مجھ سے یہ کام نہ کروایا کرو۔ نہیں اٹھائی جاتی مجھ سے یہ مصیبت۔ دم گھٹتا ہے میرا اس چولہے کے آگے۔ میری ایسی حسین آنکھیں کیا یہ دھواں پھانکنے کے لیے ہیں؟ مگر ناجی میری ماں نے بھی قسم کھائی ہے مجھ سے کسی جنم کا بدلہ لینے کی۔'' دھوئیں میں گھری بیٹھی دھواں دھار بولتی سائرہ جبیں کی برداشت اتنی ہی تھی۔ گھما کر پھونکنی بیچ صحن میں ماری۔ وہ تو کمرے سے نکلتا ارباز بروقت اچھل کر دور ہوا تھا۔ ورنہ کوئی بعید نہیں پھونکنی اس کا ٹخنہ سینک گئی ہوتی۔

''اتنا دھواں کھلا کر بیٹھی ہو۔ پھر بھی تمہارے جن نہیں نکلے آپا۔ ابھی میں لنگڑا ہو جاتا تو تم نے اس کو لے جا کر میری جگہ ٹیسٹ دینا تھا۔ حد ہو گئی ہے اک ذرا سا کام کیا کرنا پڑ گیا تم نے تو ویہڑے میں فائر ہی کھول دیے۔'' وہ کلس کر کہہ گیا تھا۔

''بکواس بند کر۔'' لکڑیوں نے تو آگ نہیں پکڑی تھی۔ لیکن وہ جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس کی دھاڑ پر اماں باہر آئی تھیں۔

''کسی بارات کے لیے ناشتا نہیں بنوانا تھا میں نے۔ اتنا ہی کہا تھا کہ اپنے اور ارباز کے لیے دو پراٹھے پکا لے۔ اسکول جانا ہے تم دونوں نے۔ اور تو نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔''

''ہاں تو کیا نہ اٹھاؤں۔ کتنی بار کہا ہے۔ نہیں ہوتا مجھ سے یہ فضول کام۔ اگر میرے ہاتھوں کا پکا کچھ کھانا ہی ہوتا ہے۔ تو گھر میں ایک سلنڈر ہی لے آؤ۔ صبح صبح بندہ عزت سے دو پراٹھے پکا لے۔ مگر ناجی۔ کنجوسی تو ختم ہے آپ ماں بیٹے پر۔ اور اسکول جاتا ہے تمہارا وہ باندر۔ یہ شہزادی تو اب کالج جاتی ہے کالج۔ کتنی بار بتاؤں اماں۔ کیوں بھول جاتی ہو ہر بار۔''

ہاتھ سے دھواں پرے کرتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سر پر دوپٹہ باندھے اماں کمرے سے نکل آئی تھیں تو چولہے تک بھی آ جائیں گی۔ اتنا اسے یقین تھا۔

''ہونہہ۔ کالج۔ پتا ہے مجھے۔ اور شرم تو نہیں آتی بکواس کرتے۔ تجھے اچھی طرح پتا ہے سلنڈر سے ڈر لگتا ہے مجھے۔ یاد نہیں پچھلے ورے (سال) تیرے مامے کی سالی کے۔''

انہوں نے حسب سابق کوئی کہانی شروع کرنا چاہی تھی وہ اس سے پہلے ہی چھپاک سے کمرے میں جا گھسی۔ اس کے پاس اتنا ٹائم نہیں تھا۔ بس آنے ہی والی تھی۔ ابھی کچھ دیر میں اس کی سکھیوں کا پورا ٹولہ دروازے کے باہر آ موجود ہوگا۔ اسے تیار ہونا تھا۔ اور جب وہ سفید یونیفارم پر کالی چادر اوڑھے' سیاہ آنکھوں میں کاجل کی دھار لگائے ان کے سامنے آئی تھی تو باوجود غصے کے وہ بے اختیار اس کی بلائیں لینے پر مجبور ہوئی تھیں۔ دھیمے لہجے میں سمجھانا چاہا۔

''صبح سویرے گھر میں شور نہ ڈالا کر۔ اب کام کرنا نہیں سیکھے گی تو کب کرے گی یہ سب۔ تو بارہ جماعتیں پڑھ لے یا بیس۔ آخر کرنا یہی ہے نا۔ ذرا جا کے ایس ویلے (اس وقت) گوانڈیوں کے گھروں میں جھاتی مار۔ تیری عمر کی کڑیوں نے پورے پورے گھر سنبھالے ہوئے ہیں۔'' اور وہ ہنس دی تھی۔ قل قل کرتی ہنسی۔ بہتے جھرنوں جیسی۔

''اپنے ایمان سے بتانا اماں۔ ان ساری لڑکیوں میں کوئی ایک بھی لڑکی تمہاری سائرہ جبیں جیسی ہے؟ کسی کے ہاتھ۔ کسی کی آنکھیں۔ کسی کا رنگ۔ کچھ بھی تو میرے جیسا نہیں۔ ارے شکر ادا کیا کرو۔ تمہاری بیٹی عام لڑکیوں جیسی نہیں۔ بہت خاص ہوں میں۔ اور میرا دل کہتا ہے۔ مجھے ان سب کاموں کے لیے دنیا میں نہیں اتارا گیا۔ تب ہی تو میرا ہاتھ لگتے ہی یہ سوکھی لکڑیاں بھی جلنے سے انکاری ہو جاتی ہیں۔ میرے لیے ضرور کہیں۔'' اور اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ دروازے پر ہوتی دستک کے ساتھ مریم اور لبنیٰ کی پکار پر وہ جلدی سے اٹھی۔

''ناشتا تو پورا کرتی جا۔ کیا بھوکی رہے گی سارا دن؟'' انہوں نے ٹوکا تھا۔ وہ ہاتھ سے نہ کا اشارہ کرتی دروازہ پار کر گئی تھی۔

''اوئے ہوئے۔ انکھاں تے ویکھو ساڈی سائرہ جبیں دیاں۔ جیویں رات پے گئی ہوندی اے۔ (آنکھیں تو دیکھو ہماری سائرہ جبیں کی۔ جیسے رات پڑ گئی ہے۔)۔ زاہدہ نے اسے دیکھتے ہی تان لگائی تھی۔ اس کی گردن کچھ اور اکڑی تھی۔ اپنے حسن پر وہ پہلے کیا کم نازاں تھی کہ اس پر ہر دن سہیلیوں کی کی گئی تعریفیں اسے اور آسمان پر چڑھاتی تھیں۔ ان آنکھوں کے شیدائی بہت ہیں۔

اسے خوب اندازہ تھا۔ اور ان ہی میں سے اک سر پھرا تو روز اس کی اک جھلک دیکھنے کو بے تاب نہر کنارے کھڑا ہوتا تھا۔ اور جسے وہ رتی بھر اہمیت دینے کی قائل نہ تھی۔

جبکہ اس کی ثابت قدمی کا راز تو اب اس کی سکھیوں پر بھی کھلنے لگا تھا۔ تب ہی تو مریم ہنسی تھی۔

''آندھی ہو یا طوفان۔ یہ نا چھوڑے جان۔''

''اور صابر اتنا کہ ایک نظر کے بعد دوسری بار ی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ سچی سائرہ اب تو میں بھی کہتی ہوں۔ کوئی جھوٹ نہیں رہ گیا اس بات میں۔ مان لے تو بھی۔ یہ اللہ کا بندہ سچے عشق کا پانی بھرتا ہے روز نہر کنارے۔'' زاہدہ نے کہا تھا۔ اس نے بڑی بڑی نشیلی آنکھوں سے گھورا۔

''اس کی ایک نظر بھی مجھے تیر کی طرح لگتی ہے۔ لیکن میں اس لیے برداشت کر جاتی ہوں کہ بیچ بازار میں کوئی تماشا نہ لگے۔ وہ بھی سیانا ہے اپنا منہ بند رکھتا ہے۔ اسے پتا ہے جس دن اس نے اک لفظ بھی حلق سے نکالا تو میں نے اسے اٹھا کر اسی نہر میں پھینک دینا ہے۔ کہاں میں اور کہاں وہ۔ ہونہہ۔ اس کی اوقات ہے میرے سنگ کھڑے ہونے کی۔ شکل دیکھی ہے اس نے کبھی اپنی۔ عقل مند ہو تو اسی چلتے پانی میں دیکھ لے اور شرم سے ڈوب مرے۔'' اس کے لہجے میں نخوت تھی۔ لبنیٰ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

''ہائے اللہ نہ کرے۔ ایسے نہیں تو نہ کہو۔ تمہیں نہیں پتا پھوپھی زینت کا اکواک پتر ہے۔ اللہ اسے سلامت رکھے۔ اور شکل تو خیر بہتوں سے اچھی ہے اس کی۔''

''اوئے ہوئے۔ تمہیں بڑا درد اٹھا ہے اس کا۔ خیر تو ہے نا۔ کہیں تیری تو نیت نہیں اس پر۔'' سائرہ سے اسے ایسی ہی کسی بات کی توقع تھی۔ تاسف بھری نگاہ ڈالی۔

''مجھے تو درد اٹھے گا۔ آخر کو رشتے دار ہے میرا۔ اور میری نیت تو نہیں۔ ہاں اگر اس جیسے بندے کی نیت مجھ پر خراب ہوتی نا تو میں اسے اپنے لیے اعزاز سمجھتی۔ ایسا خوبرو شہزادوں سا۔ اور اس پر ایسا اعلا مزاج۔ کہ جو کسی بھی لڑکی کے لیے باعث رشک ہو۔ پر تمہیں یہ باتیں سمجھ میں کہاں آئیں گی تم تو۔''

''اوہو۔ چھوڑو ساری باتیں۔ جلدی جلدی چلو۔ بس آگئی ہے۔'' قبل اس کے کہ معاملہ سنگین رخ اختیار کرتا۔ زاہدہ نے شور مچا کر ان کی توجہ بٹائی۔ دور سے بس کا ہارن سنائی دے رہا تھا۔ وہ تیز تیز چلتی پل والے اسٹاپ تک پہنچ گئی تھیں۔

''ارے وہ دیکھو ڈاکٹر باذل جمال۔'' لبنیٰ نے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی اسی بس سے شہر جانے والا تھا۔ اس کے شانے پر سفری بیگ دھرا تھا۔ نہر کنارے کھڑے جگری یار سے رک کر اس نے مصافحہ کیا تھا۔ جس نے اس کا بیگ لے کر اپنے شانے پر ڈال لیا۔ ان کا رخ اسی سمت میں تھا۔ پیچھے دو تین لڑکے اس کا اضافی سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ گاؤں کا اعلا تعلیم یافتہ اور انتہائی پر کشش شخصیت کا حامل نوجوان جو کئی دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ اور خاص بات یہ بھی کہ سائرہ جبیں کی اماں تو اس پر دل و جان سے فدا تھیں۔ (بھئی اپنی بیٹی کے لیے) اور حسب سابق بیٹی صاحبہ کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ اس نے اک جھلستی نظر ادھر ڈالی تھی اور جل کر کہہ گئی۔

''تم نے اس کا نام تو پورا لیا ہی نہیں۔ وہ ڈاکٹر باذل جمال نہیں ہے۔ بلکہ وہ ڈنگر ڈاکٹر باذل جمال ہے۔''

اور اس کے جلتے ہوئے انداز پر ان تینوں کو ہنسی آگئی تھی۔ لڑکیوں کو ہنستے دیکھ کر ان دونوں کے پیچھے آتے لڑکے کیوں چپ رہتے۔ انہوں نے دانت نکوسنا اپنا فرض جانا تھا۔

☆☆☆

دوسری جماعت کا سمیر ہل ہل کر انگریزی میں درخواست یاد کر رہا تھا۔ کہ اسے سنتے بلال نے شور مچا دیا۔

''اوئے دیکھو۔ یہ اپنے آپ کو ال کہہ رہا ہے مطلب۔ چیل۔ اوہو۔ یہ چیل ہے۔ ہاہاہا۔'' وہ تنتناتی ہوئی کمرے سے نکلی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ساری آوازیں گل ہوئیں۔ وہ بلال کے سر پر پہنچی تھی۔

''اسٹینڈ اپ بلال۔ تم باز نہیں آؤ گے ان حرکتوں سے۔ ٹھہر جاؤ ذرا آج تو میں تمہارے ابا کو بلاتی ہوں۔ اب دو ٹوک بات ان ہی سے ہوگی۔'' اس نے کان کھینچنے کے ساتھ دھمکایا بھی تھا۔ بلال اچھی طرح جانتا تھا آپا جو کہتی ہے وہ کرتی بھی ہے۔ اگر ابا تک شکایت پہنچ گئی تو ان کے جوتوں سے اماں بھی نہیں بچا پائیں گی۔ سو ہاتھ جوڑ کر لگا معافیاں مانگنے۔

''چلو ٹھیک ہے۔ آج تو معافی دے رہی ہوں۔ لیکن اگر آئندہ پھر کوئی حماقت کی تو تمہاری خیر نہیں۔ اور اب بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرو۔ اور خبردار جو کسی کی طرف دیکھا بھی ہو تو۔ چلو تم سب بھی اپنی اپنی کتابیں پکڑو۔''

امی چھت سے کپڑوں کا گٹھڑ لیے آرہی تھیں، اس نے بڑھ کر ان کے ہاتھوں سے لے لیا۔

''دو منٹ صبر نہیں ہوتا آپ سے کہا بھی تھا۔ بچوں سے فارغ ہو کر لے آؤں گی کپڑے۔'' اس نے ڈھیر چارپائی پر پٹخا تھا۔

''کتنی بار منع کیا ہے صبر کا لفظ مت استعمال کیا کرو۔ اللہ ہر اس گھڑی سے محفوظ رکھے جس میں انسان کو صبر کرنا پڑے۔ تمہارے بھی کان کھینچنے والے ہو رہے ہیں۔ میری تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی ہے۔ اور پہلے ہی سارے کپڑوں کی رنگت اڑی ہوئی ہے۔ اب تمہارے دو منٹ پورے ہونے کے انتظار میں ان کو بالکل ہی بے رنگ کر لیتی کیا۔ اب تم تہہ کر

کے ان کی جگہوں تک پہنچا دینا۔ اور وہاج آتا ہی ہو گا۔ پتا ہے نا اس نے آتے ہی بھوک بھوک کی رٹ لگا دینا ہے۔ ہانڈی تو تیار ہو گئی ہے۔ تم ذرا جلدی سے آٹا گوندھ کر روٹیاں ڈال لو۔" اور اسے یاد آیا تھا آٹے والا برتن تو کل کا خالی ہو چکا تھا۔ اب وہ آٹا کیسے گوندھ لیتی۔ ماں کے شانے پر بازو پھیلاتے مزے سے بولی۔

"اور آپ کو تو جیسے بڑی یاد رہتی ہیں میری باتیں۔ میری پیاری امی جان میں نے کل ہی آپ کو بتایا تھا کہ آٹا ختم ہو چکا ہے۔ اور آپ ابا سے کہہ کر منگوا لیں۔" اور زینت خاتون کا ہاتھ بے اختیار ماتھے تک گیا تھا۔

"اے لو۔ مجھے تو واقعی یاد نہیں رہا۔ جبکہ جاتے ہوئے تمہارے ابا نے روز کی طرح آج بھی پوچھا تھا کہ کچھ چاہئے تو نہیں۔ اور میرے دھیان میں ہی نہیں آیا۔ نا ہی ان سے پیسے لینا یاد رہے۔ اب کیا ہو گا؟" وہ فکر مند ہوئی تھیں۔

"اوہو۔ آپ پریشان کیوں ہو گئی ہیں۔ پیسوں کا بندوبست تو ابھی ہو جاتا ہے۔ ارباز کی پچھلے مہینے کی فیس نہیں آئی اسے بھیجتی ہوں۔ تائی فاخرہ سے فیس کے پیسے لے کر آٹا لا دے گا۔" ماں کو تسلی دیتے ساتھ ہی اس نے ارباز کو بھی آواز دی تھی۔ جو تابعداری کی عمدہ مثال قائم کرتا جھٹ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"جی زرتاج آپا۔ حکم کریں۔"

"ہائیں۔ تم تو یوں پوچھ رہے ہو جیسے میرے کہتے ہی آٹے کی پوری چکی اٹھا کر لے آؤ گے۔ جو میں نے ابھی کہا، وہ تم نے سن لیا نا۔ بس بھاگ کر اتنا ہی کام کر دو۔"

اس نے تیزی سے ڈور لگائی تھی۔ وہ تو بھلا ہوا کہ کھلے دروازے سے اندر آتا وہاج ایک طرف ہو گیا تھا۔

"اوئے پکڑو اس کو۔ یہ پنڈ میں کتا (بچھڑا) کس نے کھلا چھوڑ دیا ہے۔" اس کی صحت مندی پر چوٹ کرتے شرارتاً ہانک لگائی تھی۔

"کتا۔ ہاہاہا۔" سب بچوں کی ہنسی نکل گئی تھی۔

☆☆☆

خاکی رنگ کی جینز پر تیز گلابی رنگ کی پرنٹڈ شرٹ پہنے وہ نہایا دھویا صحن میں لگے شیشے کے سامنے کھڑا اپنے گھنے بال سنوارتے ہوئے نصیبو لال کا اک دھماکہ خیز نمبر گنگنا رہا تھا۔ کمرے سے نکلتی فاخرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"لاحول ولاقوۃ۔ کتنی بار سمجھایا ہے۔ گھر میں جوان جہان بہن کے علاوہ ایک چھوٹا بھائی بھی ہے۔ کچھ تو دھیان کیا کرو۔ اپنے ایسے شوق باہر ہی پورے کرو تو اچھا ہے۔ اور خیر سے کدھر کی تیاریاں ہیں؟"

انہیں اس کے انداز تو کافی دن سے کھٹک رہے تھے۔ اکثر اول جلول حلیے میں رہنے والا ان کا شہزادہ آج کل کچھ زیادہ ہی بانکا سجیلا بننے کی کوششوں میں نظر آ رہا تھا۔ اور وہ کوئی نادان بچی نہیں تھیں۔ سب سمجھتی تھیں۔ لیکن وہ اپنے خوابوں سے پہلے اس کے کسی بھی خواب کو اہمیت دینے کی روادار نہیں تھیں۔ اور وہ یہ بات اسے کئی بار سمجھا بھی چکی تھیں۔ اب بھی کڑی نظر سے دیکھا۔

"اوہو۔ کیا مطلب ہے، اب کیا میں عید کے عید نہایا کروں۔ حد کرتی ہو اماں تم بھی۔ بس یہی چاہتی ہو، دن رات کھیتوں میں گھسا گوڈیاں کرتا رہوں۔ یا بھینسیں چراؤں۔ اللہ کیا دنیا سے گئے۔ میں تو اس گھر کا نوکر ہی بن گیا۔ کبھی یہ کام تو کبھی وہ کام۔ کیا میری کوئی زندگی نہیں رہ گئی۔ میرا کوئی حق نہیں کہ چند گھڑیاں دوستوں کے ساتھ ہنس بول لوں۔ کمال ہے بھئی۔"

ماں کی نظروں سے خائف ہوتے اس نے کنگھا اس کی جگہ پر واپس رکھنے کے بجائے زور سے فرش پر دے مارا تھا۔

"لے تجھے بھلا کس بات کا غصہ چڑھ گیا۔ میں نے ایسا بھی کون سا سوٹا کھینچ مارا ہے۔ اتنا ہی پوچھا

ہے نا کدھر کی تیاری ہے۔ اور یہ نوکر ہونے کے طعنے کس کو دیے رہا ہے۔ باپ کے بعد تیری ہی ذمہ داری بنتی تھی نا کہ تیرے کسی چاچے مامے کے ہاتھ میں دے دیتی سارا مال اسباب۔ جو روز کے روز تیرے ہاتھ پر چند ٹکے رکھ دیا کرتا۔ پھر چنگا رہتا تو۔ شکر کر اللہ کا، جس نے کسی کا محتاج نہیں کیا۔ باپ کی محنت تیرے ہی کام آرہی ہے اب۔ خود بھی رج کے کھا رہا ہے اور اپنے ان دیلے ٹکے دوستوں کو بھی کھلا رہا ہے۔" انہیں بھی غصہ ہی تو آگیا۔ ڈپٹ کر کہا۔

"اے لو اک ہور سن لو۔ او میری ماں یہی تو مشکل ہے۔ تو اپنے بیٹے کو ہی نہیں جانتی۔ تجھے پتا ہی نہیں ہے۔ تیرا یہ شہزادہ کسی دیلے ٹکے کو مفت میں اک پیسہ نہیں کھلانے والا۔ اگر کبھی کسی کو کھلاتا بھی ہوں نا تو بدلے میں اس سے دس کام لے لیتا ہوں۔ ایویں تو نہیں یہ سیارا کچھ سنبھال کر بیٹھا ہوا۔ بڑی سمجھ داریاں سیکھنا پڑتی ہیں دنیا میں رہنے کے لیے۔ اور وہ دن دور نہیں جب ابا کے چھوڑے مال کو دگنا تگنا کر کے دکھاؤں گا تمہیں۔ اور مجھے پتا ہے، تم نے تب بھی خوش نہیں ہونا۔ تب بھی کوئی نہ کوئی طعنہ ہی مارو گی مجھے۔" وہ اچھی طرح واقف تھا ماں کی عادتوں سے۔ برا سا منہ بنا کر بولا۔

"میں تو جوتے بھی ماروں گی۔ تو بے شک نا بڑھانا۔ لیکن اللہ کے واسطے گھٹانا بھی مت۔ اور اب چھوڑ اس بات کو اور باہر جا ہی رہا ہے تو پکانے کے لیے کچھ لا دے مجھے۔" وہ مطلب کی بات پر آئی تھیں۔ اور وہ جو اک بار پھر اپنے ہوش ربا روپ کا جائزہ لینے کو آئینے کی سمت مڑا تھا کہ گھوم کر پھر اسی رخ پر ہوا۔

"ہیں۔ کیا پھر سودا سلف مک گیا ہے گھر کا۔ ابھی چار دن پہلے ہی تو لا کر دیا تھا سارا راشن۔ خرچ اپنے شاہانہ ہیں۔ اور کل کو حساب کتاب کرتے گردن میری پکڑو گی۔ میں کہہ رہا ہوں، ہاتھ ذرا ہولا رکھو میری ماں۔"

"ارے میری تو ساری عمر اسی کوشش میں گزر گئی۔ تیرا باپ زندہ تھا تو اس کے ہوتے سوتوں کے لیے پکاتے پکاتے کمر دہری ہو جایا کرتی تھی۔ اور اب بھی راشن میرے پچھلے نہیں آ کر کھا گئے۔ بھول گیا ہے پرسوں جو تو نے پندرہ مفت خوروں کے لیے کھڑے پیر کھانا بنوایا تھا؟ یہ سب اسی کی کرامت ہے۔ وہ تو پھر میری کفایت شعاری ہے جو دو دن چولہا جلتا رہا ہے۔ میں نے تجھے کچھ نہیں کہا۔ پر اب کچھ نہیں ہے پکانے کو۔ اور تیرا کیا بھروسا ڈیرے پہ جاتے ہی پھر دو چار بندوں کا کھانا منگوا بھیجے۔ نہیں بھیجوں گی تو تیری ہی بے ستی ہو گی چار لوگوں کے بیچ۔" وہ بھگو کر جوتا مارتی تھیں۔ اس نے گھبرا کر مزید کارروائی سے روکا۔

"اچھا۔ اچھا ٹھیک ہے، لا دیتا ہوں۔ ایک تو ماں تم بھی نا، پیچھا ہی لے لیتی ہو۔" وہ شیشے کی جان چھوڑتا اپنی بائیک کی طرف آیا۔ اور اپنا منہ وہ روز دھوتا تھا یا نہیں۔ لیکن باہر نکلنے سے پہلے کم از کم بھی پورے پندرہ منٹ اسے چمکانے میں ضرور صرف کرتا تھا۔ فاخرہ خوب جانتی تھیں اس کی خصلت کو۔ منہ ہی منہ میں بد بداتے رنگین پائیوں والی چارپائی پر جا بیٹھیں اور ایک ہاتھ سے اپنا گھٹنا دبانے لگیں۔

"کیا ہوا؟ کیا پھر جوڑوں کا درد شروع ہو گیا۔ سارا دن خود ہی لگی رہتی ہو۔ درد تو ہو گا ہی۔ کوئی کام سائرہ سے بھی کروا لیا کرو۔" وہ ہمدرد بنا کہہ رہا تھا۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ علاوہ اک ٹھنڈی آہ کے۔

سائرہ اور کام؟ اف۔ انہیں کئی لمحے یاد آگئے تھے۔ جھرجھری سی آگئی۔ بدستور گھٹنا دبائے گئیں۔ اور وہ بھی سمجھ گیا تھا۔ اسی لیے اک اور مشورہ پیش کیا۔

"سائرہ کو تو اللہ جانے کب عقل آئے گی۔ اس کے تو لاڈ اٹھا اٹھا کر سر پر چڑھا لیا ہے۔ لیکن میں پہلے ہی کہہ رہا ہوں۔ کسی اور کے ایسے لاڈ مت اٹھانا۔ بے شک خوب کس کے رکھنا اسے۔ دیکھو نا

کتنا تھک جاتی ہو۔ روز کوئی نا کوئی درد لیے بیٹھی ہوتی ہو۔ کام کی عمر تو نہیں رہ گئی۔ اب تو آرام کرنے کے دن ہیں۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اب بہو لانے کے بارے میں سوچو۔"

اور فاخرہ کا ہاتھ گھٹنے پر ساکت ہوا تھا۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا قبل اس کے کہ زبان کو حرکت دیتیں۔ وہ تیزی سے بائیک دھکیلتا گھر سے نکل گیا۔ پیچھے ان کی بڑبڑاہٹیں تادیر جاری رہیں۔

☆☆☆

صبح سورج تو بڑے طمطراق سے طلوع ہوا تھا۔ چہار سو سنہری کرنوں کا جال بچھ گیا۔ ہر شے اجلی سی ہو گئی تھی۔ کہ اچانک جانے کہاں سے مٹیالی سی بدلیاں امڈ پڑیں۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ہر منظر پر قابض ہوتی چلی گئیں۔ تیز ہوا نے الگ اتھا پتھل مچا دی تھی۔ مریم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور گھبرائے لہجے میں اطلاع فراہم کی۔

"ہائے نی کڑیوں، بڑی زور کی آندھی ہے یہ تو۔ لگتا ہے بارش بھی خوب ہوگی۔"

"ہاں ہوگی بارش۔ اور آج شام تک یہی موسم متوقع ہے۔" کتاب بند کر کے بیگ میں ڈالتے سائرہ نے اس کی بات پر نہایت اطمینان سے مہر تصدیق ثبت کی تھی۔

"ہیں۔ کیا مطلب۔ تمہیں کیسے پتا؟" زاہدہ نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"کیونکہ میں نے آج اتفاقاً صبح سات بجے کا نیوز بلیٹن سنا تھا۔ محکمہ موسمیات کی طرف سے یہی خبر تھی۔"

"اوہ...... جا بیڑا ترجائے تیرا۔ اور اتنی اہم خبر تو نے ہمیں کیوں نہ بتائی۔ ہم ایویں منہ اٹھائے اسکول آگئیں۔ کتنا اچھا ہوتا گھر پہ ہی رہتے اب یہ۔" اور لبنیٰ نے مارے غصے کے اس کی پشت پر ایک ہاتھ جڑا تھا۔ اس نے بھی پورا بولنے نہ دیا۔ کتاب اٹھا کر اس کے گھٹنے پر دے ماری۔

"کتنا اچھا ہوتا گھر پہ ہی رہتے ہونہہ۔ اور گھر میں رہ کر اب سارے چوچے (چوزے) اور مرغیوں کے پیچھے دوڑ دوڑ کر ہلکان ہو رہے ہوتے۔ صحن سے چارپائیاں اٹھا اٹھا کر دالان میں رکھتے۔ نہیں تو چھت پر رکھا بالن سمیٹتے۔ یہی کام ہوتے ہیں ہمارے گھر، میں اس موسم کو دیکھ کر۔ اور ماؤں کو بھی وہ سارے کام ہم سے ہی کروانے ہوتے ہیں۔ اب تم لوگوں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن اپنی شامت کا پکا پتا ہے۔ میری ماں کے دونوں شیر تو بادل دیکھتے ہی جلیبیاں اور سموسے کھانے باہر دوڑ پڑتے ہیں اور سارا پھیلاوا سمیٹنے کو بچ جاتی ہے میری اکیلی جان۔ اسی لیے صبح خبریں سنتے ہی میں نے اسکول آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اماں نے کہا تھا چھٹی کر لو۔ میں نے بھی کہہ دیا۔ بہت ضروری ٹیسٹ ہے چھٹی تو بالکل بھی نہیں کر سکتی۔ ہاہاہا۔"

انتہائی فخریہ انداز سے وہ اپنی کارگزاری سے انہیں آگاہی دے رہی تھی۔ تینوں نے گھور کر دیکھا۔

"دفع پرے ہو۔ کمینی نہ ہو تو خود آجاتی ساتھ ہمیں کیوں پھنسایا۔ اف۔ اتنے کالے بادل آتے جا رہے ہیں۔ بارش اگر تیز ہوئی تو واپس کیسے جائیں گے۔"

مریم کی تشویش غلط نہیں تھی۔ موسم کی جولانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اور جتنا وہ فکر مند تھیں۔ اتنا ہی وہ بے فکر۔

"اوہ کچھ نہیں ہوتا۔ تم لوگ کون سا نمک کی بنی ہو جو اس بارش میں گھل کر بہہ جاؤ گی۔ موسم انجوائے کرنا سیکھو میری بزدل سہیلیو۔ چلو کیا یاد کرو گی تم ساری بھی۔ آج کی زبردست دعوت میری طرف سے۔ ابھی گرما گرم سموسے اور پکوڑے منگواتے ہیں۔" سائرہ بیگ کھول کر جیبیں ٹٹولنے لگی۔ ماں کی اکلوتی شہزادی تھی۔ کوئی بھی بہانا لگا کر ان سے خوب سارے پیسے اینٹھنا تو اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

"لو بھئی جس کا جو جی چاہے منگا لو۔" اس نے پیسے نکال کر سامنے رکھے اور کفران نعمت کرنا تو اچھی بات نہیں ہوتی نا۔ خوب جی بھر کر ٹھونسنے کے بعد

سائرہ کی ضد پر ہی وہ بس کا انتظار موقوف کیے پیدل ہی گھر کے لیے نکل پڑی تھیں۔ تب تک بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

ابھی کچھ ہی فاصلہ طے ہوا تھا کہ تیز بوچھاڑ نے آلیا۔ انہوں نے بھاگ کر جامن کے گھنے درخت تلے پناہ لی۔ سب سے پہلے دوڑ لگانے والی سائرہ جبیں تھی جسے زاہدہ نے آڑے ہاتھوں لیا۔

''نہیں۔ نہیں۔ اب کیوں چھپ رہی ہو۔ تم کون سا نمک کی بنی ہو جو اتنی سی بارش میں گھل کر بہہ جاؤ گی۔ جاؤ میری پیاری سکھی! موسم انجوائے کرنا سیکھو۔ تمہارے لیے ہی تو برس رہی ہے یہ بارش۔ اور تم ہو کے منہ موڑے اس کا دل توڑ رہی ہو۔'' اور وہ ڈھیٹ بنی ہنس دی تھی۔ ان تینوں نے مل کر پھر اسے بارش کی طرف دھکیل دیا تھا۔

''قسمے۔ سائرہ جبیں کبھی کبھی تو تیری دوستی بھی نا امتحان ہی لیتی ہے ہمارا۔ اچھا ہوتا جو بس کا ہی انتظار کر لیتے۔ اب یہ خواری تو نا گلے پڑتی۔ آدھے کپڑے تو بھیگ چکے ہیں۔ گھر تک پہنچتے اللہ جانے کیا بنے گا ہمارا۔ اتنی ٹھنڈی یخ بارش ہے۔ یہ تو ضرور بیمار کر دے گی۔ بس پھر اگلے دس دنوں کے لیے سنبھال کے پڑ جانا بستر۔'' لبنیٰ نے اسے لتاڑا تھا۔

''ہاں تو اچھا ہے نا۔ چار دن پڑھائی سے بھی آرام مل جائے گا۔ ورنہ مس صالحہ کا تو پکا پروگرام ہے اگلے ہفتے سے ہمارے ٹیسٹ شروع کروانے کا۔ اور تیاری کا تو تم سب کا بھی وہی حال ہوگا۔ جو کہ میرا ہے۔'' درخت کے تنے پر جوتا رگڑ کر مٹی جھاڑتے سائرہ نے اپنی قابلیت کا پردہ بھی اتارا تھا۔

''ہائے کتنا مزا آتا اس جامن پر پکا ہوا پھل ہوتا۔'' مریم کی اب نظر گئی تھی۔ ٹہنیوں پر خوشے لٹک رہے تھے لیکن سب کے سب کچے۔

''اور کتنا مزا آئے جو اس درخت پر کوئی جن شہزادہ بھی رہتا ہو۔ اور وہ ہمیں اس مشکل میں پھنسا دیکھ کر ہماری مدد کرے اور اپنے اڑن کھٹولے پر بٹھا کر ہمارے گھر تک پہنچا دے۔'' لبنیٰ کو اک نئی سوجھی تھی۔

''دفع دور۔ شہزادہ بھی مانگا تو۔ جن شہزادہ۔ کمینی کوئی انسان کا بچہ نہیں مانگ سکتی تھیں تم؟'' سائرہ کو شدید اعتراض ہوا تھا۔

دور سے آتی بائیک کی پھٹ پھٹ بہت قریب آچکی تھی۔ اور یک نا شد دو شد یعنی اکٹھے دو شہزادے ان کے سامنے سے زن کر کے گزر گئے۔ اور ایک نے تو انہیں مڑ کر بغور دیکھا بھی تھا۔ اور پھر بھی چلا گیا۔

''ہاہ۔ ہائے۔ کتنے بے دید ہیں وہاج بھائی ہمیں دیکھ کر بھی نہیں رکے۔ چلو ہماری خاطر نہ سہی تو کسی اور کے لیے ہی رک جاتے۔'' لبنیٰ کی دکھ بھری آہ میں چھپی شرارت صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ زاہدہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

''بس بھئی کیا کریں۔ زمانہ ہی بدل گیا ہے۔ اب وہ والے محبوب کہاں رہے جو اپنی محبوبہ کے لیے نہریں تک کھود ڈالتے تھے۔ اب تو ایسی برستی بارش میں پاس سے گزر جاتے ہیں اور حال بھی نہیں پوچھتے۔''

''ہاں تو کیا مطلب ہے تمہارا، کیا وہ ہمیں اس چنی سی موٹر سائیکل پر لاد کر لے جاتا۔ اور دیکھا نہیں ان کے ساتھ وہ فسادی برکت تھا۔ جس نے ہماری سائرہ کے ہاتھوں اپنی اس دن کی چھچھوری حرکت پر چنگے لتر کھائے تھے۔ وہ بھلا رکتا ہماری مدد کے لیے۔ اور اگر اکیلے وہاج بھائی رک جاتے تو کل کو یہی مدد پورے پنڈ کی زبان کا چٹخارا بنی ہوتی۔''

مریم بالکل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اور وہ دونوں کون سا سنجیدہ تھیں۔ وہ تو بس یونہی سائرہ کو چھیڑ رہی تھیں۔ بارش کے رکنے کا فی الحال تو کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ درخت کی شاخیں کتنی بھی گھنی سہی مگر تیز بوچھاڑ کو روکنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی سی اس مصیبت سے نکلنے کی دعا کر رہی تھیں۔ جو کہ سن لی گئی تھی۔ دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز دم بدم قریب آتی جارہی تھی۔ اور آنے

والے کو دیکھ کر لبنیٰ تو مارے خوشی کے نہال ہو گئی۔ انہیں دیکھا، دو چہروں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اور سائرہ کے گال کچھ اور لال ہوئے تھے۔ لب بھینچے اس نے رخ ہی موڑ لیا تھا۔

"مجھے پتا تھا آپ ضرور آئیں گے۔ ارے میرا بھائی تو کسی غیر کو مصیبت میں گھرا نہیں دیکھ سکتا۔ تو اپنی بہن کو کیسے چھوڑ جاتا۔ اور آپ چاچے صابر کا تانگہ خود ہی لے آئے۔ کمال ہے آج تو کوچوان بھی بن بیٹھے۔"

وہ سرشاری سی کہے جا رہی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔

"ویسے اس خراب موسم میں گھر سے نکلنے کا مشورہ کس پاگل نے دیا تھا تم سب کو۔" اور پاگل کے علاوہ وہ تینوں ہنستی ہوئی لپک جھپک تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ ہنوز منہ پھلائے کھڑی تھی۔

"سائرہ جلدی کر۔ اب بیٹھ بھی جا۔" زاہدہ نے ہانک لگائی تھی۔ اس نے تینوں کو گھورا۔ خود تو چالاکو ماسیاں پیچھے بیٹھ گئی تھیں، اب وہ کیا اکیلی اگلی سیٹ پر بیٹھے گی؟ اور وہ بیٹھ جائے گی۔ وہ کسی سے گھبراتی تھوڑا ہے۔ بس اسی جھونک میں پائیدان پر پاؤں رکھا تھا۔ جوتا کیچڑ سے لت پت تھا۔ ذرا سا وزن ڈالتے ہی نکل گیا۔ اس کا منہ بہت بری طرح لوہے کے پائپ سے ٹکرا جاتا۔ اگر جو اک ہاتھ امداد غیبی بنا سہارا نہ دیتا۔ اس کا تو سانس ہی اٹک گیا تھا۔ "ہائے میرے اللہ" کی صدائیں پچھلی نشست سے بھی ابھری تھیں۔

"چوٹ تو نہیں لگی سائرہ؟" مریم پوچھ رہی تھی۔ اس کے حواس قابو میں ہوتے تو کچھ بتاتی۔ اور کائنات تو اس کے لیے بھی تھم گئی تھی۔ جس نے لمحے کے ہزارویں حصے میں لپکتے ہوئے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اور وہ ہاتھ کیا دسترس میں آیا گویا کون و مکاں کی گردشیں رک گئیں۔ سارا عالم بحر تحیرات میں تھا۔ ہوا کو ساری چوکڑی بھول گئی۔ بارش کی بوندوں کا ساز کچھ اور مدھر ہوا تھا۔ سارے نظارے اک پل میں غائب ہوئے رہ گئے تھے تو بس وہ دو ہاتھ۔ جو زنجیر کی کڑی جیسے جڑ گئے تھے۔ کاش یہ پل یہیں رک جائیں۔ وہاج کے دل کی تو یہی صدا تھی۔ لیکن دوسرے دل کی دھڑکنیں بحال ہوتے ہی ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ بجائے شکر گزار ہونے کے کینہ توز نگاہ سے گھورتی سنبھل کر سوار ہوئی تھی۔ وہ منہ پھیر کر زیر لب مسکرا دیا۔

ابھی چند لمحے قبل کی اپنی کیفیت یاد آنے کے ساتھ ہتھیلی پر سانس لیتا اک احساس بھی اس کے سنگ مسکرایا تھا۔ زور سے مٹھی بھینچ کر دوسرے ہاتھ سے چابک لہرایا۔ گھوڑے نے واپسی کا سفر اختیار کیا تھا۔ اور اس کے سفر شوق کو تو اک نیا موڑ مل گیا تھا۔ آج کی بارش کو وہ کبھی نہیں بھولے گا۔ ابر رحمت تو جیسے بس اس کے دل و روح پر ہی کھل کر برس رہے تھے۔ وہ مسرور سا تانگہ تیز اور تیز دوڑائے چلا گیا۔ سائرہ تو دم سادھے بیٹھی تھی۔ لیکن پچھلی سیٹ سے ان تینوں کی منت بھری آوازیں برابر آ رہی تھیں۔

☆☆☆

پورے گھر میں ایسے استحقاق سے گھوم رہی تھی۔ گویا مستقل مکین ہو۔ ان کے سامنے ہی لپک جھپک کتنے کام بنٹا دیے۔ اور تو اور گرما گرم بھاپ اڑاتی چائے اور بسکٹ بھی سلیقے سے ٹرے میں سجا کر لے آئی۔

"جیتی رہو۔ سدا خوش رہو میری بچی۔" شمسہ آپا کی نگاہ میں ہی نہیں بلکہ لہجے میں بھی اس کے لیے پیار گھلا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی پلٹ گئی۔ فاخرہ نے اک کڑی نظر اس کے سونے سے چمکتے چہرے پر ڈالی۔

"میں تو سچی بات کہوں گی شمسہ۔ کبھی کبھی تم بہت غیریت کا ثبوت دیتی ہو۔ اب رشتے دار ہم تمہارے اور ہمیں ہی تمہاری بیماری کی خبر نہیں۔ اب اگر تم فوراً مجھے بتاتیں تو کیا میں سائرہ کو تمہارے پاس نہ بھیجتی۔ میں کون سا اتنا دور رہتی ہوں کہ مجھے اطلاع نہیں دی جا سکتی تھی۔ یہ سامنے ہی تو گھر ہے۔ لیکن بھئی، تمہارا دل تو دیوار پار رہتے پڑوسیوں سے زیادہ

ملتا ہے۔"

"ارے نہیں فاخرہ آپا! ایسی بات بالکل بھی نہیں۔ آپ بھی مجھے کم عزیز نہیں ہیں۔ اور خدانخواستہ بیماری تو کوئی نہیں تھی۔ بس ہلکا سا بخار ہوا تھا۔ وہ بھی زرتاج چھت پر کپڑے ڈالنے آئی تو مجھے آواز دے دی۔ تب ہی اسے بھی پتا چل گیا۔ اور ماشاء اللہ بہت ہی نیک بخت بیٹی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے آکر سارا گھر سنبھال لیا۔ اور سائرہ بھی میری بیٹی ہے۔ وہ بھی مجھے بہت پیاری ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں، وہ باقاعدگی سے اسکول جاتی ہے، اک دن کا ناغہ نہیں کرتی۔ تو میں اسے بلا کر اس کی پڑھائی کیوں خراب کرتی۔" شمسہ نے بڑے سبھاؤ سے ان کے اعتراض کا جواب پیش کیا تھا۔

"ہاں۔ یہ تو تم نے سچ بات کی۔ اللہ بری نظر سے بچائے۔ میری سائرہ جبیں کو بڑا ہی شوق ہے اسے پڑھائی کرنے کا۔ وہ تو کہتی ہے اماں میں تو پوری سولہ جماعتیں پاس کروں گی۔ وہ تو خراب موسم میں بھی اسکول جانے سے نہیں رکتی۔ اس کا تو بس نہیں چلتا چھٹی والے دن بھی چلی جائے۔ دن رات کتابوں میں ہی منہ دے کے رکھتی ہے ماشاء اللہ۔" انہیں اللہ نے موقع دیا تھا اپنی لاڈو کی خوبیاں بیان کرنے کا۔ وہ بھلا کیوں رکتیں۔ بے دریغ بولے گئیں۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔" شمسہ نے یوں سر ہلا ہلا کر کہا گویا شدید متاثر ہوئی ہیں۔

"مگر اب ایسا بھی نہیں کہ وہ صرف کتابیں ہی لیے بیٹھی رہتی ہے۔ خیر سے گھر کے بھی سارے کام آتے ہیں اسے۔ اسکول سے آکر وہ کب مجھے کسی چیز کو ہاتھ لگانے دیتی ہے، سارا گھر خود ہی سنبھالتی ہے۔ صفائی ستھرائی، کھانا پکانا، مہمان داری۔ سعادت کے جانے کے بعد بھی خیر سے ہمارا ڈیرہ ویسے ہی چل رہا ہے۔ سجاد کی ساری عادتیں اپنے باپ والی ہی ہیں۔ کسی بھی مہمان کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانے دیتا۔ اور پکانے سے میری سائرہ نہیں گھبراتی۔ مجال ہے جو کسی وقت انکار کر جائے۔ چٹکیوں میں کام نبٹاتی ہے وہ۔"

دروغ گوئی کا اگر کہیں مقابلہ ہوتا تو تائی فاخرہ ضرور پہلا انعام لے کر آتیں۔ صحن سے باورچی خانے تک کچھ زیادہ فاصلہ تو نہیں تھا۔ برتن دھوتی زرتاج بانو کی سماعتیں خوب محظوظ ہو رہی تھیں۔ ہنسی روکنا محال ہوتا جا رہا تھا۔ اس پر شمسہ کی تائید۔ ان کے پاس اور کوئی چارا نہیں تھا سوائے ہاں میں ہاں ملانے کے۔ نقص امن کا خطرہ تھا۔

"اور تم آخر کب تک اپنی ہڈیاں گھسو گی۔ بڑی خدمت کی ہے تم نے میاں جی اور باذل کی۔ ننھا سا تھا وہ جب اس کی ماں اس دنیا سے گئی۔ اس کے بعد تم نے سگی ماں سے بڑھ کر پیار دیا۔ اب تمہارا حق بنتا ہے کہ اس کے لیے کوئی پیاری اور سلیقہ مند لڑکی ڈھونڈو۔ جو کل کو تمہارے لیے بھی سکھ بنے اور اس گھر کی تنہائی بھی ختم ہو۔" اب انہوں نے مشوروں کا باکس کھول لیا تھا۔

"ہاں بالکل کیوں نہیں۔ میری تو اپنی بڑی خواہش ہے۔ اس گھر میں بھی رونق ہو۔ مجھے بھی دوسراہٹ ملے۔ میرے باذل کی دلہن آئے۔ لیکن میاں جی اور باذل دونوں کی مرضی ہے کہ پہلے وہ پورے دھیان سے اپنی ڈاکٹری کی تلیم (تعلیم) مکمل کرلے۔ پھر اس بارے میں کچھ سوچیں گے۔ اس کی پڑھائی بھی تو اتنی اوکھی ہے نا۔ پھر جو کمائی آتی ہے ساری تو اس کی تلیم پر خرچ ہو رہی ہے۔ اب تو یہی امید ہے پڑھائی کے بعد اس کی چنگی سی نوکری لگ جائے تو۔۔۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ بے چارے میاں جی کو مسجد کی امامت سے تو چند ہزار ہی ملتے ہیں۔ اس سے کیا بنتا ہے بھلا اتنی مہنگائی کے دور میں۔ گھر کا راشن بھی پورا نہیں آتا۔ اور باقی بچیں زمینیں تو ان کا سارا ٹھیکہ باذل کی تلیم پر لگ جاتا ہے۔ ویسے بڑا حوصلہ ہے تمہارا۔ آج کل کے زمانے میں متریٔ (سوتیلی) اولاد پر کون اتنا خرچ کرتا ہے۔ اور بھلا میاں جی یا

باذل پتر کو کیا پتا گھر آنے والی لڑکی میں کیا خوبیاں ہونی چاہیے۔ یہ کام تو صرف تمہارا ہے۔ تم ابھی سے دیکھنا شروع کر دو۔ اپنے آس پاس نظر رکھو۔ بھئی، سچی بات ہے اچھی لڑکیوں کا رشتہ ہوتے بھی کون سی دیر لگتی ہے۔ برادری کے کئی لوگ آس لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں۔ تم بھی کوئی پسند کر کے سوال ڈال دو۔ شادی جب مرضی کرتی رہنا۔"

شمسہ کی دی گئی تاویل کو وہ کیا خاطر میں لاتیں پھر سے مشورہ پیش کیا۔ اب اسی طرح گھما پھرا کر ہی کہنا تھا نا۔ صاف کیا کہتیں کہ میری سائرہ جیسی اور کہیں نہیں ملے گی اور اس میں کچھ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ اس جیسی تو واقعی کوئی نہ ملتی انہیں۔ مگر کچھ بھی سہی، وہ بیٹی کی ماں ہو کر اپنا بھرم تو نہیں کھو سکتی تھیں۔

"کہتی تو ٹھیک ہو آپا۔ چلیں، اب میں ضرور اپنے آس پاس نظر رکھوں گی۔ اور ضرورت پڑی تو آپ سے بھی مشورہ کروں گی۔"

"ہاں۔۔ ہاں کیوں نہیں تم جب کہو میں حاضر۔" ان کے جملے کو اپنے ہی مطلب کا جامہ پہناتی فاخرہ کی باچھیں چر گئیں۔

"آہے ہائے۔ چائے تو پئیں آپا! ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ اور خیر سے باذل اور سجاد آگے پیچھے کے ہی ہیں۔ آپ سنائیں نا خیر سے کب لا رہی ہیں بہو۔" انہوں نے ٹرے ان کے آگے کھسکاتے خوش گوار لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"ہائے کیا پوچھتی ہو شمسہ۔ میں تو کہتی ہوں کل کی جاتی۔ آج جا کر اپنے ہیرے جیسے پتر کی دلہن گھر لے آؤں۔ ماشاء اللہ ایسا لائق فائق ہے میرا سجاد! اسے رشتہ دینے کو تو سارا خاندان ہی تیار بیٹھا ہے۔ مگر کیا کروں اتنے بہن بھائی ہیں۔ اب کسی ایک کی لے کر آؤں تو باقیوں کے منہ بنتے ہیں۔ اسی مارے ابھی میں نے اپنا منہ سی رکھا ہے۔ مجھے تو ساری بچیاں ایک جیسی ہی لگتی ہیں۔ بس اسی انتظار میں ہوں کہ ایک دو کی کہیں بات بن جائے تو پھر دیکھوں گی۔"

اور ان کی اتنی بہترین حکمت عملی کی داد نہ دی جاتی تو یقیناً زیادتی ہوتی۔ شمسہ نے تائیداً یا عادتاً سر ہلاتے چائے کا کپ اٹھا لیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہے جا رہی تھیں۔ فاخرہ کے جاتے ہی زرتاج برتن اٹھانے کمرے میں آئی تھی۔ اور شمسہ سے نظر ملتے ہی لوٹ پوٹ ہو گئی۔

"افففف۔ اللہ میری توبہ۔ آپ کیسے اتنے صبر سے ان کی باتیں سن لیتی ہیں۔ کیا آپ کو ان کے چھوڑے گئے لطیفوں پر ہنسی نہیں آتی؟ اوہ۔۔ سائرہ سلیقہ شعار۔ سجاد سمجھ دار۔ اور..... اور تائی فاخرہ جھوٹوں کی سردار۔ ہاہاہا۔" اس کی ہنسی تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ شمسہ نے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ اس کی گندم کے خوشوں سی سنہری رنگت قندھاری اناری سی ہو رہی تھی۔ تاروں سی جگمگ کرتی آنکھوں میں شفاف پانی تیرنے لگا تھا۔ موتیوں سے چمکتے دانت اور ان کے سنگ ہنستا ہوا رخسار کا تل۔ انہوں نے گھبرا کر نگاہ پھیری۔ انہیں یہی فکر رہتی تھی کہیں اسے ان کی نظر نہ لگے۔ جی ہی جی میں آیت پڑھی۔

"بری بات ہے، بڑوں کی باتوں پر نہیں ہنستے پاگل لڑکی۔ ہر ماں کو اپنے بچے ایسے ہی پیارے لگتے ہیں۔ ہر عیب ہر خامی سے پاک۔ ہمارا کیا لینا دینا۔ اور تم نے تین دن سے مجھے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہوا۔ بھئی تم تو میرے گوڈوں گٹوں میں پانی ڈال دو گی۔ اب آرام سے بیٹھو۔ رات کا کھانا میں خود بناؤں گی۔" وہ چارپائی سے اترنے کو تھیں۔ زرتاج کو ہنسی بھول گئی۔ جھٹ ان کا بازو پکڑا۔

"بالکل بھی نہیں۔ ڈاکٹر نے سختی سے آرام کی تاکید کی تھی۔ ابھی تو آپ کی دوا بھی پوری نہیں ہوئی۔ ابھی آپ کو میں کچن میں نہیں جانے دوں گی۔ ویسے بھی ہانڈی تو بن چکی ہے۔ آپ کے لیے یخنی بھی تیار ہے۔ اور چاول بھگو کر آئی ہوں۔ انہیں بھی چند منٹ ہی لگیں گے پکتے۔ اب بتائیں آپ وہاں جا کر کیا چولہے پر پانی ڈالیں گی؟" اور اس کے سوال پر انہیں ہنسی آئی تھی۔

''بہت چالاک لڑکی ہو۔ تم مجھے نکما کر کے ہی چھوڑو گی۔''

''ہاں جی بالکل۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' اس نے لاڈ سے ان کے شانے پر سر رکھا تھا۔ انہوں نے بازو کے گھیرے میں لے کر روشن پیشانی چوم لی۔ فاخرہ کا مشورہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اچھی لڑکیوں کے رشتے طے ہوتے واقعی دیر نہیں لگتی۔ انہیں بھی اس بارے میں سنجیدہ ہو کر سوچنا ہی پڑے گا۔

☆☆☆

اخبار کے پیچھے منہ دیے وہاج کب سے تائی فاخرہ اور قادر دکان دار کی بحث ملاحظہ کر رہا تھا۔ اس نے سنا تھا ان کے گھر کوئی مہمان آیا ہے۔ اور اب جس طرح وہ خریداری کر رہی تھیں۔ اس سے بھی لگ رہا تھا کہ مہمان شخصیت یقیناً بہت خاص ہے۔ ان کا تو بس نہ چل رہا تھا ساری دکان پیک کروا لیں۔ مگر جب بات آتی قیمت کی تو وہ قادر کے لتے لینے لگتیں۔ جواب حد سے زیادہ بیزار ہو چلا تھا۔

''اوہ چاچی! یہ ساری چیزیں میں نے اپنے پیو (باپ) کے کھیت میں نہیں اگائیں۔ یہ سب سامان میں شہر سے لے کر آتا ہوں۔ پیسے دے کر۔ مفت ہرگز بھی نہیں۔ اب کیا کروں۔ جو قیمت ہے وہی بتانی نی ہے گاہک کو۔''

''ہاں تو جو اصل قیمت ہے، وہ بتا نا۔ لگتا ہے تو تو اپنی قیمت بھی ساتھ ہی لگا رہا ہے۔ حد ہو گئی بے ایمانی کی۔ توبہ توبہ۔ اتنی مہنگائی۔'' انہوں نے گال پیٹ ڈالے۔

''ہاں تو یہ مہنگائی میں نے تو نہیں کی ہے نا۔ جو مجھے باتیں سنا رہی ہیں۔ جائیں ان کی خبر لیں جا کر جن لوگوں نے یہ عذاب نازل کیا ہے۔ اور آپ کو جو بھی سامان چاہیے نا، لے جائیں۔ پیسوں کا حساب میں سجاد سے کر لوں گا۔'' اس نے اپنی جان چھڑانے کو تجویز دی تھی۔ جو ان کے بھی دل کو لگی۔

''چل ٹھیک ہے تو لیتا رہ اس سے پیسے۔ نکال یہ سب۔'' انہوں نے کرتے کرتے اچھی خاصی چیزیں تھیلوں میں ڈلوا لیں۔ جنہیں اٹھانے لگیں تو پتا لگ گیا۔ گھبرا کر واپس رکھا۔ وہ اخبار کے پیچھے سے دیکھ رہا تھا۔ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ بڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔

''آپ چھوڑ دیں تائی۔ میں اٹھا لیتا ہوں۔''

''ہیں تو۔ چل ٹھیک ہے میرے پیچھے پیچھے آجا۔'' انہوں نے احسان بھی لیا تو یوں کہ جیسے الٹا اسی پر کر رہی ہوں۔ وہ سر جھٹکتا ساتھ ہو لیا۔ ان کی اولاد نے بھی ان ہی سے مزاج لیا تھا۔ بے پرواہ بے نیاز۔ وہاج کو وہ برستی بارش یاد آئی۔ جب منزل تک پہنچتے ہی اس کٹھور دل لڑکی نے کڑکتے لہجے میں پوچھا تھا۔

''کرایہ کتنا؟'' اور اس کا جی چاہا تھا۔ دل کھول کر ہنسے۔ اس نے ہتھیلی اپنے سامنے پھیلائی۔ جان بوجھ کر اسے چڑانے کو کہا۔

''وہ تو وصول ہو بھی گیا۔'' وہ اس کا انداز سمجھتے ہوئے پھنکاری تھی۔

''زیادہ بکواس نا کر۔ جو پوچھا ہے، اس کا جواب دے۔'' اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ اسی لاپروائی سے بولا۔

''تم نے کیا مجھے کوچوان سمجھ رکھا ہے؟ جانتی ہو نا لبنیٰ میرے بڑے ماموں کی بیٹی ہے۔ مریم اور زاہدہ بھی میرے لیے بہنوں جیسی ہیں۔ میں تو انہیں مشکل میں پھنسا دیکھ کر لینے چلا گیا۔ انہوں نے تو مجھ سے نہیں پوچھا کرایہ کتنا۔ اور اگر تیرے پاس زیادہ پیسے ہیں نہ تو جا کر چاچے صابر سے کرایہ پوچھ کے ان کو دے دینا۔ اور اب چل اتر نیچے۔ مجھے تانگہ واپس کرنے جانا ہے۔'' اور وہ بڑبڑ کرتی اترنے کو تھی۔

''اور ہاں سن۔'' اسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ وہ ٹھٹھک کر رکی۔

''ذرا دھیان سے اترنا۔ یہ گاؤں کی گلی ہے۔ یہاں بنا حق کے ہاتھ نہیں پکڑ سکتا میں۔'' اس نے کہا۔

"دفع دور۔" وہ چڑتی ایک ہی جست میں اتری تھی۔ پانی سے بھری گلی میں پاؤں رپٹ گیا۔

"بسم اللہ۔" وہاج کی تو جان ہی نکلنے کو تھی۔ بے اختیار لبوں سے نکلا۔ وہ تو بھلا ہو زاہدہ کا جو اس سے ایک قدم آگے تھی۔ جس کی چادر ہاتھ آنے سے بچت ہو گئی۔ ان تینوں کی کھی کھی پر وہ چراغ پا ہوتی گھر کا دروازہ دھڑ دھڑا رہی تھی۔

"آج تجھے کسی کی نظر لگی ہے سائرہ جبیں! چاچی سے کہنا، سات مرچیں وار دے۔" جاتے جاتے مریم اس کے دل کی کہہ گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے چابک لہرایا تھا۔

"ہائیں۔۔ ہائیں۔ اے رک جا۔ کدھر جا رہا ہے لڑکے؟" وہ اپنے خیالوں میں اتنا مگن تھا کہ منزل مقصود تک آ کر بھی بے خبر رہا۔ وہ تو قدم آگے بڑھا چکا ہوتا جو فاخرہ آواز نہ دیتیں۔

اس نے خفت مٹانے کو جھٹ سے سارے تھیلے وہیں تھڑے پر رکھنا چاہے کہ وہ بول پڑیں۔

"اب یہاں تک لے آئے ہو تو دو قدم اور چل لو۔ آ جاؤ اندر۔" انہوں نے دروازہ دھکیلا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلا۔ سرخ ٹائلوں والا صحن لگتا تھا آج کل خوب دل لگا کر صاف کیا جا رہا ہے۔ جس پر جا بجا گرے کچنار کے گلابی پھول عجب بہار دکھلا رہے تھے۔ دھیمی سی باس سے ساری فضا مہک رہی تھی۔

تائی فاخرہ یوں ہانپتی ہوئی رنگین پایوں والی چارپائی پر ڈھیر ہوئی تھیں گویا سارا سامان وہی اٹھا کر لائی ہیں۔ اس نے تھیلے ان کے پاس ہی رکھ دیے۔ سر اٹھا کر کچنار کے گھنے پیڑ کو دیکھا۔ جس کی پھننگ گلابی پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔

"ہر سال کی طرح آپ کی کچنار پر اس سال بھی خوب پھل لگا ہے تائی! لیکن اس بار کھانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟ یہ تو پھول بنتے جا رہے ہیں۔ لگتا ہے کسی نے اب تک ہاتھ نہیں لگایا اسے؟"

"ہاں تو کون ہاتھ لگائے۔ ارباز کی پڑھائی اس کی جان نہیں چھوڑتی۔ وہ جو سویرے بستہ لے کر نکلتا ہے تو شام واپسی ہوتی ہے۔ اور سجاد کے کاموں کی تو گنتی ہی نہیں۔ باپ کے بعد ساری ذمہ داری اس اکیلے کے سر پر ہے۔ کیا کرے وہ کہاں کہاں دھیان دے۔ میں تو خود کوئی کام اس سے نہیں کہتی۔" انہیں تو اللہ موقع دے سجاد کی جھوٹی سچی تعریفیں کرنے کا۔

"چلیں میں تو زمانے بھر کا فارغ ہوں نا اگر کہتی ہیں تو میں اتار دوں؟"

اور انہیں بھلا کیوں اعتراض ہوتا۔ فوراً سر ہلایا۔ اجازت ملنے کی دیر تھی۔ وہ بندر کی مانند جست بھرتا پیڑ پر چڑھ گیا۔ وہ تو اوپر جانے کے بعد یاد آیا۔ کلیوں کا ڈھیر کیا اوک میں اکٹھی کرے گا۔ کوئی تھیلا تو لایا نہیں۔ خیر کوئی مسئلہ نہیں وہ توڑ توڑ کر نیچے پھینکنے لگا۔ اور کھلے کھلے گلابی رنگ کے ملبوس میں کچنار کی کلیوں کا سا ہی روپ لیے اپنے ہی دھیان میں کمرے سے نکلتی سائرہ جبیں نے چیخ ماری تھی۔

"ستیاناس۔ بیڑہ غرق۔ پورے دو گھنٹے لگا کر میں نے صفائی کی تھی۔ یہ کس کم بخت نے حشر کیا ہے؟" اس نے بھناتے ہوئے سر اٹھایا۔ اسے دیکھ کر مزید سیخ پا ہوئی۔

"کیا ہو گیا ہے سائرہ۔ کبھی تو آرام سے بات کیا کرو۔ میں نے ہی کہا ہے اسے کچنار اتارنے کا۔ کوئی گند نہیں ہے یہ۔ بلکہ تم یوں کرو، یہ ایک تھیلا خالی کر کے وہاج کو پکڑا دو۔ اسے بھی آسانی ہو جائے گی۔" تائی نے بیٹی کے لتے لیے۔

"ہونہہ۔ اسے پہلے عقل نہیں تھی۔ ساتھ لے کر چڑھتا نا۔ یہ سب اس نے جان بوجھ کر کیا ہے۔ آپ نہیں جانتیں اسے۔" اور تائی نے کڑے تیوروں سے گھورا تھا۔ اب کے سخت لہجے میں جھاڑ پلائی۔

"یہ جو ذرا سے پتے بکھرے ہیں نا، وہ میں خود سمیٹ لوں گی۔ تم سے جو کہا ہے وہ کرو۔" اور وہ بڑبڑ کرتی چارپائی پر رکھے سامان کی جانب آئی۔ ایک جھٹکے سے تھیلا خالی کیا۔

"وہیں ٹھہرو میں نیچے آتا ہوں۔" اس نے

تو نہایت خوش گوار لہجے میں کہا تھا۔ وہ ٹھہرتی تو کیا۔ اسی تیکھے انداز سے اک شاخ میں تھیلا پھنسا کر واپس پلٹ گئی۔ ہاں جاتے جاتے اسے اپنی کاجل بھری گھور سیاہ آنکھوں سے گھورنا نہیں بھولی تھی۔ وہ اس کی ان ہی اداؤں پر تو فدا تھا۔ وہ مسکرائے گیا۔ کچھ ہی دیر میں اس نے بھرا ہوا تھیلا تائی کے سامنے جا رکھا تھا۔

''تھوڑی سی تم بھی گھر لے جاؤ۔ ماں سے کہنا، آلو ڈال کر پکا لے۔'' انہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری تھی۔

''اور آپ ضرور قیمہ ڈال کر پکائیں گی۔ اور آپ جیسی اچھی کچنار تو امی نہیں بنا سکتیں۔ تو آپ کی آج کی ہانڈی میں میرا بھی حصہ ہو گیا۔'' اور اس کی بے تکلفی کا انہوں نے ذرا برا نہیں مانا تھا۔ بلکہ مسکرا کر اثبات میں گردن ہلائی۔

''ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ میں ارباز کے ہاتھ بھیج دوں گی۔ اور یہ تم نے بالکل سچ کہا۔ میرے ہاتھ کی کچنار کے تو پورے سسرال میں ڈنکے بجتے تھے۔ اللہ بخشے سجاد کی دادی کو، پوری زندگی میرا کوئی گن نہیں پایا تھا۔ پر اس موسم میں خود مجھ سے فرمائش کیا کرتی تھیں۔ کہ وہی والی کچنار پکاؤ آج تو۔ اور ان کے ابا وہ تو انگلیاں چاٹتے رہ جاتے تھے۔ ان دنوں میں دوستوں کی دعوتیں بھی خوب کیا کرتے تھے۔ اور سارے ہی کچنار کھانے آتے تھے۔ مت پوچھو کہ۔''

اور اس نے تو واقعی پوچھا بھی نہیں تھا اور وہ شروع ہو گئی تھیں داستان کچنار سنانے۔ اور وہ ایسی بھی وضع دار خاتون نہ تھیں کہ اسے بیٹھنے کا ہی کہہ دیتیں وہ خود ہی ڈھیٹ بنا ان کی پائنتی ٹک کر مزے سے سنتا گیا۔ وہ کوچہ محبوب میں تھا۔ یہ خوشی کم تو نہ تھی۔ لیکن بھلا ہوا ان کی شہزادی کا جس نے اندر سے ہی ہانک لگائی تھی۔

''آج باتیں ہی کرتی رہیں گی۔ پکانے کی کچھ فکر نہیں۔ ابھی آپ کا مہمان آتا ہی ہو گا۔ کیا کھلانا ہے اسے؟ کیا یہ سوکھی کچنار ہی ڈال دیں گی اس کے آگے۔'' اور اسے یاد آیا تو بے دھڑک پوچھ لیا۔

''آپ کا مہمان کہاں سے آیا ہے تائی؟ اور ہے کہاں۔ میں نے دیکھا نہیں اسے؟''

''ہیں، تم ابھی تک احسان سے نہیں ملے؟'' وہ حیران ہوئیں۔ جھٹ نفی میں سر ہلایا۔

''احسان میرے چاچے کا بیٹا ہے۔ بھائی ہے میرا۔ پر عمر میں مجھ سے بہت چھوٹا ہے۔ میرے سجاد سے کوئی دو تین سال ہی بڑا ہو گا۔ ماشاء اللہ بڑا ہی پیارا گبھرو جوان ہے۔ ابھی وہ پندرہ سال کا تھا۔ جب اس کا رشتے کا ایک ماما اسے اپنے ساتھ کراچی لے گیا تھا۔ وہیں اس نے تعلیم مکمل کی اور اب خیر سے ادھر ہی بہت بہترین کاروبار سیٹ ہو گیا ہے اس کا۔ اتنا تو اس کے دبئی گئے ہوئے بھائی نے کما کر نہیں بھیجا۔ جتنا پیسہ اپنے ہی ملک میں رہ کر اس نے بنا لیا ہے۔'' وہ اس کے اوصاف بیان کرنے لگیں۔ اس نے اب کے اثبات میں سر ہلاتے ٹکڑا بھی لگایا۔

''جی۔ جی۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اور ہمارے ملک میں بھلا کس چیز کی کمی ہے۔ آپ یہاں کسی بھی افسر کو اٹھا کر دیکھ لیں۔ وہ بھی بڑا پیسہ کما کے بیٹھے ہیں۔ یہاں کوئی کمی تھوڑا ہے۔''

''ہاں نا۔ اب دیکھو، اسی بات پر اس کا پورے خاندان میں نام روشن ہوا ہے۔ سب اپنے بچوں کو اس کی مثالیں دیتے ہیں۔ اس نے چند ہی سالوں میں اپنی لگن اور محنت سے اتنی ترقی کر لی ہے۔ کہ باپ کا گھر پکا کروایا۔ بہنوں کی شادیوں پر خرچا کیا۔ جس بھائی کو ضرورت پڑی اسے پیسہ بھیجا۔ اور مجال ہے جو اف بھی کی ہو۔ بلکہ اس کا کراچی میں بھی یہ بڑا گھر ہے۔ جہاں نوکر چاکر۔ گاڑیاں اور دنیا جہان کا مال اسباب بھرا ہوا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، لڑکے تو بھی اسے دیکھ کر کچھ سیکھ لے۔ تیری جوانی تیرے باپ کے کس کام کی۔ جو تو اس کا بازو بھی نہ بن سکے۔ وہ بے چارا بوڑھا ہو گیا محنت کر کر کے۔'' وہ اب اس کی کھنچائی پر اتر آئی تھیں۔ وہ تابعداری سے گردن

ہلائے گیا۔
"جی۔ جی۔ تائی، بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کسی دن ماما احسان سے مل کر۔" اور انہیں کرنٹ چھو گیا تھا۔
"ہائیں۔ کون سا مایا؟ جا اوئے، وہ تیرا ماما کہاں سے آگیا۔ تیرے جتنی ہی عمر ہوگی اس کی۔ اتنا معصوم سا تو ہے میرا بھائی۔ میں نے تو اپنے بچوں کو اسے ماما نہیں کہنے دیا۔ سب اسے بھیا کہتے ہیں۔ تو بھی کہہ لینا۔" اور وہ اس نوازش پر قربان ہی ہو گیا۔
"جی۔ تائی! ٹھیک ہے میں بھیا سے ملنے ضرور آؤں گا۔ اب چلتا ہوں۔"
"وہ اکثر سجاد کے ساتھ ڈیرے پر ہی ہوتا ہے۔ جب جی چاہے وہیں جا کے مل لینا۔" اُف۔ بڑی بے دید تھی تائی۔ کام نکل گیا تو آنکھیں ماتھے پر رکھ کر کورا جواب پکڑا دیا۔ وہ برا سا منہ بناتا اٹھ آیا۔

☆☆☆

زینت خاتون وضو کر کے اٹھی تھیں جب دروازے پر دستک ہوئی۔
"آپ جا کر نماز پڑھیں۔ ارباز دیکھ لیتا ہے۔" وہ اس طرف قدم بڑھانے کو تھیں کہ زرتاج نے کہا۔ ارباز نے جا کر دروازہ کھولا تھا۔ باہر سجاد تھا جو اسی کا پتا لینے آیا تھا۔ مغرب سے پہلے سب بچوں کی چھٹی ہو چکی تھی۔ بس اک وہی نالائق تھا جس سے اب تک کل کے ٹیسٹ کی تیاری ہی مکمل نہ ہو سکی تھی۔
"یہ اب تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ اسی کی خبر لینے آیا ہوں۔ اور سناؤ کیسا پڑھتا ہے یہ۔" اس نے تو بیٹھنے کا بھی نہیں کہا تھا، وہ خود ہی موڑھا کھینچ کر اس کے سامنے ٹک گیا۔
"آپ کا بھائی ہے، کیسا پڑھ سکتا ہے یہ۔" کاپی کے ورق الٹتے مصروف سے انداز سے جانے اس نے پوچھا تھا یا بتایا۔ سجاد نے خواہ مخواہ دانت نکوستے اسی کی جانب رخ پھیرا۔
"کیوں بھئی، تنگ تو نہیں کرتے اپنی استانی کو؟"
"نہیں کچھ خاص تو نہیں۔ بس اتنا ہی کہ کل کے لیے ایک چھوٹا سا ٹیسٹ ملا ہے اسے۔ اور پورے تین گھنٹے لگا کر بھی اب تک تیاری نہیں ہو سکی ان صاحب بہادر سے۔" ارباز نے اپنی کیا تعریف کرنا تھی۔ اسی نے کاپی بند کرتے کہا تھا۔ سجاد کو تو ایک دم اتنا غصہ آیا کہ رکھ کے ایک تھپڑ ارباز کی گدی پر لگایا۔
"کیوں بے۔ کیا تکلیف ہے تجھے، پڑھتا کیوں نہیں ہے۔" اور اس عزت افزائی پر جہاں ارباز کی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا وہیں اسے بھی برا لگا۔
"یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔ میں اس لیے نہیں بتا رہی کہ آپ اسے مارنا شروع کر دیں۔ اور مار پیٹ تو ویسے بھی کسی مسئلے کا حل نہیں۔ آپ یہی بات اسے پیار سے بھی سمجھا سکتے ہیں۔"
"ہائے۔ پیار کی بات آج کل سمجھتا ہی کون ہے۔ اس جیسے لوگوں کا یہی علاج ہوتا ہے۔ خیر آئندہ تنگ نہیں کرے گا۔ اور اگر کرے تو مجھے بلوانا، میں ایک منٹ میں سیدھا کر دوں گا اسے۔ اور مجھے پتا چلا تھا اس کی کوئی فیس بھی رہتی ہے۔ کتنے پیسے ہیں؟"
اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر روپوں کا اک ڈھیر برآمد کیا تھا۔ عامیانہ لہجے میں ادا کیے گئے اس کے پہلے جملے نے ہی زرتاج کے چہرے کی رنگت گلابی کر دی تھی اس حرکت پر سرخ ہی ہو گئی۔ اگر اتنے ہی روپے جیب میں رکھے ہوتے ہیں تو ارباز کی فیس دیتے کیوں جان نکلتی ہے۔ اس روز بھی تائی نے اسے ہری جھنڈی دکھلا کر بھیج دیا تھا۔ دو دو مہینے گزر جاتے تھے انہیں فیس دیے ہوئے۔ وہ تو اگر شمسہ آپا کی سفارش نہ ہوتی تو وہ کب کی اس نالائق شاگرد کی مستقل چھٹی کر چکی ہوتی۔ یہ دردسری صرف ان کے منہ کو برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ اور اب۔ مارے غصے کے اس سے کچھ کہا ہی نہ گیا۔ ارباز نے بتایا۔

"دو ماہ سے اماں نے فیس نہیں دی۔ پندرہ سو بنتے ہیں۔"

"بس۔ اتنے سے پیسے۔"

زرتاج کا غصہ دوچند ہوا۔ یہی اتنے سے پیسے دیتے ہر ماہ اس کی ماں کو غش پڑتا تھا۔ وہ منہ سے تو نہیں کہتی تھیں۔ مگر جو رویہ تھا، وہ چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ ان کے ایسے نمونے سپوت کو وہ اللہ کے نام پر ہی پڑھا دیا کرے۔ وہ ڈھیر میں سے کڑکتے دو نیلے نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھائے ہوئے تھا۔

"شاید آپ نے ٹھیک سے سنا نہیں۔ دو ہزار نہیں۔ پندرہ سو کہا ہے ارباز نے۔" اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا تھا۔

"اوہو۔ بھئی، رکھ لو نا۔ اگلی فیس بھی تو آنے ہی والی ہو گی۔ اسی کا ایڈوانس سمجھ لو۔" وہاں سخاوت عروج پر تھی۔ اس کا ہاتھ پھر بھی حرکت میں نہیں آیا تھا۔ اس نے ارباز کو دیکھا۔ جس نے سمجھتے ہوئے بھائی کے ہاتھ سے روپے پکڑ کر اس کے پاس رکھ دیے۔ سجاد اندر ہی اندر تلملایا تھا۔

"ہونہہ۔۔ انداز تو دیکھو۔ جیسے شہزادی ہو کہیں کی۔" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

وہ بھی کوئی ایسا مسماۃ زرتاج بانو کے عشق میں گرفتار نہیں تھا۔ بس اس کی یہی بے نیازیاں گراں گزرتی تھیں۔ اگر وہ خود کو کوئی توپ شے سمجھتی تھی تو کم وہ بھی نہیں تھا۔ دیکھا جاتا تو مجموعی طور پر ایک قبول صورت نوجوان تھا۔ اس کے علاوہ اس کی جیب کبھی خالی نہیں ہوتی تھی۔ اور کیا چاہیے کسی لڑکی کو۔ اس نے تو اب تک جتنی بھی لڑکیوں سے صاحب سلامت بنائی تھی اپنی ان ہی خوبیوں کی بنیاد پر ہی بنائی تھی۔ لیکن یہی ایک ٹیڑھی کھیر تھی۔ جو قابو آ کر نہیں دے رہی تھی۔ اور اب تو اسے بھی ضد سی ہو چلی تھی۔ آخر ہے تو لڑکی۔ کتنے نخرے دکھائے گی؟ وہ اپنے خیالوں میں الجھا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو ارباز اب تمہاری بھی چھٹی۔ جاتے ہوئے دروازہ بند کرتے جانا۔ مجھے نماز پڑھنی ہے۔ وقت تنگ ہوا جا رہا ہے۔" اس نے دوسرے لفظوں میں انہیں نو دو گیارہ ہونے کا کہا تھا۔ سجاد آگ لگی شرلی کی مانند اٹھا تھا۔ لیکن بولا تو لہجے کو حتی المقدور ٹھنڈا رکھا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ تم نماز پڑھو۔ اور میرے لیے بھی دعا کرنا۔ اللہ میری ہر مراد پوری کرے۔"

اسے جاتے دیکھ کر بڑبڑا رہی تھی۔

"نامراد نہ ہو تو۔" سجاد کی تو شکل سے بھی اسے نفرت تھی۔ کیسے بھول جاتی اسی کم بخت کی وجہ سے ابا نے اس کا اسکول جانا چھڑوا دیا تھا۔ نویں کلاس میں تھی۔ جب اک دن بس خراب ہونے کے باعث انہیں پیدل واپس آنا پڑا تھا۔ سڑک کے بجائے اس کی سہیلیوں نے کچی پکی پگڈنڈی والا راستہ چنا تھا۔ وجہ وہ بیر کے درخت تھے جو راستے میں پڑتے تھے۔ اور وہ ہنستی مسکراتی شرارتیں کرتی ہوئی آ رہی تھیں کہ اک جگہ جھاڑی میں اس کا پلو اٹک گیا تھا۔ اس نے سب کو رکنے کا بھی کہا مگر سنتا کون، سب مگن سی آگے بھاگ گئی تھیں وہ وہیں بیٹھ کر کانٹے چھڑانے لگی۔

تب ہی کچھ فاصلے پر جھاڑیوں میں چھپے تین نقاب پوش کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ جو غالباً انہیں ہی آتے دیکھ کر چھپ گئے تھے۔ اور اب یہی سمجھ کر کہ وہ سب جا چکی ہیں۔ ان کا رخ گھاس چرتی بکریوں کی طرف تھا۔ اف۔۔ اس کا تو مارے دہشت کے اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

اگر ان میں سے کسی کی نظر اس پر پڑ گئی تو۔ بس اسی خیال سے وہ بالکل ہی نیچے بیٹھ گئی۔

ان دنوں بقر عید قریب تھی۔ اور تب ایسے چوروں کے گروہ کافی متحرک ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک بکری کو قابو کر کے رسی ڈال لی تھی۔ کچھ بکری کی مزاحمت اور مسلسل "میں میں" پھر دور سے اک سائیکل سوار کو آتے دیکھ کر اس کے اندر کی بہادر زرتاج بانو جاگ اٹھی تھی۔ اس نے یک لخت ہی "چور چور" کا شور مچا دیا تھا۔ اور اچھا ہی ہوا کیونکہ کسی درخت تلے سویا بکریوں کا مالک بھی بیدار ہو گیا تھا

اور وہ سائیکل سوار بھی تیزی سے وہاں تک پہنچا۔ لیکن تب تک وہ چور بکری کو وہیں پھینک پھانک کر فرار ہو چکے تھے۔

اسی دوڑ بھاگ میں ان میں سے دو کے نقاب بھی کھل گئے تھے۔ اور ایک کو دیکھ کر وہ شاکڈ ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ کوئی اور نہیں۔ بلکہ ان کا محلے دار اور اس کی پیاری سہیلی سائرہ جبیں کا بھائی سجاد تھا۔

"پتری! تم نے ان میں سے کسی کو دیکھا۔ پہچان لو گی کون تھے وہ؟" ریوڑ کا مالک اس سے پوچھ رہا تھا۔ اور اس نے بلا جھجک نام لے دیا تھا۔

"ہاں۔ چاچا بالکل پہچان لوں گی۔ ان میں سے ایک ہمارے ہی گاؤں کا تھا۔ وہ...... وہ سجاد بھائی تھا۔"

اور سائرہ نے تو سنتے ہی اسے زور کا دھکا مارا تھا۔

"پاگل ہوئی ہو۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ میرا بھائی چور کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔ ایسے کام ہم نہیں کرتے۔ ایسے کام تم لوگ کرتے ہوگے۔ وہ تمہارا بھائی ہوگا۔" وہ تو لڑنے مرنے پر آ گئی تھی۔

"ہرگز بھی نہیں۔ وہ تمہارا ہی بھائی تھا۔ وہ سجاد بھائی تھا۔" وہ اپنے کہے پر مصر تھی۔ اور تو اور کئی لوگوں کے درمیان بھی نہ مکری۔ جبکہ سجاد نے صاف کہا تھا یہ اس پر الزام ہے۔ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ تب اچھا خاصا تنازعہ بنا۔ ان دونوں گھروں کے درمیان لڑائی ہوئی۔ ابا نے تو غصے میں آ کر اسے ہی گھر بٹھا لیا تھا۔ انہیں بیٹی کی پڑھائی سے زیادہ اس کی اور اپنی عزت عزیز تھی۔ جو اس طرح کی حرکتیں کر سکتا ہے۔ اس کا کیا اعتبار اور کیا کر گزرے۔

تب کچھ عرصہ یہ کہانی گرم رہی پھر ٹھنڈی پڑتی گئی۔ سب بھول بھال گئے۔ ان دونوں گھرانوں کے درمیان آنا جانا بھی ہونے لگا۔ لیکن وہ کیسے بھول جاتی۔ سجاد کی وجہ سے اس کا پورا ایک سال ضائع ہوا تھا۔ وہ تو پھر بھلا ہو آپا شمسہ کا جن کے سمجھانے پر ابا نے اسے گھر پر رہتے ہوئے تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دی تھی۔ اور ان ہی کے کہنے پر وہ ارباز کو بھی برداشت کر رہی تھی۔ اور اب یوں سجاد کا آنا جانا۔ یہ تو اسے قطعاً برداشت نہ ہوگا۔ آپا کو بتانا ہی پڑے گا۔ اس نے مصمم ارادہ باندھا تھا۔

☆☆☆

جب بس نے اسے پکے پل پر اتارا۔ تب دن اپنا خیمہ سمیٹ رہا تھا۔ اور اک البیلی سی شام اپنا نارنجی آنچل پھیلائے ہر منظر ڈھانپنے کو تھی۔ تمام پنکھ پکھیرو بھی واپسی کے سفر پر گامزن تھے۔ نہر کنارے اگے سرکنڈوں میں چھپتی چڑیوں نے اک آفت مچا رکھی تھی۔ وہیں لمبی گردنوں والی بطخوں کو فکر پڑی ہوئی تھی۔ جو کوئیک کوئیک کرتی اپنے بچوں کو گھیر رہی تھیں۔ سرزمین پر ڈالے اک کتا انہیں للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر آگے بڑھ کر کسی کو دبوچنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے اچھی طرح خبر تھی۔ اگر کسی ایک کی جانب بھی ہاتھ بڑھایا تو ان لمبی گردن والیوں نے اسے نوچ کر کھا جانا ہے۔ وہ بھی خوب جانتا تھا ان کے راستے میں آنا خطرے سے خالی نہیں تب ہی وہیں ٹھہر کر ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ بچپن کی کئی سہانی یادوں میں اک یاد وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جو ان چوزوں کو پکڑنے کے شوق میں ایک بار ان ہی جیسی ایک بطخ نے دی تھی۔ جس نے پر اور چونچ مار مار کر اس کی ٹانگیں زخمی کر ڈالی تھیں۔ وہ تو جانے اس کا اور کیا حشر کرتی کہ اسے بچانے کو اک پیاری سی پری۔ جو ننھے ہاتھوں میں بانس پکڑے اس بطخ پر پل پڑی تھی۔

"اوہ ڈاکٹر پتر! تو کب آیا۔" چائے کے ڈھابے والے چاچا عبدل اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھے پوچھ رہے تھے۔ حسین یاد ہوا میں تحلیل ہوئی تھی۔

"بس ابھی آیا ہوں چاچا۔ آپ سنائیں کیسے ہیں؟" اور وہ تو جیسے اسی انتظار میں تھے۔ اپنا حال احوال سناتے سناتے اپنی بھوری اور کالی کی صحت

کے بارے بھی بتانے لگے۔ اور وہ تھا بھی تو گاؤں کا واحد ڈنگر ڈاکٹر۔ گو کہ ابھی وہ منزل تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن یہاں کے لوگوں نے اسے دل سے اسی دن ڈاکٹر تسلیم کر لیا تھا۔ جس دن اس کا داخلہ کالج میں ہوا تھا۔ صبح پہلی فرصت میں ان کی بھوری کا معائنہ کرنے کا وعدہ کر کے وہ تیز قدموں سے چل پڑا تھا۔ اپنی گلی میں آ کر ہمیشہ کی طرح خوشگواریت کا احساس ہوا۔

وہ اس کا چاند کی مانند چمکتا چہرہ دیکھنے کو اس دروازے کے سامنے رک گیا تھا۔ جو اس کے گھر سے پہلے آتا تھا۔ اسے تو کسی بہانے کی بھی ضرورت نہیں۔ وہ صرف وہاج کا ہی تو پوچھے گا۔ دستک کے لیے ہاتھ بڑھانے کو تھا کہ پردہ اٹھا کر کوئی باہر نکلا۔

''واہ جی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ لگتا ہے ابھی پہنچے ہو اور آتے ہی پہلے اس دروازے پر۔''

اس نے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا تھا۔ اور اس کے انداز سے خائف ہوتے باذل نے جلدی سے وضاحت کی۔

''ہاں، وہاج سے تھا۔ لیکن تم ادھر کیا کر رہے ہو؟''

''میں......'' اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا پھر محتاط نظر سے ادھر ادھر دیکھتے دھیمے سے لہجے میں بولا۔

''مجھے تو زرتاج نے بلوایا تھا۔ کوئی کام تھا اسے مجھ سے۔ وہ تو چائے کے لیے روک رہی تھی۔ پر میں ہی نہیں ٹھہرا۔ شام پڑ رہی ہے نا، اچھا نہیں لگتا اس وقت۔ خیر میرا تو چکر لگتا ہی رہتا ہے پھر آ جاؤں گا۔ ویسے وہاج نہیں ہے گھر پہ۔'' اس نے اطلاع بہم پہنچاتے مزے سے بائیک کو کک لگائی تھی اور یہ جا وہ جا۔ کیا تھا اس کے انداز میں؟ وہ خود تو چلا گیا تھا لیکن وہ کتنی ہی دیر ہل نہ سکا۔

☆☆☆

ہر صبح کی طرح آج کی صبح بھی ویسی ہی تھی۔ وہی چڑیوں کی چہچہاہٹ، سورج کی کرنیں، صحن میں موجود ہل ہل کر سبق یاد کرتی آپا کی شاگرد بچیاں۔

لیکن ان آوازوں کے ساتھ اک اور آواز بھی گونج رہی تھی۔ غبار آلود ہوا، دل ایسا مضطرب تھا کہ وہ عالم طیش میں باہر نکل آیا۔

''چلو بچو آج کا سبق اتنا ہی کافی ہے۔ اب سارے چھٹی کرو اور دوڑ جاؤ اپنے اپنے گھر۔ کوئی مجھے نظر نا آئے اب۔'' اور بچیوں کو کیا چاہیے تھا۔ خوشی خوشی سپارے جزدان میں رکھنے لگیں۔ وہ ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھی۔ جس پر اک پارہ بھری نگاہ ڈالتا وہ شمسہ کے پاس جا بیٹھا تھا۔ اس کا تو دل ہی ڈوب گیا۔

''آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں وہاں کیسے رہتا ہوں۔ سارا دن پڑھائی کی کھجل خواری کے بعد ہاسٹل کے گھٹن زدہ کمرے میں سکون کی نیند بھی میسر نہیں ہوتی۔ خواہش ہوتی ہے گھر جا کر خوب جی بھر کر سوؤں گا۔ اور افسوس یہاں آ کر بھی وہی حال۔ کسی کو تو میں کیا کہوں دکھ تو یہ ہے کہ آپ کو بھی ذرا احساس نہیں ہے میرا۔ بندہ یہی دیکھ لے کہ کوئی سو مر رہا ہے تو شور ہی کم کروا دے۔'' وہ پھٹ ہی پڑا تھا۔ شمسہ آپا نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ ساکت وہ بھی ہوئی تھی۔ اس کے اندر کی بات ان کے لبوں سے نکلی۔

''ہائے اللہ نہ کرے۔ صبح سویرے کیسے بری فال منہ سے نکال رہے ہو۔ بندہ بات تو ڈھنگ سے کرتا ہے۔''

''چاہے دوسرے کام ڈھنگ سے نہ کریں۔ بس مجھے ہی ڈانٹیں۔ کسی اور کو کچھ مت کہیے گا۔'' اس کا منہ کچھ اور کپا ہوا تھا۔

''کس کو کہوں؟ یہ بچیاں روز آتی ہیں۔ اور اسی طرح پڑھتی ہیں۔ تم بھی جانتے ہو۔ اور تم پہلے تو کبھی تنگ نہیں ہوئے۔ آج کیا نیا ہوا ہے۔ خیر تو ہے نا تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

وہ جب سے آیا تھا۔ وہ اس کا بگڑا ہوا موڈ ہی دیکھ رہی تھیں۔ گھبرا کر پوچھا۔ وہ کیا بتاتا بس اک الجھی ہوئی سی نظر سر جھکائے بیٹھی دشمن جاں پر ڈالتا واپس ان ہی قدموں پر پلٹ گیا۔ جہاں وہ اپنی جگہ

ہل کر رہ گئی تھیں۔ وہیں اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔
"کیا ہوا ہے انہیں۔ صبح صبح اتنے غصہ میں کیوں ہیں؟" اس کی تو جان ہوا ہونے کو تھی۔ وہ تو ہمیشہ سے اس کی نرم نگاہی کی عادی تھی۔ وہ رو دینے کو تھی۔ شمسہ آپا نے ہاتھ ہوا میں لہرایا۔
"اللہ ہی جانے۔ جب سے آیا ہے یہی شکل بنائی ہوئی ہے۔ رات تو کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا بس تھکن کا بہانہ کر کے جلدی سو گیا تھا۔ میاں جی اتنے اداس تھے اس کے لیے۔ اس نے تو ان سے بھی بیٹھ کر دو گھڑی باتیں نہیں کیں۔ اور اب۔ کہیں تم سے تو کوئی بات نہیں ہوئی؟" وہ جانتی بھی تھیں۔ بچپن میں ایک ساتھ کھیلنے والے جب سے سیانے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان آپ ہی آپ تکلف کی اونچی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ انہیں تو کچھ سمجھانا ہی نہیں پڑا تھا۔ اگر ان کا شہزادہ باادب تھا تو کم احتیاط پسند وہ بھی نہیں تھی۔ انہیں اس کی یہی عادتیں تو اچھی لگتی تھیں کہ وہ کبھی اس سے نظر ملا کر بات نہیں کرتی تھی۔ بازل تو یوں بھی مہمانوں کی طرح ایک دو دن کے لیے گھر آتا تھا۔ اور تب وہ یا تو دیوار سے ہی جھانک لیتی یا پھر کھڑے کھڑے آتی اور واپس چل دیتی۔ اور ان کے سوال پر اس نے بوکھلا کر منہ اٹھایا تھا۔
"نن..... نہیں۔ مجھے تو پتا ہی نہیں ہے ان کے آنے کا۔ میں نے تو اب دیکھا ہے انہیں۔"
اور یکدم اس کی پیلی پڑتی رنگت دیکھ کر انہیں بھی احساس ہوا۔ وہ غلط سوال کر گئی ہیں۔ تو اثر زائل کرنے کو پھیکا سا مسکرا دیں۔
"ہاں۔ بس مجھے دھیان نہیں رہا۔ یونہی خیال آیا تھا۔ کیا کروں۔ فکر جو لگ گئی ہے۔ پچھلے ہفتے ٹیسٹ تھے اس کے۔ کہیں ان میں تو فیل نہیں ہو گیا؟"
"ہرگز بھی نہیں، ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔" ان کے خدشے کی اس نے پل میں نفی کی تھی۔
"کہیں اپنے دوستوں سے ہی نہ لڑ پڑا ہو۔ وہ کم بختی مارے تنگ بھی تو بہت کرتے ہیں۔ نہ کتابیں سلامت رہنے دی ہیں نہ اس کے نوٹس چھوڑتے ہیں۔ اور تو اور کوئی کھانے پینے کی چیزیں بھی نہیں رہنے دیتے، وہ بھی منٹوں میں چٹ کر جاتے ہیں۔" ان کا تو اس دن کا غصہ ہی کم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔
"اب خدانخواستہ ایسے ندیدے بھی نہیں ہیں کہ اتنی سی بات پر دوستوں سے لڑ پڑیں۔" ادھر سے پھر جھٹ تردیدی بیان جاری ہوا تھا۔ انہوں نے مٹھی ٹھوڑی تلے رکھ کر بغور اسے دیکھا۔ وہ جو بے دھڑک بول رہی تھی۔ گڑبڑا کر کھڑی ہوئی۔
"وہ...... وہ میاں جی لسی کا پوچھ رہے تھے۔ میں چاٹی میں مدھانی ڈال دیتی ہوں۔" منظر سے غائب ہونے میں اس نے اک پل نہیں لگایا تھا۔ باورچی خانے تک اس کا پیچھا کرتی ان کی نگاہ میں کسی خیال کی پرچھائیاں تھیں۔ جو لحہ بہ لحہ رنگ بدلتا ان کے چہرہ پر مسکراہٹ لے آیا تھا۔ موقع اچھا ہے وہ گھر آیا ہوا ہے کیوں نہ بات کر ہی لیں۔ انہوں نے ارادہ باندھا تھا۔
"یہ آپ کس وجہ سے اکیلے ہی اکیلے خوش ہو رہی ہیں؟" وہ جانے کب چپکے سے پاس آ بیٹھا تھا۔ اپنے ہی دھیان میں ڈوبے انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ چونک کر دیکھا۔
"ہوتی ہیں کچھ وجوہات۔ تم اپنی شکل کے زاویے درست کرو تو تمہیں بھی بتاؤں۔" انہوں نے پیار سے اس کے بکھرے بال سمیٹے تھے۔
"فی الحال تو کچھ نہیں سننا مجھے۔ میں دیکھ رہا ہوں اب آپ اس طرح میرے آرام کا خیال نہیں رکھتی ہیں جیسے پہلے رکھا کرتی تھیں۔ اور اگر اب آپ سے گھر کے کام نہیں ہوتے نا تو پلیز کوئی ملازمہ رکھ لیں۔ جب بھی دیکھو کسی نہ کسی کو کچن میں گھسایا ہوتا ہے آپ نے۔" اس کا جلا کٹا انداز انہیں تو حیران ہی کر گیا۔ گھبرا کر اس طرف دیکھا۔ پھر گھور کر اسے۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ آہستہ بولو، اس نے سن لیا تو کتنا دکھ ہو گا اسے۔ اور خدانخواستہ میں کیوں بلانے

لگی کام کے لیے۔ یوں بھی وہ کسی نہیں ہے۔ بیٹی ہے میری۔ اور ایک بیٹی کی طرح ہی میرا احساس کرتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ میری تابعدار شاگرد بھی ہے۔ قرآن پڑھایا ہے میں نے اسے۔ اور اسے پتا ہے اب میری اتنی نظر نہیں رہ گئی۔ بچیوں کو سبق دینا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اسی لیے میرے بن کہے ہی اس نے یہ فریضہ بھی اپنے سر لے لیا ہے۔ یہ تو اس کی نیکی ہے صبح سویرے اپنے کام چھوڑ کر یہاں آ جاتی ہے۔ اور تم نے کتنی غلط بات کی ہے۔ بہت دل دکھا ہے میرا۔"

انہیں سچ میں بہت برا لگا تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی پلان کر رہی تھیں اور وہ تھا کہ جانے کیا انٹ شنٹ بول رہا تھا۔

"اور جو میرا دل دکھا ہے وہ۔" وہ انتہائی دھیمے سروں میں بڑبڑایا تھا۔ ان کے خاک پلے نہ پڑا تو الجھ کر پوچھا۔

"کیا کہا تم نے۔"

"کچھ نہیں اور کتنے افسوس کی بات ہے، آپ کی نظر خراب ہے اور سارے زمانے کو علم ہے بس ایک مجھے ہی بتانا گوارا نہیں کیا۔ اوروں سے تو بہت پیار ہے اور بیٹے کی یہ اوقات ہے آپ کے نزدیک کہ اسے اتنی اہم بات ہی نہیں بتائی گئی۔ آپ آج ہی میرے ساتھ شہر چلیں گی۔ اور اپنی نظر۔"

"ارے نہیں میری جان! اب ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"میں نے کہا ہے نا آپ آج ہی چلیں گی میرے ساتھ۔ اور مسئلہ ایسا یا ویسا نہیں ہوتا۔ مسئلہ مسئلہ ہی ہوتا ہے۔ اگر بروقت تدارک نا کیا جائے تو مزید آزار بن سکتا ہے۔ اور یاد رکھیں اپنے راز ہمیشہ ان لوگوں کے پاس امانت رکھوائیں جو اس قابل ہوں۔ جو لوگ پہلے ہی زمانے میں اپنے کرموں کے باعث بد دیانت اور خائن کہلائے جاتے ہوں وہ آپ کے کیا خاک امین بنیں گے؟ ان پر کیا گیا بھروسا آپ کو کوئی گہری چوٹ بھی پہنچا سکتا ہے۔"

ان کے لیے چائے لاتی زرتاج بانو کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس نے یہ سب نصیحت کسے کی ہے نہ ان کی سمجھ میں آئی تھی اور نہ ہی وہ سمجھی تھی۔ جو ایک بار پھر اس کی اجنبی نظر سے بدحواس ہوئی تھی۔ وہ تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس جا چکا تھا۔ وہ وہیں بت بنی رہ گئی۔

☆☆☆

"ٹھا" کی زوردار آواز سے پوری فضا تھرا اٹھی تھی۔ شاخوں پر جھولتے پرندوں نے گھبرا کر اڑان بھری۔ کچھ دور سے آتے چرواہے کی بکریاں بھی تتر بتر ہوئی تھیں۔ نشانہ پچھلی بار کی طرح اب بھی خطا گیا تھا۔ وہاج برا سا منہ بنائے مسلسل دائیں بائیں گردن کو حرکت دیے جا رہا تھا۔

"تو جناب محترم باذل جمال صاحب! ثابت یہ ہوا کہ اب آپ کے یہ ہاتھ صرف کتابیں اٹھا سکتے ہیں یا پھر ڈاکٹری آلات۔ یہ بندوق تو آپ کے بس کا روگ نہیں رہی۔ اسی لیے مجھ غریب کے قیمتی چھرے ضائع کرنے سے گریز کریں۔ میں نے تو سوچا تھا کہ آج تمہارے ہاتھوں کا کیا گیا شکار کا گوشت بھون کر کھاؤں گا۔ لیکن لگتا ہے اب یہ گناہ بھی مجھے اپنے سر ہی لینا پڑے گا۔ ادھر دکھاؤ بندوق۔ اور غور سے دیکھو، کیسے باندھتے ہیں نشانہ۔"

"چھوڑ یار! کیا پیچھے پڑ جاتا ہے تو ان معصوم پرندوں کے۔ ذرا سی لذت کے لیے ایسے خوبصورت جانداروں کی جان لینا کوئی انسانیت تو نہیں۔ تمہیں تو پتا نہیں کیا فضول شوق ہے۔ ویسے بھی مفتے اور طفیلیے دنیا میں عزت کی زندگی نہیں جیتے۔ بہت ہو گیا۔ اب کچھ اپنے ہاتھ پیر ہلانا سیکھو تاکہ تمہارے پاس بھی کوئی چار پیسے آ سکیں۔ اور ان بے چاروں کی بھی جان بخشی ہو۔" وہ تو جانے کس بات پر تپ رہا تھا۔ ساری کھولن اس پر انڈیل دی۔ وہاج نے سر سے پاؤں تک گھورا۔

"اوئے ہوئے۔ کہیں آتے ہوئے تائی فاخرہ کے گھر کے سائے تلے سے تو ہو کر نہیں آئے؟ بالکل

وہی لب ولہجہ۔ وہی انداز۔ اب یہ وقت آ گیا مجھ ناچیز پر کہ میرے یار بیلی بھی طعنے دیں گے۔ تو پھر سن لے۔ مجھے قسم ہے تیرے ان طعنوں کی۔ اگلی بار جب ہم یہاں ملیں گے تو میں تجھے اس ریوڑ میں سے اسی بکری کی بچی کھلاؤں گا۔ جس پر تو ہاتھ رکھے گا۔" وہ ایسا دعویٰ کر رہا تھا۔ جس پر باذل گردن جھٹک کر طنزاً مسکرا دیا۔ اور اس کی ایسی مسکراہٹ نے اسے اور جوش دلایا تھا۔

"لگتا ہے تو میری بات کو مذاق سمجھ رہا ہے۔ ایاز بھائی! تم اس بات کے گواہ رہنا۔ اگلی بار ہم یہاں ملیں گے تو تمہارے ریوڑ میں سے میں وہی بکری خریدوں گا جس پر میرا یار باذل جمال ہاتھ رکھے گا۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ اب مجھے بھی اس دن کا انتظار رہے گا۔" بکریوں کو ہانکتے ایاز نے ہامی بھری تھی۔

"پاگل ہو گیا ہے۔ میں نے تو بس ویسے ہی غصے میں کہہ دیا تھا۔ اور تم۔" وہ تو بول کر پچھتایا۔ جو ایک بار ٹھان لے پھر اسے ہر صورت پورا کر کے ہی رہتا ہے۔ وہاج نے پیار سے اس کے شانے پر بازو پھیلایا۔

"میرے دوست نے غصے میں کہا اور میں نے مان لیا۔ اگر کچھ اور بھی دل میں ہے تو وہ بھی کہہ دو۔ میں وہ بھی سن لوں گا۔" اور وہ کس دل سے کہہ دیتا۔ اندر کون سا احساس پن کی طرح چبھ رہا ہے۔ کسی کل چین نہیں لینے دے رہا۔ لگتا تھا پیروں کے نیچے کسی نے تپتی ریت بچھا دی ہے۔ وہ تو بے فکر تھا۔ ضروری تو نہیں ہر بار لفظوں کا سہارا لیا جائے۔ کچھ جذبات آنکھوں کی زبان بولتے زیادہ دلنشیں لگتے ہیں۔ وہ تو اب تک اسی لہجے میں بات کرتا آیا تھا اور یقین تھا وہ سمجھ بھی لیتی ہے۔ تو پھر اب۔

"سارا زمانہ ہی مجھے دنیا بھر کا فارغ انسان سمجھتا ہے۔ جس کو دیکھو، وہ نصیحتیں کرنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور تب مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی ہے۔ سب کو کتنی پروا ہے نا میری۔ ویسے یہ احساس بھی بڑے مزے کا ہوتا ہے۔ ہے نا؟" اس کے اندر کی اٹھا پٹخ سے بے خبر وہاج ہنستے ہوئے کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ اس نے بے دھیانی میں سر ہلا دیا۔

"لیکن تو تو مجھے جانتا ہے نا یار۔ تجھے اچھی طرح پتا ہے میں کس کوشش میں تھا۔ اور اب سب سے پہلے تجھ سے ہی شیئر کر رہا ہوں کہ جلد ہی سب کو ایک اچھی خبر دوں گا۔"

"اچھا!!!۔ چلو یہ تو اچھی بات ہے۔" جتنی اہم خبر اس نے دی تھی، اس پر اس کا اتنا بے تاثر سا "اچھا" کچھ مشکوک سا تھا۔ وہاج نے پورے دھیان سے دیکھا۔

"بس اتنا خشک سا "اچھا" کیا مطلب تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"نہیں، بہت خوشی ہوئی ہے۔ بہت سی دعائیں ہیں تمہارے لیے۔"

"نوازش۔ مہربانی ہے آپ کی۔ آپ دعا کرتے ہیں میرے لیے۔" وہ اس کے انداز پر جل بھن ہی تو گیا تھا۔ منہ بگاڑ کر کہا۔ باذل کو لامحالہ مسکرانا پڑا۔

"اُفوہ۔ تم تو بچوں کی طرح منہ بنانے لگے ہو یار۔ سچ کہا تو ہے بہت خوشی ہوئی ہے۔ اب کیا الٹی چھلانگیں لگانا شروع کر دوں؟"

"تم سے مجھے سیدھی کی بھی توقع نہیں، تم الٹی کی بات کرتے ہو۔ خیر چھوڑو۔ شام ہو رہی ہے گھر واپس چلتے ہیں۔ اس سے پہلے کہ آپا تمہاری تلاش میں ہرکارے دوڑا دیں۔" بندوق کاندھے پر ٹکائے وہ کہتے ساتھ ہی چل پڑا تھا۔ اک گہری سانس بھرتے اسے بھی تقلید کرنا پڑی۔ کچی پگڈنڈی پر وہ آگے پیچھے آ رہے تھے۔ جب اک بائیک تیزی سے خاک اڑاتی ان کے قریب سے گزر گئی۔ باذل نے آنکھوں میں گھستی دھول ہاتھ سے پرے کرتے دیکھا۔ وہ سجاد تھا۔ زیر لب دو چار گالیاں بے اختیار ہی امڈ آئی تھیں۔ تپ کر کہا۔

"یہ آج کل کچھ زیادہ ہی شوخا نہیں ہوگیا؟"

"صرف اسی پر کیا موقوف۔ اس کا تو پورا خاندان ہی شوخا ہے۔" وہاج بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اوراس کے دھیان میں کسی اور کا چہرہ لہرایا تھا۔ جس کے نزدیک اس کی محبت کی اوقات اس اڑتی دھول برابر ہی تھی۔ کبھی کبھی تو اسے خود پر ہی غصہ آنے لگتا تھا۔ دل لگایا بھی تو کس جگہ۔ لیکن کیا کوئی سوچ سمجھ کر بھی دل لگاتا ہے؟

"اور یہ اس کے ساتھ کون تھا؟ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ ہمارے علاقے کا تو نہیں لگ رہا؟" باذل اس کے پیچھے بیٹھے نمونے کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔ جو اپنے حلیے سے ہی عجیب سا دکھ رہا تھا۔ جس نے تیز سبز رنگ کی جینز کے ساتھ آتشی گلابی رنگ کی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی۔ ڈائی کیے بال پہاڑی بکرے کے سر پر اگے بالوں جیسے ہی تھے اور جو دور جانے پر بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے شیشوں والی عینک سے آدھے ڈھکے چہرے کو اک نظر دیکھنے سے ہی پتا چل گیا تھا کہ موصوف باقاعدگی سے رنگ گورا کرنے والی کریم کا استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ گردن اور ہاتھوں کا شکل سے اختلاف بھی یہی بتا رہا تھا۔ اور گلے میں پہنی سنہری چین کے لشکارے تو یہاں تک آرہے تھے۔ باذل نے اسے دیکھا اور دونوں ساری الجھنیں بھول بھال مسکرا دیے۔

"ایمان سے یار کیا چیز تھی یہ۔"

"وہی نہیں ہے۔ اور تائی فاخرہ کا بھائی لگتا ہے رشتے میں۔ بڑی توپ شے ہے۔ کراچی سے آیا ہے۔ میں نے بھی جب پہلی بار دیکھا تھا نا تو ایسے ہی شاکڈ ہوا تھا۔ جبکہ جو تعریفیں سن رکھی تھیں اس سے تو اور ہی خاکہ تیار ہوا تھا میرے ذہن میں۔ لیکن خیر۔ ہوتے ہیں دنیا میں کچھ ایسے پیس بھی۔ ملو گے تو ضرور انجوائے کرو گے۔"

"دفع دور، مجھے کیا ضرورت ہے ملنے کی۔" باذل کو تو جھرجھری سی آگئی اس خیال سے ہی۔ جبکہ وہاج کو تو اگلی ملاقات کالائحہ عمل تیار کرنا تھا۔ اب کیا کیا جاتا کہ اس کی تو مجبوری تھی نا۔

واہ ری محبت۔ تیرے یہ چلن۔ جن کی شکلیں دیکھنے کو دل نہیں کرتا، ان کے جوتے بھی دیکھنا پڑتے ہیں۔ ہک ہاہ۔ اس کے سینے سے اک سرد آہ نکل کر فضا میں گھل مل گئی تھی۔

☆☆☆

اماں کا ڈر تو لگتا تھا اس کی جان لے کر ہی ٹلے گا۔ پہلے تو اس کے بہانے چل بھی جاتے تھے۔ لیکن جب سے ان کا چچا زاد بھائی آیا تھا۔ انہوں نے اس کے کسی بھی واویلے پر کان دھرنا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ جو کچھ انہوں نے سمجھایا تھا، وہ ہاتھ باندھے اس پر عمل کرنے پر مجبور تھی۔ کیا کرتی اس میں سراسر فائدہ بھی تو اپنا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ہائے۔ یہ انسان کی خواہشات بھی نا ن کیسے کیسے امتحان لیتی ہیں۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہ کرنا پڑتا ہے کہ الاماں۔ وہ آج پھر پھونکیں مار مار بے حال ہو رہی تھی۔ تب ہی وہ اس کے پاس آ بیٹھا۔

"اوہ۔۔ پریٹی گرل۔ یہ تم کس جھنجھٹ میں پھنسی ہوئی ہو۔ یہ کام تمہارے کرنے کا نہیں ہے۔ دیکھو تمہاری ان خوبصورت آنکھوں کا کیا حشر ہوگیا ہے۔ اوہ گاڈ۔"

اتنی جلن تو اس کی آنکھوں میں نہیں ہو رہی ہوگی۔ جتنا کہ ▪▪ بے چین ہوا تھا۔ سائرہ نے ہتھیلی سے رگڑ کر مندی مندی آنکھوں کو پورا کھولنے کی سعی کی۔

"ہاں تو کیا کروں۔ اماں سے اب اتنا کام ہوتا نہیں ہے۔ مجھے ہی کرنا ہے نا یہ سب۔ آپ دیکھتے ہیں نا سارے گھر کا کام میں خود کرتی ہوں۔" وہ اور مظلوم بنی۔

"جب کہ تمہیں نہیں کرنا چاہئیں۔ تم ان کاموں کے لیے تھوڑا بنی ہو۔ میں آپا سے کہتا ہوں وہ گھر کے لیے کوئی میڈ ہائر کر لیں۔ اور خاص طور پر اس چولہے کے پاس تو بالکل بھی نہ آیا کرو۔ تمہاری

اسلن اتنا گلو کرتی ہے۔ سب خراب ہو جائے گی۔ تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے اپنا۔" وہ نثار ہوتی نگاہوں سے اس کے سرخ پڑتے رخسار دیکھ رہا تھا۔

"میرے احساس کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ جب کوئی اور ہے ہی نہیں احساس کرنے والا۔ اماں کا تو بس نہیں چلتا مجھے اس چولہے میں ہی جھونک دیں۔" اس کی بے چارگی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ شکل پر کچھ اور مظلومیت طاری ہوئی۔ جس کا خاطر خواہ اثر بھی پڑا۔

"اوہ۔ سویٹی۔ ڈونٹ وری۔ میں ہوں نا۔ میں کروں گا نا احساس۔ میں رکھوں گا تمہارا خیال۔ اللہ نے تمہیں اس طرح کے کچن کے لیے پیدا نہیں کیا۔ تمہارے لیے تو بہترین سا امریکن کچن ہونا چاہیے۔ جیسا کہ میرے گھر کا کچن۔ وہاں ساری سہولیات ہیں۔ کام اتنا آسان ہے وہاں۔ میں اپنے لیے منٹوں میں کھانا بنا لیتا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا۔" اور اب کے وہ شدید متاثر ہوئی تھی۔ پہلے سے ہی بڑی بڑی آنکھیں کچھ اور پھیلا کر پوچھا۔

"ہائے سچ میں۔ کیا آپ کا کچن اس طرح کا ہے جیسا کہ ڈراموں میں دکھاتے ہیں؟" شکل اللہ نے ایسی بھولی سی بنائی تھی۔ احسان جیسا گھاگ آدمی تو گھائل ہو گیا تھا۔ سگریٹ کے دھوئیں سے کالے پڑتے ہونٹ پھیلا کر اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

"نا صرف کچن بلکہ میرا پورا گھر ہی ایسا ہے جیسا ڈراموں میں دکھاتے ہیں۔ کراچی یہاں سے قریب ہوتا تو میں تمہیں ابھی لے چلتا۔ تم اپنی ان حسین آنکھوں سے دیکھتیں اور خوش ہوتیں۔ اور میں تمہیں اپنی گاڑی میں سارے شہر کی سیر کراتا۔ وہاں اتنی بہترین جگہیں ہیں گھومنے کے لیے کہ تم دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ وہاں کی اونچی اونچی عمارتیں، بہترین شاپنگ مالز جن میں دنیا جہان کی مہنگی اور قیمتی چیزیں ملتی ہیں۔ اور بڑے بڑے ریسٹورنٹس جہاں کے لذیذ کھانے......اور......"

اس نے تو پوری کتھا ہی سنانا شروع کر دی تھی۔ وہ بھی ایک ہی زاویے پر ساکت سنتی گئی۔ یہ سب تو اس کے خواب تھے۔ جو وہ اکثر جاگتی آنکھوں سے بھی دیکھا کرتی تھی۔ لیکن جن کے پورا ہونے کا یقین کہاں سے لاتی۔ اس پسماندہ گاؤں میں رہ کر کچھ کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے چھوٹے سے شہر تک تو جا سکتی تھی۔ مگر کراچی۔ اتنا بڑا شہر۔ پھر اتنا دور۔ وہاں تک اسے کون لے جاتا؟ لیکن اب جو وہ قصے دن رات سن رہی تھی تو انہوں نے تو سوئی ہوئی حسرتیں بھی جگا دی تھیں۔ وہ باتیں ہی ایسی دل فریب کرتا تھا کہ وہ بیٹھے بٹھائے ہی اس جہان کی سیر کر آتی۔

فاخرہ کو تو یہی خوش فہمی تھی کہ میاں جی اور شمسہ ان کے رشتے دار ہیں تو اپنے شہزادے جیسے بیٹے کے لیے ان کی شہزادی سے بڑھ کر اور کوئی لڑکی انہیں کہاں ملے گی۔ وہ آخر کار ان کا ہی دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اور تب وہ بھی ناک سے لکیریں نکلوا کر رشتہ دیں گی۔ بلکہ انہوں نے تو باتوں باتوں میں بھی کئی بار کریدنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بھئی شمسہ نے تو جیسے کانوں میں تیل ڈال رکھا تھا۔ مجال ہے جو کوئی بات بھی ہوا ان کی۔ اب تو انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ ان کی بیٹی کوئی ایسی گری پڑی نہیں جو وہ ان کے انتظار میں لیے بیٹھی رہتیں۔ جب سے احسان ان کے پاس آیا تھا اور جو کچھ اس کی زبانی سنا تھا۔ اس کے بعد تو جیسے ان کی ہر پریشانی دور ہو گئی تھی۔ انہیں تو اس کی صورت میں اپنے ہر خواب کی تعبیر دکھائی دے رہی تھی۔ انہوں نے بڑی بوڑھیوں سے سن رکھا تھا۔ بیٹی کی شادی کرتے وقت لڑکے کی شکل نہیں بلکہ اس کی جیب دیکھتے ہیں۔

اور پھر ان کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔ اپنے خاندان کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ حسین تھیں وہ۔ اور اماں ابا نے پکڑ کر سعادت جیسے عام صورت بندے سے بیاہ دیا تھا۔ اس ناانصافی پر وہ بہت کرلائی تھیں۔ لیکن پھر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سمجھوتہ کرنا ہی پڑا تھا۔ اور بڑے جو کچھ اولاد

کے لیے کرتے ہیں۔ وہ ان کی بہتری کے لیے ہی تو کرتے ہیں۔ اب انہوں نے بھی اک فیصلہ کیا تھا۔ جسے سن کر ان کی لاڈلی نے بھی پہلے پہل ناک بھوں چڑھائی تھی۔ مگر آج کل کی نسل زیادہ ذہین ہے۔ حالات کو جلدی سمجھ لیتی ہے۔

چولہے کے پاس بیٹھے احسان اور سائرہ کو ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھ کر ان کی رہی سہی فکر بھی دور ہو گئی تھی۔ جو لوگ ان کا جی جلانے کا باعث بنتے رہے ہیں۔ اب وہ بہت جلد انہیں پورا کا پورا جلائیں گی۔ بھلا کسی اور کی بیٹی کو ملے گا ایسا بر؟ وہ آج کل اسی خیال میں گم خوش رہنے لگی تھیں۔

☆☆☆

ڈھولک پر پڑتی تھاپ کے سنگ تالیوں کے شور میں بھدی کانپتی آوازیں بھی کانوں کو بھلی لگتی ہیں۔ لڑکیوں کی تو ابھی تیاری ہی مکمل نہ تھی۔ جبکہ ہر کام کو سر شام ہی نبٹا دینے کی تاکید کرنے والی دادی سے آج بھی ذرا سی تاخیر برداشت نہ ہوئی تو وہ خود ہی بیچ صحن میں ڈھولک سنبھال کر بیٹھ گئیں۔ بس پھر کیا تھا انہیں دیکھتے ہی خاندان کی تمام بڑی بوڑھیوں کو بھی جوش آ گیا۔ اپنے اپنے جوڑوں کا درد بھلائے سب نے وہیں آ کر دری پر رونق لگائی۔ اور لگیں اپنے اپنے جوہر دکھانے۔ شگن کے گیت دراصل ہوتے کیا ہیں یہ تو وہ اب سن رہی تھی۔ ایسے ایسے دل کو چھو لینے والے الفاظ کہ بے اختیار پلکیں بھیگ جائیں۔ اور ٹپے تو ایسے شاندار کہ روتے روتے بے ساختہ ہنسی آ جائے۔

آج زاہدہ کی بڑی بہن صغریٰ کی مہندی تھی۔ اور گاؤں کی روایتی شادی کی طرح یہ بھی ایک گھر نہیں بلکہ پورے محلے کی ہی خوشی تھی۔ گھر خواتین سے بھرا ہوا تھا اور مردوں کے بیٹھنے کا انتظام گلی میں شامیانہ لگا کر کیا گیا تھا۔ دور و قریب کے سب ہی مہمان آ چکے تھے۔ باہر بھی اتنا ہی رش تھا۔ اسی لیے تو زینت خاتون اور شمسہ آپا کے ساتھ چھت کے راستے سے آئی تھی۔ ساتھ ساتھ تو گھر ملے ہوئے تھے۔ اور منڈیریں اتنی چھوٹی اور اک دوسرے سے بڑی ہوئیں۔ کہ وہ لڑکیاں تو اکثر ملنے جلنے کے لیے یہی راستہ اختیار کیا کرتی تھیں۔ وہ بڑی مگن سی ان سب کے ساتھ خوب لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب شانے پر اک دھپ پڑی۔

''صغریٰ آپا وہاں تمہارے انتظار میں سوکھ رہی ہیں اور تم یہاں کھڑی دانت نکال رہی ہو۔ اب چلو میرے ساتھ۔ انہوں نے تیار بھی ہونا ہے۔''

مریم نے اسے گھسیٹا تھا۔ اسے بھی اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دلہن کا جوڑا تو اس کے پاس ہی تھا۔ جو اس نے دن رات کی محنت سے گوٹا کناری لگا کر تیار کیا تھا۔ دراصل وہ فرحت مامی کا بیس بائیس سال پرانا جوڑا تھا۔ جسے اس نے ادھیڑ کر نئے کپڑے پر کچھ اور فریش گوٹا ملا کر اک نیا ڈیزائن بنا دیا تھا۔ اور جب وہ کمرے میں سب کے سامنے کھلا تو ہر آنکھ اس فن پارے کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔

''زبردست۔ یار تم نے تو کمال کر دیا۔'' مریم نے مارے خوشی کے اسے اک اور دھپ لگائی تھی۔

''مہندی کی دلہن کا اتنا بہترین جوڑا میں نے آج سے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھا۔'' زاہدہ نے بھی دل سے سراہا تھا۔ اور بہت سی آوازیں بھی ابھری تھیں۔

''اس کا مطلب آج میں واقعی خوبصورت لگوں گی؟'' دونوں گالوں پر ہاتھ رکھے بولتی صغریٰ کے لہجے میں ناقابل یقین سی خوشی تھی۔ اپنی سانولی سلونی سی رنگت کے باعث بے چاری ہمیشہ سے ہی اپنے بارے میں پریشان رہا کرتی تھی۔

اور اب بھی کچھ دیر پہلے ہی اسے سائرہ سے اتنی باتیں سننا پڑی تھیں۔ جس نے ٹی وی دیکھ دیکھ کر صرف خواب بننا ہی نہیں سیکھے تھے بلکہ اس نے نوک پلک سنوارنا بھی خوب دل جمعی سے سیکھ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو وہ اپنا آپ ہمیشہ سجا کر رکھتی تھی۔ اور اب تو یہ نوبت آ گئی تھی اس کی مہارت کو دیکھتے ہوئے دلہن بھی اس کے ذمے ڈال دی گئی تھی۔ اور وہ اس مفت

کی بیگار پر چڑی ہوئی سارا غصہ اس پر ہی اتار رہی تھی۔

''آپ تو آج دوپہر تک چولہے کے آگے سے نہیں اٹھ رہی تھیں۔ اگر ایک ماہ پہلے سے ٹریٹمنٹ لینا شروع کیا ہوتا تو کچھ شکل بھی نکل آتی۔ اب یہ ایک دن میں کیا جادو کروں گی میں۔ حد کرتی ہیں صغریٰ آپا۔ اتنے شارٹ نوٹس پر تو میں کبھی خود تیار نہیں ہوئی اب آپ پر کیا خاک روپ آئے گا۔''

انتہائی بے دردی سے وہ اسے ہی سخت سست سنا رہی تھی۔ اب وہ بے چاری اسے اپنی مجبوریوں کی کیا داستانیں سناتی۔ وہ تو بھلا ہو زرتاج کا جس نے آتے ہی جلے دل پر پھایا رکھ دیا تھا۔ صغریٰ کو اس پر اتنا پیار آیا کہ سنہری اور سرخ گوٹے سے بھرا دوپٹہ کھول کر خود اوڑھنے کے بجائے اس پر ڈال دیا۔ جہاں کمرے میں شور مچ گیا۔ وہیں اس نے بوکھلا کر دوپٹہ سر سے اتارا۔

''افوہ۔ کیا کرتی ہیں۔ یہ آپ کے شگن کا دوپٹہ ہے۔''

''ہاں تو۔ تم نے اتنی محنت اور محبت سے میرا یہ جوڑا تیار کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ کرے جلد ہی اک چاند سا شہزادہ آکر تمہیں بھی اپنے محل میں لے جائے۔''

''اوہو۔ ایک تو لڑکیاں بھی نا رہتی چاہے کچے پکے مکانوں میں ہوں۔ لیکن باتیں ہمیشہ محلوں اور شہزادوں کی کریں گی۔ آپ بھی نہ کیسے خواب دکھا رہی ہیں اسے۔ اس کی شادی کا تو ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔ اور اب وہ زمانے گئے جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ دلہن کی کوئی چیز استعمال کرنے سے دلہن کی سہیلیوں کی بھی جلدی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ اب حقیقت کا دور ہے۔ اور پلیز اب ایک جگہ ٹک کر بیٹھ جائیں۔ اپنے چہرے کا مساج کرنے دیں مجھے۔ آپ سے زیادہ مجھے اپنی عزت کی فکر پڑ گئی ہے۔ کل کو دیکھنے والے یہ نہ کہیں کہ سائرہ جبیں کے ہاتھ لگنے سے بھی دلہن پر روپ نہیں آیا۔'' اس کی زبان کے آگے تو خندق تھی۔ کوئی اس کی باتوں پر ہنس دی تھی تو کسی نے اک سرد آہ بھری۔ اور شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی وہ۔ خواب بھی کسی کسی کو ہی جچتے ہیں۔ اس نے بھی تو اک لاپرواہ سے دل لگا لیا تھا۔ جس کے مزاج کی گرم ہوائیں روح کھلسائے دے رہی تھیں۔ وہ خفا ہے تو بتاتا کیوں نہیں ہے۔ یوں تلخ رویوں کی مار تو نہ مارے۔ اسے اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کی بے رخی کیسے تیز دھار آلے کی طرح اندر سے کاٹتی چلی جاتی ہے۔

ستم تو یہ کہ وہ اپنا دکھ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ یہ وہ آگ تھی جس کی تپش سے اس کا ہی دل جل رہا تھا۔ اور اس کی بیزار صورت پر مریم کو غصہ آیا تھا۔ فیروزی رنگ پر سنہری گوٹے کے کام سے مزین اس کا شاندار ڈریس یقیناً اس کے خوب صورت ہاتھوں کی تخلیق تھا۔ مگر بالکل ہی سادہ چہرہ لیے اس کا سنگھار ادھورا لگ رہا تھا۔

وہ ساز و سامان سے لیس اس کے سر پر آن پہنچی تھی اور جب تک سنبھلتی اس کا برش اس کے شفاف عارض پر رنگ بکھیرنے لگا۔ اس نے بہتیرا روکا۔ مگر وہ سنتی تو تب نا۔ بلکہ اس نے تو لڑکیوں کے ہاتھوں پر مہندی سے گل بوٹے بناتی لبنیٰ سے بھی کہہ دیا کہ وہ اس کی کوری ہتھیلیوں پر بھی کچھ پھول سجا دے۔

''صغریٰ آپا۔ ٹھیک کیا نا میں نے۔ اور ادھر دیکھیں ذرا۔ اب کیسی لگ رہی ہے آپ کی ڈریس ڈیزائنر۔'' مریم کارنامہ انجام دیے اب ستائش کی بھی خواہاں تھی۔ اس کا سادہ سا روپ اب ستاروں سا جگمگا رہا تھا۔

''ارے ماشاء اللہ۔ کیا بات ہے۔ اب لگ رہی ہے ہماری زرتاج سچ میں زرتاج بانو۔ بالکل کہیں کی شہزادی۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ اور یہ تم نے خوب نام دیا اسے۔ ڈریس ڈیزائنر۔'' صغریٰ دل کھول کر سراہتے مسکرا دی۔

''ہاں نا۔ جتنی مہارت کا اس نے ثبوت دیا

ہے اب اتنا حق تو بنتا ہے۔ اور آپ اس کے تیار کردہ ڈریس میں اتنی پیاری لگ رہی ہیں کہ میں نے تو سوچ لیا ہے۔ میری مہندی کا ڈریس بھی زرتاج ہی بنائے گی۔" مریم شرارت سے ہنستے کہہ رہی تھی۔ سائرہ نے نخوت سے ناک چڑھائی۔

"ہاں ٹھیک ہے، اچھا کام کیا ہے زرتاج نے۔ لیکن اب کوئی ایسی آفت بھی نہیں اٹھادی کہ تم اتنا شور مچانے لگو۔ تم جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ بے وقوف جب بھی خواہش کرو تو ہمیشہ آگے جانے کا سوچو۔ اب مجھے ہی دیکھ لو، میرا دل چاہتا تھا جب میری شادی ہو تو میرا ویڈنگ ڈریس اتنا قیمتی ہو کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔ اور اب ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ میرا مہندی اور شادی کا لباس ایسا خوب صورت اور مہنگا ہوگا کہ گاؤں کی کسی لڑکی نے خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔" وہ تو بڑھکیں مارنے سے پہلے بھی نہیں رکتی تھی۔ اور اب تو اللہ نے موقع دیا تھا۔ ایسا شان دار بر اور کسی کو ملے گا بھلا جیسا اس کا نصیب بننے جا رہا تھا۔ وہ جتنا بھی نازاں ہوتی کم تھا۔ اس کے نخرے پہلے کیا چھت کو چھوتے تھے کہ اب فلک تک جانے کو تھے۔ اور ان میں سے ضرور اسے کوئی جواب دیتی جو صغریٰ آنکھ کے اشارے سے منع نہ کرتی۔ وہ خود تو جسے جو چاہے سنا دیتی تھی۔ لیکن اپنی باری پر حوصلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اور اس وقت کوئی بدمزگی وہ سب ہی نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے فقط مسکرا کر ٹال گئیں۔ بس اک لبنیٰ تھی جو اسے گھورتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

"شوخی جتی نا ہو تو۔ بڑی خوش ہے اس طبلے کے منہ والے سے رشتہ ہونے پر۔ اللہ جانے کہاں سے اٹھ کر آ گیا ہے وہ نمونہ بھی۔ اس کو بھی مزا آئے گا اس گھنٹی کو گلے میں باندھ کے۔ اچھا ہی ہوا جو وہاج بھائی کی اس فتنی سے جان بچ گئی۔"

"کچھ کہا تم نے؟" زرتاج اس کے پاس ہی تو بیٹھی تھی۔ چونک کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے ہاتھ پکڑ لیا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بس اب ایک کمی ہے تمہاری ہتھیلیاں خالی ہیں۔ اور پتا ہے سب لڑکیوں نے مہندی سے نام لکھوائے ہیں۔ کسی نے اپنے منگیتر کا تو کسی نے اپنے شوہر کا۔ تم بتاؤ کس کا نام لکھوں؟" اس نے یوں ہاتھ کھینچا کہ جیسے کئی وولٹ کا کرنٹ لگا ہو۔ چہرہ یک لخت ہی رنگ بدل گیا تھا۔

یک لخت ہی اس رنگوں بھری محفل سے جی اچاٹ ہوا تھا۔ سب کے ہنستے مسکراتے چہرے اپنا مذاق اڑاتے محسوس ہونے لگے۔ لبنیٰ کی لاکھ کوشش پر بھی وہ مہندی لگوانے پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ اور جب سب لوگ مگن اور مصروف تھے۔ وہ چپکے سے امی کو بتا کر اٹھ آئی۔

اپنی ہی سوچوں میں ڈوبی بے آواز قدموں سے سیڑھیاں طے کر رہی تھی کہ اک نسوانی قہقہے نے چونکایا۔ ہنسی کی یہ جھنکار چھت سے ہی آ رہی تھی۔ بہت سرشاری ہنسی۔ شاید کوئی مہمان لڑکیاں ہیں۔ وہ اسی خیال سے بے دھڑک باقی کے قدمچے بھی پھلانگتی اوپر پہنچی تھی۔ پہلی نظر میں تو اسے یہی لگا تھا کہ پوری چھت خالی ہے۔ مگر ذرا سا دھیان دینے پر منڈیر کے بالکل ساتھ گلی سے آتی سفیدے کی چھدری شاخوں کی آڑ میں اس نے جو دیکھا، وہ اسے ششدر کر گیا۔

اسے یوں اچانک سے آتے دیکھ کر باہوں میں باہیں ڈالے کھڑے وہ دو سائے بھی بوکھلا کر الگ ہوئے تھے۔ اف۔ وہ تو شرم سے گڑ کر رہ گئی تھی۔ مگر وہاں شرم کا ہی تو فقدان تھا۔ گھبرائی ہوئی نازیہ کو نیچے جانے کا اشارہ کرتے وہ اس بت کی طرف آیا تھا۔

"دیکھو، جو آنکھیں دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اکثر وہ سچ نہیں بھی ہوتا۔ مجھے تو چاچا مختیار نے چھت پر بھیجا تھا۔ گلی کی لائٹیں ٹھیک کرنے کے لیے۔ اور یہ لڑکی میرے پیچھے آ گئی۔ یقین کرو میں نے اسے۔"

"میرے سامنے یہ صفائیاں دینے کی ضرورت

نہیں ہے۔ کیا میں آپ کو نہیں جانتی؟ مجھے بہت اچھے سے علم ہے آپ کی فطرت کا۔ کوئی آج کی بات نہیں ہے کہ میں آپ کا یہ بھیانک روپ دیکھ رہی ہوں۔ مجھے پتا ہے آپ کس قماش کے آدمی ہیں۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ آپ نے ایک مہمان آئی لڑکی کی عزت کا بھی پاس نہیں رکھا۔ اگر ابھی میرے ساتھ کوئی اور یہاں آجاتا تو کیا ہوتا؟ آپ کو اس بات کا اندازہ بھی ہے۔ اگر ذرا سی بھی شرم ہے نا تو جا کر ڈوب مریں۔"

اسے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری تو ختم تھی اس بدخصلت انسان پر۔ مجال ہے جو جرم کر کے بھی قبول جائے۔ مکر اور فریب سے بھرے شخص پر اسے بے انتہا غصہ آیا تھا۔ بس میں ہوتا تو اس بے ہودگی پر اس کے سر پہ دس جوتے لگاتی۔

"ہائیں۔ ہائیں۔ بھئی میں کیوں ڈوب مروں۔ مرے وہ لڑکی جا کر جس کو اپنی عزت کا تو احساس نہیں تھا۔ الٹا مجھے بھی تمہاری نظروں میں برا بنا گئی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔ میں نے اسے نہیں بلایا۔" سجاد نے بولتے بولتے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"خبردار۔ اگر اپنے ناپاک ہاتھ سے مجھے چھونے کی کوشش بھی کی تو۔ میں نازیہ نہیں ہوں جو آپ کے دام میں آجاؤں گی۔ میں تو سب کے سامنے آپ کا گھٹیا روپ کھول کر رکھ دوں گی۔ مجھے سمجھا کیا ہے آپ نے۔"

وہ چیخ چیخ گئی۔ چھت پر کوئی روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ لیکن صحن اور گلی سے آتے اجالے میں وہ خود سراپا شعلہ بنی اسے جلانے کے درپے تھی۔ اس کا یہی جرات مندانہ اور نڈر انداز اسے عام لڑکیوں سے خاص بناتا تھا۔ اک ٹک دیکھتا سجاد ہنس دیا۔

"واہ۔ واہ۔ کیا بات ہے۔ غصے میں تو تم اور زیادہ پیاری لگتی ہو۔ ایمان سے میرا تو دل آگیا تم پر۔ ہائے۔ کہیں تمہارا یہ جلوہ جان ہی نا لے لے میری۔ اور دیکھ کیا رہی ہو جاؤ بتا دو سب کو۔ ویسے کیا بتاؤ گی۔ کیا میں تمہارے ساتھ تھا؟"

ایک تو اس کی مکارانہ ہنسی اس پر ایسا شاطرانہ جملہ۔ وہ تو سلگ ہی اٹھی۔ ایسے ڈھیٹ کے منہ لگنا ہی کم عقلی تھی۔ اس منظر سے ہٹ جانا ہی بہتر تھا۔

وہ تیزی سے منڈیر کی جانب مڑی کہ اگلی چھت پر کھڑے وجود سے نظر ملتے ہی اک پل کو تو اس کا دل ہی رک گیا تھا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں؟ ایسا عجیب رنگ جو آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور جو اس کی رنگت بھی بدل گیا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کا ڈوبتا اعتماد عود آیا تھا۔ وہ اسے بتانے ہی کو لپکی تھی۔ مگر لڑکھڑا گئی۔

اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر ان ہی قدموں پر واپس پلٹ گیا تھا۔ اس کی پکار بھی نہ سنی۔ اور اس درجہ بے اعتمادی پر اس کی ذات پارہ پارہ ہوئی تھی۔ وہ کانچ کی مانند بکھری۔ کاش وہ پتوں کا اک ڈھیر ہوتی تو اس ذلت سے یہیں جل مرتی۔ ادھر سجاد کا دل بلیوں اچھلا تھا۔ اس نے تو تیل ڈالا بھی نہیں تھا اور آگ لگ بھی گئی تھی۔

☆☆☆

وہاج کل رات سے جو کمرے میں گیا تھا تو یہ وقت آگیا تھا کھٹیا سنبھالے۔ اس نے تو صبح سے لے کر اب تک باہر جھانک کر دیکھا تک نہیں تھا۔ نہ کچھ کھایا پیا۔ وہ فکر مندسی کئی بار کمرے میں جھانک کر جا چکی تھیں۔ وہ ہر بار سوتا بن گیا۔ اب پھر بے چین سی آئی تھیں کہ اسے بستر پر اوندھا پڑے فرش پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچتا پایا۔

"میرے بچے۔ میرے لعل۔ کیا بات ہے۔ کیوں ایسے پڑے ہوئے ہو۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" وہ اس کے پاس آبیٹھیں۔ بکھرے بال سمیٹے۔ ماتھا چھو کر دیکھا۔ بخار تو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی چہرے پر ایسی مردنی چھائی تھی کہ ان کے دل پر ہاتھ پڑا۔

"صبح سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ چائے دے کر

گئی تھی۔ وہ بھی یونہی پڑی ہے۔ تم نے آج آڑھتی کے پاس جانا تھا۔ کچھ یاد ہے۔ کیا کہا تھا تمہارے ابا نے رات کو۔ حد ہوگئی، ایسے بے سدھ پڑے ہو کہ جیسے کل پورے گاؤں کی فصلوں میں تم نے ہی ہل چلایا تھا۔ میں پوچھتی ہوں ہوا کیا ہے تمہیں۔ کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو؟'' ان کے جھنجلائے لہجے پر وہ دھیمے سے مسکراتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ بس یونہی دل چاہا تھا، آج تھوڑا آرام کرنے کو۔ آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو جاتی ہیں۔ اور ابا نے کیا کہا تھا۔ اگر مجھے خیال نہیں رہا تو آپ ہی یاد کروا دیتیں۔ اب بتا رہی ہیں۔ جب سارا دن گزر گیا۔'' اپنی کوتاہی بھی کس مزے سے ان کے سر ڈال گیا تھا۔ انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔

''اچھا آرام کیا تم نے۔ میری جان نکال رکھی ہے۔ جب تم ایسی شکل بنا کے بھوکے پیاسے پڑے ہوگے تو میں کیا خاک کچھ کہوں تم سے۔'' اور اسے ان کی اس غصہ بھری محبت پر پیار آیا تھا۔ ان کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

''میری پیاری اماں جان۔ مجھے معاف کر دیں۔ غلطی ہوگئی۔ اچھا اب چلیں، ساری باتیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں، کیا پکایا ہے۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' اس کی شکل پر یک لخت ایسی مسکینیت اتری تھی کہ ان کا دل پگھل گیا۔ اس کے گال کو پیار سے تھپتھپاتے کہا۔

''تمہاری پسند کے دال چاول بنائے ہیں۔ ساتھ بینگن کا رائتہ بھی ہے۔ تم اٹھ کے منہ ہاتھ دھو لو۔ میں کھانا لے کر آتی ہوں۔''

''اوہ۔ جیو میری ماں۔ دل خوش کر دیا۔'' اس نے مسکرا کر ان سے تو کہہ دیا تھا۔ لیکن دل کل سے کس کیفیت میں گھرا ہے یہ بس وہی جانتا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر دیا تھا اس خواہش میں کہ خود کو اس قابل بنا سکے کہ جب کسی کے سامنے جا کر کھڑا ہو۔ تو قدم ڈگمگائیں نا۔ بلکہ وہ اتنا مضبوط ہو کوئی اس کا ہاتھ جھٹک نہ سکے۔ اور بس وہ منزل تک پہنچنے ہی

والا تھا کہ...... سب الٹ ہو گیا۔ اس کی تو دنیا ہی اندھیر ہوگئی تھی۔ وہ تو ماما الیاس کے کہنے پر کیکر کا بالن پہنچانے ان کے گھر گیا تھا کہ وہاں لبنیٰ اور مریم کے ساتھ اس دشمن جان کو پینگیں لگاتے دیکھا۔ جو اسے اچانک سامنے دیکھ کر کچھ اور ہی قصہ خوانی شروع کر چکی تھی۔

''ہائے سچ کہتے ہیں خواب بھی کسی کسی خوش نصیب کے ہی تکمیل پاتے ہیں۔ یہ تو بڑے کرموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور سچ پوچھو تو مجھ سے زیادہ تو اماں کو خوشی ہے۔ ان کی دعائیں جو رنگ لے آئی ہیں۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا کہ سارے زمانے کی نعمتیں میرے جہیز میں رکھ دیں۔ جبکہ احسان نے انہیں منع بھی کیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ان کے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ اتنا بڑا تو گھر ہے ان کا۔ اور دنیا جہان کے سامان سے بھرا۔ اور یہ بڑی گاڑی۔ افف۔ مجھے تو خود یہ سوچ کر ہی اتنا اچھا لگ رہا ہے کہ میں اس چھوٹے سے گاؤں سے نکل کر اتنے بڑے شہر میں چلی جاؤں گی۔'' اور وہ اس کی بکواس کا مفہوم سمجھ کر گھبرا کر بالن کے اوپر جا گرا تھا۔ کانٹے ہی کانٹے تو تھے ان میں۔ مگر جو کانٹا ابھی اس کے دل میں کھبا تھا اس سے کم ہی تکلیف ہوئی ہوگی جسم کو۔ لبنیٰ اور مریم بوکھلا کر اٹھیں۔

''ہائے میرے اللہ۔ وہاج بھائی! دھیان سے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟'' وہ پوچھ رہی تھیں۔ وہ کیا بتاتا کہ کہاں زخم آیا ہے۔ وہ تو اسے تک رہا تھا جس کی صورت پر عجب ظالمانہ سی بے حسی چھائی تھی۔ بے تابانہ اس کی جانب لپکا تھا۔ دونوں شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا۔

''کک...... کیا کہا ابھی تم نے۔ تت...... تم اپنے حواسوں میں تو ہو۔ یہ کیا فضول بات کر رہی ہو۔'' سائرہ نے زور سے اس کے ہاتھ جھٹکے، خونخوار نظروں سے گھورتے غرائی تھی۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے ہاتھ بھی لگانے کی۔ اور فضول بات کیسی۔ میرا رشتہ طے ہوگیا

ہے۔میں اپنی سہیلیوں کو بتا رہی ہوں۔تمہیں کس چیز کا درد اٹھ رہا ہے۔'' اور اس کا جی چاہا تھا کہیں ٹکر دے مارے۔لبنیٰ اور مریم دم سادھے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

''اوہ۔میرے اللہ۔تمہارا رشتہ اس چول آدمی کے ساتھ طے ہوا ہے۔افف۔تائی کی عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔اور وہ سجاد۔ویسے تو بڑا عقل مند بنتا ہے سارا خاندان اور اب۔''

''اوئے۔سوچ سمجھ کر بات کرو۔یہ کیا بکواس کرتے جا رہے ہو۔یہ چول کس کو کہا تم نے؟'' مارے طیش کے اس کی آنکھوں میں خون اترا۔

''صرف چول ہی نہیں، وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔یہ تو میں لحاظ کر گیا ہوں۔ورنہ اس کی تعریف میں وہ وہ لفظ استعمال کر سکتا ہوں ناکہ تم مارے صدمے کے اپنے ہوش کھو دو۔بلکہ ٹھہرو، تمہیں ایسے یقین نہیں آئے گا۔اس سے پہلے تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔'' اس نے اپنی جیبیں ٹٹولی تھیں اور یاد آیا کہ لڑکیاں کاٹ [illegible] ہوئے اس کا [illegible] جیب سے نکل کر گیا تھا جو [illegible] نے اٹھا لیا۔ پھر نہ انہیں واپس پڑانے کا دھیان رہا اور نہ اسے لینے کا۔ ''اوہ۔۔۔ یہ تو بہت برا ہوا تھا۔'' [illegible] اس کا رنگ سفید پڑتے دیکھ کر اس نے نخوت سے ہنکارا بھرا۔

''ہونہہ۔جلنے والوں کے منہ ایسے ہی کالے ہو جاتے ہیں۔اماں نے تو مجھے پہلے ہی روکا تھا۔کہ ابھی ہونٹ سی کر رکھنا۔سہیلیوں کو بھی مت بتانا۔ایسی خوش بختیوں سے لوگ حسد کرنے لگتے ہیں۔تم تو کیڑے نکالو گے ہی۔تمہاری چکنی چپڑی باتوں کے جال میں جو نہیں پھنسی میں۔''

اس کی بدگمانیوں کی کوئی حد نہ تھی۔وہ تو مارے دکھ کے پتھر ہوا تھا۔تو کیا سچ میں وہ عقل کی اتنی کوری ہے کہ اب تک اسے جان ہی نہیں سکی۔۔اس کے جذبے۔اس کی محبت۔سب بے وقعت ہی ٹھہرے۔وہ اسے کیسے سمجھائے۔کہ جسے وہ اپنے لیے خوش بختی گردان رہی ہے وہ اصل میں بدبختی کا پہلا گڑھا ہے۔جس میں اگر ایک بار وہ جا گری تو پھر شاید نکلنا ممکن نہ رہے۔اور افف۔اس خیال سے ہی اس کی روح فنا ہونے کو تھی۔اور وہ تو پارے کی مانند تڑپ کر کھڑی ہوئی تھی۔

''میں چلتی ہوں۔اک منٹ بھی اور یہاں رکی تو میرا دماغ خراب ہو جائے گا۔اور لبنیٰ! سمجھا دینا اپنے اس رشتے دار کو، خبردار آئندہ میرے منہ نہ لگے۔''

''سائرہ! اک بار میری بات۔'' وہ بے قرار سا اس کے پیچھے لپکا تھا۔لبنیٰ نے بڑھ کر روکا۔

''جانے دیں وہاج بھائی! کس مصیبت کو گلے ڈال رہے ہیں۔آپ کو اچھی طرح علم ہے، اس کے مزاج کا۔اسے کسی کی سمجھ تو آتی نہیں ہے۔آپ اس کا بھلا ہی کر رہے ہوں گے نا، تب بھی وہ برا ہی سمجھے گی۔ابھی چھوڑ دیں اس کے حال پر۔''

''تم لوگوں میں کیسے سمجھاؤں کہ وہ [illegible] نے سائرہ کیا کرنے جا رہی ہے۔وہ شخص جو نظر آ رہا ہے وہ اصل میں وہ نہیں ہے۔وہ۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔مریم اس کے لیے پانی لینے بھاگی تھی اور لبنیٰ اس کے سامنے آ بیٹھی۔

''آپ حوصلہ رکھیں وہاج بھائی! اللہ ہے نا۔وہ سب بہتر کرے گا۔آپ پریشان نہ ہوں پلیز۔''

''ہاں بے شک اللہ بہتر کرنے والا ہے۔لیکن میں تمہیں کچھ بتاتا ہوں اور وعدہ کرو تم اسے ایک بار ضرور سمجھاؤ گی۔''

''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گی۔مگر اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتی کہ وہ میری بات کو سمجھ بھی جائے گی۔آپ کو تو پتا ہی ہے۔اس کی عقل دانی کتنی چھوٹی سی ہے۔'' لبنیٰ نے ہامی تو بھری مگر ساتھ ہی صاف الفاظ میں بتایا بھی۔

''افف۔۔ایک تو تمہاری اس کم عقلی نے میرا بھیجا ہلا دیا ہے۔'' زرتاج کی تیز آواز اسے کل سے

باہر کھینچ لائی تھی۔ اس نے چونک کر صحن میں جھانکا۔ جہاں آج پھر اس کے ہاتھوں ارباز کی شامت آئی ہوئی تھی۔ اس کا یہی معمول تھا۔ روز کسی نہ کسی وجہ سے جھاڑیں کھاتا۔ جانے اب کیا ہوا تھا۔ وہاج باہر نکلا۔

"تم دوسرے بچوں کو دیکھو۔ اسے میں سبق یاد کروا دیتا ہوں۔ ارباز آؤ میرے ساتھ۔" اور اس عنایت پر زرتاج نے اک گہرا سانس لیا تھا۔ شکر ہوا کچھ دیر کو بلا ٹلی۔ وہ عاجز آئی رہتی تھی اس کی نالائقی سے۔ اس پر سجاد کی اس دن کی حرکت نے اتنا آگ بگولا کر رکھا تھا کہ اکثر اس کا غصہ بھی بے چارے ارباز کو ہی سہنا پڑتا۔ جو اچھی بھلی استانی کے یوں شیرنی بن جانے پر الگ حواس باختہ رہتا۔ وہ پہلے تو ایسی نہیں تھی۔ بڑے تحمل اور پیار سے پڑھاتی تھی۔ وہ الجھا ہوا سا وہاج کے پیچھے گیا تھا۔

"یہ کتاب رکھ دو۔ پڑھائی اس وقت کرتے ہیں جب ذہن تازہ دم ہو۔ اور تم اس وقت مجھے خاصے گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ اس لیے یہ پکڑو سیل فون۔ اس میں کافی سارے گیمز ہیں۔ جو تمہیں مزے کا لگتا ہے وہ لگاؤ اور جی بھر کے کھیلو۔"

اور ایسی آفر پر ارباز کا منہ کھل گیا تھا۔ اتنا مہربان تو اس پر کبھی سگا بھائی نہیں ہوا تھا۔ وہاج اس کی صورت پر چھایا ہونق پن دیکھ کر مسکرا دیا۔

"اتنا حیران کیوں ہو رہے ہو۔ میں نے کسی اور زبان میں تو بات نہیں کی۔ یہی کہا ہے نا پہلے اپنا دماغ فریش کرو۔ پھر اطمینان سے سبق بھی پڑھ لینا۔ اور تم خود محسوس کرو گے کہ تمہیں سب کتنی جلدی سے یاد ہو گیا ہے۔ میں بھی جب اسکول میں پڑھتا تھا تو ایسے ہی کیا کرتا تھا۔ اور پتا ہے کیا۔" وہ کوئی کہانی شروع کر چکا تھا۔ ارباز نے پوری دلچسپی دکھاتے سیل فون بھی پکڑ لیا۔ اور وہ مگن تھا۔ جب وہاج نے پوچھا تھا۔

"وہ جو مہمان تمہارے گھر آیا تھا۔ کیا وہ چلا گیا۔"

"کہاں وہاج بھائی۔ اس کا تو ایسا دل لگا ہے ہمارے گھر۔ واپسی کا نام ہی نہیں لے رہا۔ اور پتا ہے کیا اب تو۔" وہ اپنی ہی جھونک میں بولتے ہوئے یک لخت ہی چپ ہوا تھا۔ شاید اماں کی کوئی نصیحت یاد آئی تھی۔ یا پھر آپا کی۔

"کیا اب تو......؟" وہاج نے کریدا۔ وہ پھر بھی خاموش رہا۔ تو اس نے منہ بنا لیا۔

"کمال کرتے ہو یار! مجھ سے چھپا رہے ہو۔ میں تو تمہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتا ہوں۔ لیکن تم ایسا نہیں سمجھتے تو چلو، کوئی بات نہیں۔ مت بتاؤ مجھے۔ مگر میرے پاس کچھ ایسا ہے جسے جان کر تم ضرور حیران رہ جاؤ گے۔ ادھر لاؤ سیل فون ابھی دکھاتا ہوں۔"

اور جب اس نے فولڈر کھول کر اسکرین اس کے سامنے کی تھی تو ارباز کا فشار خون بڑھتا ہی گیا۔

☆☆☆

جب بس نے اسے پکے پل پر اتارا تو سہ پہر کے چار بجنے کو تھے۔ تیر چلتی لو کے باعث گاؤں کی تمام چوپالیں اس وقت سنسان پڑی ہوتی تھیں۔ چرند پرند بھی کہیں اس قہر کی گرمی سے چھپ کر بیٹھے ہوتے۔ چہار جانب ہو کا عالم تھا۔

وہ نپے تلے قدم اٹھاتی آ رہی تھی۔ بہت دن کی ذہنی مشقت کے بعد اسے اپنا آپ کچھ ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ تیرہویں کا آخری پرچہ دے کر آ رہی تھی۔ تمام پیپرز بہت اچھے ہوئے تھے۔ کامیابی کی پوری امید تھی۔ کتنے دنوں سے سکھ آرام سب بھولا ہوا تھا۔ اب وہ گھر پہنچتے ہی اک بھرپور نیند لینے کی حق دار تو ہے ہی۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم سر جھکائے چلتی آ رہی تھی۔ جب دو پاؤں اس کی راہ میں آن رکے۔ لامحالہ اسے بھی رکنا پڑا تھا۔ گردن اٹھا کر دیکھا۔ اور اپنے سامنے تن کر کھڑے وجود کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر شدید ناگواری اتری تھی۔ اک تیکھی نظر سے نواز کر اس نے دائیں طرف سے نکلنا چاہا۔ وہ پھر راہ میں حائل ہوا تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے۔ راستہ کیوں روکا ہے میرا۔'' اس کی مسکراتی شکل اتنی بھیانک لگ رہی تھی کہ جی چاہا تھا اس کا منہ ہی نوچ لے۔

''بس یونہی۔ کافی دن سے دیکھا نہیں تھا تمہیں۔ اب نظر آئیں تو سوچا حال ہی پوچھ لوں۔ شہر سے آ رہی ہو۔ پرچے ہو رہے تھے تمہارے؟ سب ٹھیک ہوئے نا؟'' وہ بڑا مدبر بنا پوچھ رہا تھا۔ اسے اور غصہ آیا۔ تپ کر کہا۔

''آپ سے مطلب۔ بہتر ہوگا کہ اپنے کام سے کام رکھا کریں۔'' اور وہ ہنس دیا۔

''میں تو تمہیں اپنی ہی سمجھتا ہوں۔ آخر کو ایک ہی گلی میں رہتے ہیں آمنے سامنے گھر ہیں ہمارے۔ اب بندہ پڑوسیوں کی بھی فکر نہ کرے کیا۔''

''مجھے آپ غیر ہی سمجھیں تو اچھا ہے۔ اس گلی میں اور بھی کافی سارے پڑوسی ہیں۔ مہربانی ہوگی ان کی فکر کریں۔ اور اگر آئندہ اس طرح میرا راستہ روکنے کی غلطی کی نا تو میں شکایت لے کر سیدھا تائی فاخرہ کے پاس چلی جاؤں گی۔ سمجھے آپ اور اب ہٹیں۔ یا میں آواز دوں کسی کو۔'' وہ آنکھیں دکھا کر دھمکی لگاتی، تلملاتی چل پڑی تھی۔ وہ اک طرف ہوتا ہنستے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اوئے ہوئے۔ لگتا ہے، اس دن کا غصہ ابھی اترا نہیں ہے۔ جب کہ میں نے بتایا بھی تھا کہ وہ بلا تو خود ہی میرے گلے آن پڑی تھی۔ اور شکایت تو تم ہمیشہ سے لگاتی آ رہی ہو میری۔ لیکن یہ بتاؤ۔ کبھی کسی نے یقین کیا تمہارا۔ ویسے مجھے سدھارنے کی کوشش تو تم نے بہت کی ہے۔ بس میں ہی ذرا لاپرواہ نکلا۔ لیکن سچ بتاؤ اگر ایسا دل سے کرتی ہو تو مجھے بھی سدھرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ لیکن کبھی رک کر دھیان سے میری بات تو۔''

وہ بولتا ہی جا رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی گئی۔ وہ تو بھلا ہو چاچا کرامت کا جو کچھ فاصلے پر مل گئے۔ اور جنہیں دیکھ کر اس ڈھیٹ نے اپنا بھونپو بند کیا تھا۔ وہ ابا کے دیرینہ دوست تھے۔ اپنی اولاد تو کوئی تھی نہیں۔ خاندان کے علاوہ گاؤں کے سب ہی بچوں پر ہمیشہ انہوں نے شفقت لٹائی تھی۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ ہی چل پڑے تھے۔ اور گھر تک چھوڑ کر گئے۔ سجاد مسکراتا ہوا واپس کھیتوں کی جانب پلٹ گیا تھا۔ جہاں ایک بڑے سے برگد کی آڑ میں احسان کھڑا تھا۔

''ہاں بھئی جانی۔ اور سناؤ پھر کیسی رہی ملاقات۔'' اس کا انداز سراسر مذاق اڑاتا ہوا تھا۔ جو اس کی درگت بنی تھی۔ وہ دیکھی تو ہو گی ہی اس نے۔ اور اس نے منہ بنایا تھا۔

''کیسی ملاقات بھیا۔ وہ چڑیا تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔ آج تک کسی نے اتنا نہیں ستایا مجھے۔ جتنا اس نے امتحان لیا ہے۔ اور جرأت تو دیکھو، مجھے دھمکا کر گئی ہے۔ کہتی ہے۔ اماں کو میری شکایت لگائے گی۔''

''اوہ۔۔ تو کیا پھر تم ڈر گئے؟''

''نہیں، میں تو مر گیا۔ وہ بھی اس کی اداؤں پر۔ اس کا یہی تیکھا پن تو اچھا لگتا ہے۔ بالکل ہری مرچ سا۔''

''اوہ اچھا۔ یو مین۔ یو ان لو؟'' احسان نے اس کے عین سامنے کھڑے ہوتے سوال کیا آنکھیں گھما کر۔

''ہاں۔ اوہ۔۔ نہیں نہیں۔ اب ایسی بھی کوئی آفت نہیں آئی مجھ پر۔ یہ لو شو ہم جیسوں کا کام نہیں ہے۔ اور مجھے اماں کا بہت اچھے سے پتا ہے۔ وہ بھی کسی چھوٹے گھر سے بہو نہیں لے کر آئے گی۔ اس نے تو بڑے اونچے اونچے خواب دیکھ رکھے ہیں میرے لیے۔ اگر میں نے غلطی سے بھی اس کا نام لیا نا تو جان سے مار دے گی مجھے۔ یہ تو بس سمجھیں کہ دل پشوری کرتا ہوں۔ مزا آتا ہے اسے چھیڑ کر۔''

وہ مانتے مانتے مکر گیا تھا۔ احسان نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا تو اور اک سی کمینی ہنس دیا۔ جس میں دوسرے کمینے نے بھی ساتھ دیا تھا۔

''مطلب ہاں بھی اور نا بھی۔ چلو جو بھی ہے۔

دونوں صورتوں میں تمہارے لیے ایک بہت زبردست چیز ہے میرے پاس۔ جس کے استعمال سے آئندہ نہ وہ تمہیں کوئی دھمکی دے سکے گی اور نہ تمہیں اس کا ڈر ہوگا۔ اب میری جان جی بھر کر مزے لوٹ سکتے ہو تم۔" زبردستی سفید کیے گئے گال پر دو انگلیاں پھیرتے احسان نے دوسرے ہاتھ میں تھاما سیل فون اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا۔ اور اس سے پھوٹتی روشنی نے سجاد کا چہرہ کھلا دیا۔ آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔

"اوہ...... آپ نے تو کمال کر دیا بھیا۔ واہ... واہ۔ کیا اسکیم لڑائی ہے۔ میرا تو کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ آپ تو بڑے استاد نکلے۔"

"تم نے ابھی میری استادی دیکھی کہاں ہے جگر۔ تم اپنے بھیا کو جانتے نہیں ہو۔ ایسی ایسی بہترین اسکیمیں ہیں نا میرے پاس کہ تم بھی دنوں میں ترقی کر جاؤ گے۔ بس آگے آگے دیکھتے جاؤ ہوتا ہے کیا۔ ابھی تو اس پر گزارا کرو۔ اور خوش رہو۔" احسان نے اس کے شانے پر اک زوردار دھپ لگائی تھی۔ وہ مسرور سا ہاتھ میں تھامے سیل کو بے خودی سے تک رہا تھا۔

"ہے ویسے دیکھنے کی چیز۔ پیس بڑا چھانٹ کر پسند کیا ہے تم نے بھی۔" احسان کا سراہتا انداز نہایت عامیانہ تھا۔

"ہے نا۔" وہ یوں خوش ہوا جیسے یہ تعریف اسی کی ہوئی ہے۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلتے ہی بے اختیار گلے کو پھندہ لگا تھا۔ پوری فضا انتہائی کسیلے اور کڑوے دھوئیں سے مہک رہی تھی۔ وہ بری طرح کھانس کر رہ گیا۔ سامنے ہی بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹے احسان پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا تھا۔

"اماں نے آپ کے لیے دودھ بھجوایا ہے۔"

"ہاں رکھ دو۔" اس نے نظر نہیں پھیری تھی۔ اور ارباز نے ادھر دیکھنے کی غلطی نہیں کی۔ گلاس تپائی پر رکھ کر وہیں بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا۔

"کیسے سانس لیتے ہیں آپ اس بدبو میں؟ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ اُف اتنے سارے ٹکڑے۔ مطلب بہت زیادہ سگریٹ پیتے ہیں آپ۔ اس سے آپ صرف اپنا ہی نقصان نہیں کر رہے بلکہ اس سے آپ کے اردگرد کے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔"

"اور تمہیں یہ ساری باتیں تمہاری اس حسین استانی نے بتائی ہوں گی۔ ویسے بھی سچی بات ہے قدرت بھی کہاں کہاں گدڑیوں میں لعل چھپا دیتی ہے۔ کیا سانچے میں ڈھال کر بنایا گیا ہے اسے۔ ایسا میرمریں سا۔" ارباز کے چہرے پر ناگواری اتری تھی۔

"یہ کس طرح بات کر رہے ہیں۔ وہ میری استانی ہیں۔ میں بہت عزت کرتا ہوں ان کی۔ میں تو ان کے لیے سائرہ آپا سے لڑ پڑتا ہوں اگر وہ کبھی کچھ الٹا سیدھا بول دیں تو۔ بہتر ہوگا آپ بھی احتیاط کریں۔"

"ارے چھوٹے! تم تو خفا ہونے لگے۔ میں تو اللہ کی بنائی چیز کی تعریف کر رہا تھا۔ لیکن تمہیں نہیں پسند آئی تو چلو رہنے دیتے ہیں۔ اور یہ دودھ تم پی لو۔ اور جا کر اپنی پیاری سی آپا سے کہو۔ میرے لیے کڑک سی چائے بنا کر لائیں۔ میں اس وقت چائے پینے کا عادی ہوں۔ دودھ مجھے ہضم نہیں ہوتا۔"

"ہاں اکثر لوگوں کو اچھی چیزیں ہضم نہیں ہوتی ہیں۔ خیر، دودھ میں پی لوں گا۔ اور آپا تو کب کی سو چکی ہیں۔ اس لیے اب چائے تو بن نہیں سکتی۔ اور یہ بتائیں کہ پینے پلانے کا شوق صرف چائے اور سگریٹ تک ہی ہے۔ یا کوئی اور شوق بھی پال رکھا ہے؟"

جس طرح ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے وہ سوال کر رہا تھا۔ احسان جھٹ سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ کافی محتاط رہتا تھا۔ اپنا اچھا امپریشن جمانے کے لیے کچھ قربانیاں تو بہر حال دینا ہی پڑتی ہیں۔ اور اس کی یہ قربانی کم تھوڑا تھی۔ کہ اسے اب دوسرے شوق

پورے کرنے کے لیے چھپ چھپا کر گھر سے باہر جانا پڑ رہا تھا۔ کہیں اس نے بھی تو وہیں۔ اور اس کی گھبراہٹ دوچند ہوئی تھی۔ لیکن اب وہ ایسا کچا چور بھی نہیں تھا۔ کہ اتنی آسانی سے کھل جاتا۔ اسی لیے مسکراتے ہوئے بظاہر لاپرواسے لہجے میں بولا۔

"جہاں تک پینے کے شوق کی بات ہے تو ہاں انرجی ڈرنکس بہت پسند ہیں مجھے۔ کبھی کبھار ہی پیتا ہوں وہ بھی۔ لیکن تم ایسا سوال کیوں کر رہے ہو۔"

اور ارباز اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چھلکتی برہمی صاف بتا رہی تھی۔ وہ اس کی بات پر بہلا نہیں ہے۔ بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔

"مجھے لگ رہا ہے کہ کسی دشمن نے تمہیں میرے خلاف بہکایا ہے۔ تمہیں پتا ہے نا کہ ہمارا آپس میں کیا رشتہ بننے والا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ اس بات سے خاندان کے کچھ لوگ ناخوش ہوئے ہیں۔ ان لوگوں سے برداشت نہیں ہو رہا ہوگا کہ تمہاری بہن کی شادی اتنی اچھی جگہ ہونے جا رہی ہے۔ تم مجھے جلدی سے بتاؤ۔ کون ہے وہ۔"

"مجھے کسی نے نہیں بہکایا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، آپ کو اپنا پسندیدہ انرجی ڈرنک پیتے ہوئے۔ اور مجھے اس کی بوتل بہت اچھی لگی تھی۔ جو آپ نے خالی کر کے نہر میں پھینک دی تھی۔ اور جسے میں نے نکال لیا تھا۔ اس خیال سے کہ اکثر ڈراموں میں دکھاتے ہیں نا ایسی فینسی سی بوتلوں میں خوب صورت گھروں میں بیلیں لگی ہوتی ہیں۔ تو میں نے سوچا تھا، آپا کو گفٹ کر دوں گا۔ بہت خو......"

"ارے نہیں نہیں۔ ایسا غضب مت کرنا۔ اپنی آپا کو مت دینا۔ تم وہ بوتل مجھے دے دو۔ لاؤ جلدی سے، کہاں ہے وہ۔" احسان کے تو ہاتھوں کے توتے کبوتر کوچ کرنے کو آ گئے۔ بوکھلا کر منت کی۔ جو بھولا سا منہ بنائے بتا رہا تھا۔

"وہ میرے پاس اب کہاں۔ وہ تو وہاج بھائی آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے چھین لی۔ بلکہ دو تھپڑ بھی لگائے۔ انہوں نے تو کہا تھا، اب گھر جا کر اچھی طرح نہانا۔ تم نے بہت گندی چیز کو ہاتھ لگایا ہے۔ اور آپ تو وہ پی رہے تھے۔ چھی۔ چھی۔ چھی۔ مجھے تو آپ سے دور رہنا چاہیے۔ ہٹیں پرے۔ ہاتھ نہ لگائیں مجھے۔ ویسے وہ کون سا انرجی ڈرنک تھا؟"

ارباز کا معصوم سا تجسس۔ وہ ایک بار پھر پوچھ رہا تھا۔ اور احسان کا بس نہیں چلا تھا۔ وہاج نے تو اسے دو تھپڑ لگائے تھے۔ وہ کم از کم بھی سوچتے تو ضرور لگائے۔ کم بخت۔ فتنہ۔ آخر اسے سوجھی کیا تھی۔ جو چلتی نہر میں کود کر بوتل نکال لایا۔ وہ دانت کچکچا رہا تھا۔ لیکن ارباز کے تھیلے میں ابھی اک بلی باقی تھی۔ جو اس نے نہایت آہستگی سے نکال باہر کی تھی۔ جاتے جاتے وہ کہہ گیا تھا۔

"ایک مزے کی بات بتاؤں۔ کسی کو بتایئے گا مت۔ وہاج بھائی نے نیا موبائل لیا ہے۔ اور کل وہ اسی کا کیمرہ چیک کر رہے تھے۔ کافی ساری تصویریں بنائی تھیں انہوں نے۔ اور ان میں چند تصویریں آپ کی بھی ہیں۔ وہی جو آپ شام کے بعد بانسوں کے جھنڈ کے پیچھے نہر کنارے پر تھے۔" وہ تو چلا گیا تھا۔ لیکن احسان کی روح فنا ہوئی تھی۔

☆☆☆

خاموشی ایسی تکلیف دہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہ تو انہیں اب پتا چلا تھا۔ وہ کب سے اس کے پاس آئی بیٹھی تھیں اور مجال ہے اس نے منہ سے اک حرف تو کیا اک آہ بھی نکالی ہو۔ ان کا دل دکھ سے بوجھل تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر سہلاتے بار بار کچھ بولنے پر اکسا رہی تھیں۔

"تمہاری اتنی گہری چپ کو دیکھ کر میرے دل میں ہول اٹھ رہے ہیں میری جان۔ کیوں ایسے لب سی لیے ہیں تم نے۔ کچھ کہتی کیوں نہیں ہو۔ کچھ بولو۔ میں جانتی ہوں تمہیں کتنا دکھ پہنچا ہے۔ تمہارے دل کو تکلیف ہوئی ہے۔ تمہیں بہت سا غصہ ہے۔ ان بد ذاتوں نے بالکل اچھا نہیں کیا۔ ناحق بہتان تراشی کی ہے تم پر۔ کوئی اور جانتا ہو یا نہیں۔ لیکن مجھے تو اس

بات کا یقین ہے نا کہ تمہارا دامن پاک ہے۔" وہ ہنوز چپ تھی۔ شمسہ آپا اک گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔ انہیں اس پر ترس آ رہا تھا۔ کیسی ہنستی کھلکھلاتی، زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ اور کل سے یوں ہو گئی تھی جیسے خون کی اک بوند باقی نہ بچی ہو۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ آنکھوں کی جوت بجھی ہوئی۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ وہاج شام ڈھلے شہر سے واپس آ رہا تھا۔ بس سے اتر کر کچھ فاصلہ ہی تو تھا گھر تک۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتا آ رہا تھا۔ وہیں پل کے قریب سجاد کا ڈیرہ تھا۔ جہاں سے احسان اچانک موٹر سائیکل لیے اسی راہ پر نکلا تھا۔ اور جان بوجھ کر اسے ٹکر مار دی۔ وہ تلملاتا مڑا تھا اور اسے دیکھ کر غصہ دوچند ہوا۔

"میں نے تو سنا ہے شہر میں یہ بڑی گاڑی ہے تمہارے پاس۔ جسے لمبی لمبی سڑکوں پر جہاز کی طرح اڑائے پھرتے ہو۔ اور اصل میں تمہاری حالت یہ ہے کہ یہاں چند فرلانگ کے راستے پر تم سے ایک موٹر سائیکل نہیں چلائی جا رہی۔ کمال آدمی ہو۔ اگر دکھائی نہیں دیتا تو یہاں آنے سے پہلے اپنا علاج تو کروا لیتے کم از کم۔"

اس کا غصہ کرنا تو حق بجانب تھا۔ مگر احسان تو یوں آگ بگولہ ہوا جیسے اسی لمحے کی تاک میں ہو۔ موٹر سائیکل سے اتر کر اسے گریبان سے پکڑ لیا۔ اور لگا واہی تباہی بکنے۔ اسی اثناء میں سجاد بھی آ گیا تھا۔ یوں تینوں میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ اور جس طرح اس دھینگا مشتی میں احسان نے کوشش کی تھی کہ کسی طرح اس کی جیبوں تک رسائی ہو جائے۔ اس سے وہاج کو سمجھتے دیر نہیں لگی کہ اس سارے سین کا اصل مقصد اس کا سیل فون چھیننا ہے۔ جو وہ صبح نکلتے ہوئے اتفاقاً گھر پر ہی بھول گیا تھا۔ اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ اک خبر نے ہی اس کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گرد بھیڑ اکٹھی ہونے لگی تھی۔ کئی انہیں چھڑانے کو لپکے۔ وہ تو انہیں چھوڑ ہی دیتا مگر اب وہ منحوس اسے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ جو وار خالی جاتے دیکھ کر چوٹ کھائے ناگ کی مانند بلبلا رہا تھا۔ کئی بزرگوار معاملہ جاننا چاہ رہے تھے۔ اور وہاج بتانے ہی لگا تھا کہ وہ اسے دھکیل کر آگے ہوا تھا۔

"یہ کیا بتائے گا۔ میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے۔ آج کل تو شرافت کا زمانہ ہی نہیں ہے جناب۔ جس کے ساتھ نیکی کرو، الٹا وہی گلے پڑنے لگتا ہے۔ اسے میں بس اتنا ہی تو سمجھانا چاہ رہا تھا کہ گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو اچھا ہے۔ ابھی تو ہم مل کر معاملہ سلجھا سکتے ہیں۔ وگرنہ بات منہ سے نکل کر کوٹھوں چڑھ گئی تو پھر نا ہم کچھ کر سکیں گے اور نہ تم۔"

وہ یہ کیا بک رہا ہے۔ جتنا وہاج حیران ہوا تھا اتنا ہی سجاد کو اچنبھا۔ وہ کہنا کیا چاہ رہا تھا۔

"یہ فضول بکواس کر رہا ہے۔ خود سے ہی کوئی کہانی گھڑ رہا ہے۔ صرف اپنی اصلیت چھپانے کے لیے۔ جو یہاں پر موجود کوئی بھی نہیں جانتا سوائے میرے۔ میں بتاتا ہوں یہ اصل میں ہے کون۔ یہ۔"

وہاج تلملاتا پھر سے آگے بڑھا تھا کہ اس نے اک پنچ مار کر اسے پھر پرے دھکیل دیا۔ اور جب تک وہ سنبھلتا وہ اپنا داؤ چل چکا تھا۔ اس کی تیز دھاری سی چلتی زبان نے تو جیسے اس کی قوت گویائی پر ہی پہلی ضرب لگائی تھی۔ کئی لمحے تو وہ کچھ بولنے جوگا ہی نہیں رہا۔ وہ بولتا ہی جا رہا تھا۔ اور اس کے غلیظ منہ سے نکلتے لفظ اس کی روح کاٹ گئے تھے۔ وہ بلبلاتا ہوا ایک بار پھر اس پر جھپٹا تھا۔

"جھوٹے، مکار لوکے۔"

وہاج اسے دبوچ ہی لیتا جو چند لوگ اسے قابو نہ کر لیتے۔ وہ اچھل اچھل کر اسے مارنے جا رہا تھا۔ اس نے بکواس ہی ایسی کی تھی۔ اس کا خون ابلنے لگا تھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

کریم داد ملک کا خاندان پشتوں سے اس گاؤں میں آباد تھا۔ رواداری اور شرافت تو جیسے ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ سفید پوشی ان کا عیب ضرور

رہی تھی مگر انہوں نے ہمیشہ عزت بھی خوب کمائی تھی۔ لیکن آج تو انہونی ہی ہو گئی تھی اسی کر بم داد ملک کی اولاد۔ اور اس کے یہ کچھن۔ جسے وہ سب اتنا سادہ اور معصوم سمجھ رہے تھے۔ اس کے ایسے کرتوت۔ توبہ توبہ۔ کئی ایک تو کانوں کو ہاتھ لگاتے باقاعدہ طور پر افسوس کا اظہار کرنے لگے۔

جتنے منہ اتنی باتیں۔ وہ جو سچا تھا اور چیخ چیخ کر سچائی بتانا چاہ رہا تھا۔ اس کی کسی نے ایک نہ سنی۔ اس جھوٹے کی بکواس اور بطور ثبوت سیل فون سے لی گئی وہ تصویریں جو اس کی مہارت کا منہ بولتا شاہکار تھیں پر سب نے یقین کر کے اسے شرمندہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ بھرے مجمع میں ایسی کسی ذلت کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ وہاج کا بس نہ چل رہا تھا۔ اس شاطر اور عیار انسان کی گردن اڑا دے۔ وہاج کے دوست اسے زبردستی کھینچتے ہوئے وہاں سے لے گئے تھے۔ بھیڑ بھی چھٹنے لگی۔ احسان سینہ تانے واپس ہوا تھا۔ اسے کہتے ہیں نہلے پہ دہلا۔ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے۔ سجاد کے چہرے پر نا قابل فہم تاثرات تھے۔

''تمہیں کیا ہوا ہے۔ تم نے کیوں منہ پھلا رکھا ہے۔''

''آپ نے یہ سب ٹھیک نہیں کیا بھیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا۔ بے شک یہ خاندان کئی ایک بار پورے گاؤں میں مجھے بے عزت کر چکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے کبھی اس حد تک جانے کا نہیں سوچا تھا۔ آپ نے تو سیدھا ہی زرتاج پر الزام لگا دیے۔ کہ وہ چاچا کرامت کے ساتھ۔ نہیں۔ نہیں۔ یہ سب بہت غلط ہوا ہے۔ وہ ایسی لڑکی ہرگز بھی۔''

''اوہ میرے جگر۔ میں جانتا ہوں، وہ لڑکی تجھے اچھی لگتی ہے۔ تو اس سے پیار کرتا ہے۔ لیکن یہ بات خود سے بھی کہتے ڈرتا ہے۔ اس لیے کہ ایک تو وہ لڑکی اب تک تجھ سے پٹائی نہیں گئی۔ دوسرے یہ خوف کہ تیری اماں اس کے لیے راضی نہیں ہو گی۔ اور میں نے تو تجھے تیری محبت سے ملانے کا پلان بنایا ہے سمجھا کر پیارے۔ میں نے یہ سب نوٹنکی صرف تیری خاطر ہی تو لگائی تھی۔''

وہ کثرت سگریٹ نوشی سے کالے پڑتے ہونٹ پھیلائے اسے حیران کر گیا تھا۔ سجاد چلتے چلتے رک گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔ مطلب کیا ہے اس سب کا؟''

''اوہ۔ میرے بھولے بھائی! دیکھو تم اس لڑکی کو پسند کرتے ہو۔ تو بس سمجھ اس وقت لوہا گرم ہے۔ ایک ہی چوٹ میں تیرا کام ہو جائے گا۔ وہ لڑکی پورے گاؤں میں بدنام ہو چکی ہے۔ اب کہیں بھی آسانی سے اس کا رشتہ تو ہو گا نہیں۔ تو اگر ایسے میں تیرا رشتہ وہاں جائے گا۔ تو کون مائی کا لال ہے جو انکار جیسی حماقت کرے گا۔ اور وہ بھی تجھے۔ ارے میں کہتا ہوں وہ لوگ ہاتھ باندھ کر ہاں کریں گے۔ اور وہ لڑکی بھی ساری عمر تیرے سامنے سر نہیں اٹھا پائے گی۔ بس اب تو گھر چل کر تیاری کر۔'' اور مارے حیرت و خوشی کے سجاد کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایسا شاندار تصور۔ وہ تو مارے خوشی کے بے حال ہی ہونے لگا۔ ایسا زبردست خیال اس کے کند ذہن میں تو آ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بے اختیار اپنے پیارے بھیا کے گلے لگنے کو بڑھا تھا کہ اماں کی یاد نے وہیں روک لیا۔

''مم...... مگر۔ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا کہ وہ اماں۔''

''اوہ میرے ننھے شہزادے۔ کیا اماں۔ اماں کر رہے ہو۔ یار! تم اب بڑے ہو چکے ہو۔ ماں کا کہنا ماننے کے ساتھ اب تم ان سے اپنی بھی کچھ منوا سکتے ہو۔ اور پھر میں ہوں نا۔ جب میں نے اتنی بڑی چال چل دی ہے تو پھر آگے بھی مجھ پر بھروسہ رکھو اور دیکھتے جاؤ۔ ہوتا ہے کیا۔''

اور سجاد کی مرعوبیت کا وزن کچھ اور بڑھا تھا۔ بھیا ضرور کوئی چمتکار ہی دکھائیں گے۔ اسے یقین تھا۔

☆☆☆

اور انہیں تو اس پر ایسا ہی یقین تھا کہ جیسے ہر صبح سورج مشرق سے ہی طلوع ہوتا ہے۔ تو وہ بھی ایسے ہی کبھی بے راہ نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے شروع سے ہی اسے راہ راست کے سبق پڑھائے تھے۔ پھر وہ ہر ہر بات ان ہی سے تو کہنے کی عادی تھی۔ وہ تو یہ بھی جانتی تھیں کہ سجاد آج کل کچھ زیادہ ہی ہوشیاریاں دکھا رہا ہے۔ آتے جاتے بے دھڑک تنگ کرتا ہے۔ اور اب تو وہ سنجیدگی سے اس کا کوئی حل سوچ رہی تھیں کہ یہ سب۔ وہ جیسا بھی بے ہودہ سہی مگر تنہا ایسی جرأت اس کے بس کا روگ نہیں تھی۔ یہ سارا کیا دھرا اسی بدمعاش کا ہے۔ جو مہمان سے اب بلائے جان ہو گیا تھا۔

انہیں تو رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ زرتاج اٹھ کر باہر چل دی تھی۔ زینت خاتون کی آنکھوں سے سیل رواں جاری تھا۔

"اللہ جانے فاخرہ اور اس کے خاندان نے ہم سے کس بات کا بیر پال رکھا ہے۔ شروع سے ہی اس عورت اور اس کی اولاد نے جینا محال کیے رکھا ہمارا۔ اپنی کوتاہیاں اور گناہ ماننے کے بجائے الٹا ہمارے سروں میں خاک ڈالتے آئے ہیں۔ پہلے بھی کئی بار تماشے لگا چکے ہیں۔ مگر اس بار تو حد ہی کر دی۔ ایسی جہالت۔ ایسا کمینہ پن۔ دیکھو تو کم بختوں نے مار مار کر کیا حشر کر دیا میرے بچے کا۔ زیادتی بھی ان کی اور ظلم بھی اسی پر۔ اور میری زرتاج، اس کا کیا قصور تھا۔ انہیں موت کیوں نہ آئی میری معصوم بچی کا سر بازار نام لیتے۔ ہم بے چاروں کے پاس تھا ہی کیا سوائے عزت کی چادر کے۔ اور ان لفنگوں نے آج وہ بھی تار تار کر دی۔ قہر خدا کا۔ انہیں تو جیسے بھول ہی گیا کہ ان کے گھر میں بھی ایک بیٹی ہے۔ کوئی شرم کوئی لحاظ نہ آیا انہیں۔ ظالموں نے میرے دل پر ضرب لگائی ہے۔ اللہ کرے گا اس سے دہرا عذاب بھگتیں گے فاخرہ اور اس کا سارا خاندان۔ دیکھنا دکھے دل کی آہ کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔"

"بے شک۔ اللہ بہتر منصف ہے۔ اور کسی پر بہتان باندھنا تو نہایت ہی قبیح فعل ہے۔ وہ اپنے کیے کا انجام ضرور پائیں گے۔ آپ حوصلہ رکھیں آپا۔" شمسہ نے ان کی دل جوئی کی تھی۔ وہ اور پھپھک کر رو دیں۔

"حوصلہ ہی تو نہیں ہو رہا مجھ سے۔ مجھے تو یہی غم کھائے جا رہا ہے۔ کس کس کا منہ بند کروں گی۔ کس کس کو سچائی بتاتے پھریں گے۔ کون یقین کرے گا ہمارا۔ اب تم نے دیکھا ہی تھا۔ کرامت کی بیوی نے جو تماشا لگایا۔ بہتیرا سمجھایا اسے کہ یہ سب ان بے غیرتوں کی بے ہودگی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر و... جاہل عورت ہمارے ساتھ ساتھ شوہر کو بھی بے عزت کرتی ہوئی گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ یعنی ان کی بکواس پر مہر تصدیق ثبت کر گئی۔ اور جب اس بدنا... پر کئی برسوں کی رفیق چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ تو میری بچ... کے کردار پر لگنے والا داغ کیوں کہ ڈھل سکے گ... ہماری بے گناہی کو کون مانے گا۔ یہ دنیا کب ایس... کہانیاں بھولتی ہے۔ ہائے میرے اللہ کیا ہو گا اب..." زینت خاتون نے بھل بھل بہتے آنسو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے اک ہچکی لی۔ شمسہ متاسف سی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

ایک ہنستے بستے گھر کی عزت کا جنازہ نکال د... تھا بد بختوں نے۔ اللہ ہی پوچھے گا ان سے۔ ان ک... بھی رواں رواں کوس رہا تھا۔ زینت خاتون سسکیاں بھر رہی تھیں۔ وہ مہر بہ لب ان کا شانہ تھپکنے لگیں۔ جیسے اس نے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی... انہیں بھی یہی مناسب لگا لب سی لیں۔ کیونکہ ڈھونڈے سے بھی ایسے لفظ ہی نہیں مل رہے تھے ج... ان کی اذیت کو دور کر سکتے۔ اور بمشکل آنسوؤں پر قا... پاتے وہ ان سے کہہ رہی تھیں۔

"تمہیں پتا ہے شمسہ! کچھ دیر پہلے کرامت آ... تھا تمہارے بھائی کے پاس اور جانتی ہو اس نے ک... کہا ہے ان سے؟" انہوں نے اپنی اکھڑتی سانسیں بحال کرنے کے لیے بولتے بولتے اک پل کا توقف...

کیا تھا اور ان کی سانس رکی تھی۔ جب اگلے الفاظ سماعت میں اترے۔

"ہمارے ساتھ تو جو بیتی سو بیتی۔ کم تو اس کے ساتھ بھی نہیں ہوئی۔ اس کا تو بسا بسایا گھر ہی اجڑ گیا نا۔ پورے علاقے میں کسی کو منہ دکھانے جوگا نہیں رہا بے چارا۔ اس نے حل بتایا ہے۔ جس سے تماشا بنانے والوں کے منہ پر تھپڑ بھی پڑے گا۔ اور سارے تماش بین بھی چپ کر جائیں گے۔ وہ زرتاج بانو سے نکاح کرنا چاہ رہا ہے۔ نہایت سادگی اور پوری عزت کے ساتھ۔"

اور اک چھنا کا ہوا تھا۔ نا صرف شمسہ کے اندر بلکہ اس کے ہاتھ سے بھی کانچ کا گلاس چھوٹ گیا تھا جو اب وہیں حواس باختہ سی بکھرے پانی پر پھیلی کرچیوں کو خوف زدہ نظروں سے گھور رہی تھی۔

☆☆☆

تائی فاخرہ انہیں غصے سے دیکھ رہی تھیں۔

احسان نے ان کے شانے پر بازو پھیلایا۔

"اوہ میری پیاری آپا! دیکھو اس میں سراسر آپ ہی کا فائدہ ہے۔ اس خاندان نے پہلے بھی کئی بار تنگ کیا ہے آپ کو۔ اب تو وقت آیا ہے سارے حساب برابر کرنے کا۔ میں تو کہتا ہوں اس موقع کو ہاتھ سے مت جانے دیں۔ ایک عیب دار لڑکی کو گھر لا کر پورے گاؤں کا دل جیت لیں گی آپ۔ پھر مزے کی بات آپ کا جوتا ہمیشہ اس کے سر پر رہے گا۔ جیسے چاہے سلوک کریں۔ کوئی پوچھ پڑتال کرنے والا نہ ہوگا۔ آپ کو تو مفت کی نوکرانی ہاتھ لگ جائے گی۔ رانی بن کر دن رات اس پر حکم چلائیں۔ اور موج منائیں۔ ذرا سوچیں کچھ دن تک سائرہ اپنے گھر چلی جائے گی۔ اور سجاد کو بھی کاروبار کے لیے میں اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ پھر آپ اور ارباز ہی ہوں گے یہاں۔ تو آپ کی خدمت کے لیے بھی تو کسی کو یہاں ہونا چاہیے کہ نہیں؟ بس سمجھیں یہ وہی خدمت گار ہوگی۔ باقی سجاد کو میں وہاں کسی چیز کی کمی نہیں آنے دوں گا۔ اس جیسے کماؤ پوت کو وہاں رشتے بھی بہت۔ آپ کی مرضی ہوئی تو اس کی شادی بھی کروا دوں گا۔ اور اگر دوسری صورت میں۔ وہاں سے انکار ہو گیا تو بھی مات نہیں کیونکہ آپ نے تو بڑے ظرف کا مظاہرہ کیا نا۔ اب یہ ان لوگوں کی قسمت کہ پھر تمام عمر اسے گھر میں بٹھا کے رکھیں۔ کیونکہ ایسے میلے دامن والی کا اب کہیں اور رشتہ تو ہونے والا نہیں۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔"

اس نے گردن اکڑا کر تائید چاہی تھی۔ اور وہ سب سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ ان کے دل کو لگی تھیں ساری باتیں۔ انہوں نے نرم پڑتی نگاہوں سے اس کی شکل دیکھی تھی۔ اور اپنے فیصلے پر مغرور ہوئیں۔ ایسا معاملہ فہم اور مدبر داماد انہیں اپنے سسرالیوں میں سے تو ملنے والا نہیں تھا۔ یہ تو ان کے میکے کا ہی خون ہے۔ جس میں عقل و تدبر کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔ سائرہ بھی اس کی حکیمانہ گفتگو کی قائل دکھائی دے رہی تھی۔ اور بتدریج اماں کے ماتھے کے بل کھلتے دیکھ کر سجاد کا دوران خون بھی تیز تر ہوا تھا۔ اس کی خوش فہمیوں کی گڈی کی اڑان اور اونچی ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

ساتویں کا چاند افق کے ماتھے پر جگمگا رہا تھا۔ مگر پھر بھی رات ایسی پر ہول اور ویران۔ ایسا تو پہلی بار ہوا تھا۔ چاندنی بھی سیاہ لبادہ اوڑھے لگ رہی تھی۔ جو نظروں کو خیرہ کرنے کے بجائے ان میں مرچیں سی بھر دیے۔ سانس لینا بھی محال تھا۔ اندر اک آگ سی لگی تھی۔ ہر گزرتا پل دم گھونٹ رہا تھا۔ بے کیفی اور بے چینی تو جیسے گزشتہ کئی دن سے زندگی کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔ بیزاریت ایسی نس نس میں رچی تھی کہ اس نے دوبارہ گاؤں کا رخ ہی نہیں کیا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جل جل کر مر رہا تھا۔ وہ اب تک کسے دھوکا دے رہی تھی۔ اسے یا پھر خود کو؟ یا وہ ہی اندھا ہو گیا تھا جو اسے پہچان نہ سکا۔

وہ تو یہی سمجھ رہا تھا۔ اس کی محبت سچی ہے۔ کہیں کوئی کھوٹ کہیں کوئی جھوٹ نہیں۔ اسی لیے تو کبھی لفظوں کی بھی فضول خرچی نہ کی۔ ضرورت ہی

کیا ہے۔ جب ان شفاف جھیلوں کی سطح پر اپنا ہی نام لکھا ہے۔ وہ تو اسی سرشاری میں گم تھا کہ اک بار اس کم بخت سجاد نے اک پتھر پھینک دیا۔

تب اس کے حواس منتشر ضرور ہوئے تھے۔ مگر وہ بدگمان نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ رات ایسی ہی اک رات تھی۔ جب وہ وسیم کی شادی میں شرکت کے لیے گاؤں آیا تھا۔ اس کی رسم مہندی پر پہننے کے لیے خریدا گیا نیا سوٹ نکال کر اس نے آپا کو دیا تھا کہ استری کر دیں۔ انہوں نے پیکٹ پکڑتے ہوئے اک مسکراتی نظر اس پر ڈالی تھی۔ جس کا مفہوم اسے تب تو سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر جب تیار ہو کر وہ آپا کے پاس بیٹھا ان سے بات کر رہا تھا۔ تب کوئی دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اترا۔ اس نے نظر ادھر پھیری۔ جو ساکت ہوئی۔

"اُفف۔ گلی میں تو اتنا رش ہے آپا! کہ کیا بتاؤں۔ میرا خیال ہے ہم چھت سے ہی۔" وہ جس تیزی سے آئی تھی اسی رواں انداز سے بولتی سامنے آن رکی تھی کہ اس پر نظر پڑتے ہی گویا زبان دانتوں میں داب لی۔ وہ اسے دیکھ کر حیران تھا۔ سادگی اس کی شخصیت کا لازمی عنصر تھی۔ کبھی اسے عام لڑکیوں کی طرح بناؤ سنگھار کرتے نہیں دیکھا تھا۔ کیونکہ زینت خاتون جیسی سخت مزاج یاں کے علا▪▪ اسے تو شمسہ جیسی باوقار استانی بھی میسر تھی۔ جنہوں نے اس کے اندر کی لڑکی کو شاید وقت سے پہلے ہی اپنی عمر سے بڑا کر دیا تھا۔ اب وہ مہندی پر جانے کے لیے تیار ہو کر آئی تھی۔ فیروزی رنگ کی فراک۔۔ اوہ فیروزی رنگ۔ اچھا تو اب سمجھ آئی۔ وہ بھی تو اسی شیڈ کا ہی کرتا شلوار پہنے ہوئے تھا۔ اب یہ محض اتفاق تھا لیکن آپا کی وہ مسکراہٹ۔ پچھلی بار انہوں نے اس سے اک خاص بات کی تھی۔ تب سجاد کی بے ہودگی کے باعث اس کا دماغ الٹا ہوا تھا۔ وہ انہیں ٹال کر اٹھ گیا تھا۔ اور اب جھنجلا کر۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر غصہ آنے لگتا تھا۔ یا شاید اس کی سہمی سی صورت اچھی لگتی تھی۔ جب وہ گھبرا کر کن اکھیوں سے دیکھتی تو دل گدگدانے لگتا تھا۔

"اُفوہ۔ ایک تو آپ سے بات کرنا ہی محال ہے۔ کبھی میری پوری بات سننے کا وقت نہیں ملے گا آپ کو۔ حسرت ہی رہے گی مجھے۔ اپنے گھر آ کر بھی غیر ہی تصور کرتا ہوں خود کو۔ چلیں سنیں اب آپ اپنی سگی کی فریاد۔"

وہ خواہ مخواہ چڑتا اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ اسی نخرے میں اسے بھی نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ تب ہی تو دل مضطر نے بے قرار کیے رکھا۔ وہ اسے دیکھنے کی چاہ میں ہی تو کشاں کشاں چھت پر کھنچا چلا آیا تھا۔ اندازہ تھا اسی راستے سے واپسی ہوگی۔ لیکن وہاں ٹھٹھے لگاتے سجاد کے ساتھ مثل چاند سا روپ لیے وہ بھی ہوگی۔ یہ تو گمان کے ہزارویں حصے میں بھی نہ تھا۔ جب ▪▪ جانے کے لیے آئی تھی تو کیسا سادہ سا روپ تھا۔ اور اب اس کی سجی سنوری کھلے گلاب سی صورت کسی گلوب کی مانند لشکارے مار رہی تھی۔

اُفف۔ ایسا دو رخا روپ۔ اک طرف سادگی کا مرقع تو دوسری جانب۔ اس کے اندر تو بھانبڑ ہی جل اٹھے تھے۔ تو کیا سجاد سچ کہتا تھا؟ کیا وہ ہی کم فہم تھا؟ اگر اک پل بھی وہاں ٹھہر جاتا تو جانے کیا غضب ہوتا۔ وہ اپنے اندر کے شور سے ہی گھبرا کر الٹے پیروں واپس ہوا تھا۔ اس رات بھی تارے اس کے سنگ مل کر روئے تھے۔ لگتا تھا آج بھی شریک غم ہونے آئے ہیں۔

کل کی تو بات ہے۔ جب گھبرائے ہوئے میاں جی کی کال اسے موصول ہوئی تھی۔ اور اس کے استفسار پر انہوں نے اپنی شدید بیماری کا بتایا تھا۔ تب اسے کچھ نہ سوجھا تھا۔ علاوہ فوری گاؤں کا رخ کرنے کے۔ اور کاش وہ نہ ہی آیا ہوتا۔ میاں جی نے کبھی اس کے ساتھ ایسا ناٹک نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ اب کر گزرے تھے۔ وہ تو ششدر ہی رہ گیا تھا ان کی بات پر جو کچھ انہوں نے کہا۔ اور جس کی تائید شمسہ بھی خوب کر رہی تھیں۔ اور اسے غصہ تو تھا ہی ان ہی پر الٹ پڑا۔

”میں آپ کی اولاد نہیں ہوں نا۔ اس لیے بڑھ بڑھ کر ایسے مشورے دے رہی ہیں۔ اگر آپ کا اپنا بیٹا ہوتا تب میں دیکھتا کیسے آنکھوں دیکھی مکھی نگلتی ہیں؟“ اور جہاں اس کے طعنے پر شمسہ کا چہرہ سفید پڑا تھا وہیں میاں جی نے ضبط کھو کر اس کے چہرے پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ جمایا۔

”بے غیرت۔ بے حیا۔ کم ظرف انسان۔ تمہیں ذرا شرم نہیں آئی بکواس کرتے ہوئے۔ میری آدھی ٹانگ برابر تھے تم۔ جب یہ عورت تمہاری ماں بن کر اس گھر میں آئی تھی۔ اور تب سے یہ صرف تمہاری ماں ہی ہے۔ کیا کیا نہیں کشٹ اٹھائے اس نے تمہاری خاطر۔ اس نے تمہارے لیے نہ دن دیکھا نہ رات۔ نہ کبھی خود ستھرا پہنا نہ اچھا کھایا۔ میری ساری کمائی پوری ایمانداری سے تم پر لٹاتی رہی۔ کہ کل کو تم اس قابل ہو جاؤ کہ ہمارا بھی سہارا بن سکو۔ تمہاری ناز برداریاں کرتے کرتے بال سفید پڑنے لگے ہیں اس کے۔ اور آج یہ دن ہے کہ تم ہی اس پر انگلی اٹھا رہے ہو۔ خبردار جو اس کے بعد تم نے اس عورت سے کوئی واسطہ رکھا۔ اب یہ تمہاری ماں نہیں۔ صرف میری بیوی ہے۔ اور تم بھی کان کھول کر سن لو شمسہ بتول! آئندہ جو تم مجھے اس احسان فراموش کے آس پاس بھی نظر آئیں تو اس گھر سے نکالنے میں اک منٹ نہیں لگاؤں گا۔ یہ ناہنجار اپنا سامان سمیٹ کر یہاں سے دفع ہو جائے تو دروازہ بند کر لینا۔“

بڑے ہی ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے وہ۔ اول تو انہیں غصہ آتا نہیں تھا لیکن اگر کبھی غصہ آ ہی جاتا تو یونہی آناً فاناً فیصلے کر گزرتے تھے جیسا کہ ابھی۔ وہ جاتے جاتے اسے بھی سنا گئے تھے۔

”میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارے لیے ہر فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مجھے لیکن اگر تمہیں مجھ سے اختلاف ہے۔ تو ٹھیک ہے اب میری طرف سے تم آزاد ہو جو جی میں آئے کرو۔ بس آئندہ میرے متھے نہ لگنا۔“ وہ حق دق انہیں جاتا دیکھتا رہا۔ ادھر شمسہ بلک بلک کر رو رہی تھیں۔ ندامت نے سر سے پیر تک جھنجھوڑ ڈالا۔ جس عورت نے کبھی اس کی آنکھ میں اک آنسو نہ برداشت کیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے بہتا سیلاب وہ کیسے سہہ جاتا۔ وہ تڑپ کر ان کے قدموں میں جا بیٹھا تھا۔

”خدا کے لیے آپا چپ ہو جائیں۔ ایسے روئیں تو مت۔ میں آپ کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے معاف کر دیں پلیز۔ مجھے سب کچھ قبول ہے بس آپ کا یہ رونا نہیں۔“ اور شمسہ تو مارے خوشی کے اور پھپک کر رو پڑیں۔ اس کے ہاتھ چومے جا رہی تھیں۔

”میرے بچے۔ میرے شہزادے تم نے ماں باپ کا دل راضی کیا ہے۔ دیکھنا تم پر خوشیوں کی بہاریں برسیں گی۔“

اور فی الوقت تو اس کے دل پر تازیانے برس رہے تھے۔ دور سے اک مرغ نے بانگ دی تھی۔ کہ دور و قریب میں ہلچل سی مچ گئی۔ ایک کے بعد ایک۔ فضا میں گونجتی بانگیں بتا رہی تھیں۔ رات اپنا سفر طے کرنے کو ہے۔ میاں جی اور آپا نے اپنی سی کی نا۔ اب آگے کے اختیارات اس کے ہیں۔ بس ایک بار ان کی سن لی۔ اب آگے وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ اس کم بخت دل کی بھی نہیں۔ وہ مٹھی بھر خاک اپنے ہی سینے پر ڈالتا وہ بے پیر نیچے اترا تھا۔ کمرے کا دروازہ ویسا ہی ادھ کھلا تھا جیسا وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ہاں بیڈ پر پڑا بت اب وہاں نہیں تھا۔ وہ سیدھا بیڈ پر ڈھیر ہونے کو بڑھا تھا کہ راہ میں اسے اپنی چیزوں سے الجھتا پا کر سیخ پا ہوتا وہیں ٹھہر گیا۔ بپھرے ہوئے عقاب کی طرح جھپٹا مار کر اس کے ہاتھ سے شرٹ کھینچی تھی۔ وہ اس کے کپڑے استری کرنے کے بعد اب تہہ لگا کر بیگ میں جما رہی تھی۔

”جب میں تم پر پہلے ہی واضح کر گیا ہوں۔ کہ تمہیں یہاں لانے والے میاں جی اور شمسہ آپا ہیں۔ تم اپنا واسطہ اور تعلق انہیں تک محدود رکھوگی۔ تو پھر یہ سب ڈرامہ کرنے کا مقصد کیا ہے تمہارا؟“

یہ پہر اور گھر میں آرام کرتے نفوس کا احساس نا

ہوتا تو شاید اس کی دھاڑ دور تک سنی جاتی۔ وہ جس کی پلکیں پہلے ہی کھارے پانیوں کے بوجھ سے جھکی پڑ رہی تھیں۔ جس نے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو یہ خواہ مخواہ کی مصروفیت تلاشی تھی۔ وہ بس اک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اگر یہ سنجوگ اس کے لیے گلے کا طوق تھا تو وہ بھی کب آمادہ تھی۔ محبت تو نام ہی اعتبار کا ہے۔ جب اعتبار ہی نہیں تو پھر کیسی محبت؟ اس نے بھی اسی رات ایسی محبت پر فاتحہ پڑھ ڈالی تھی۔ جب وہ اس کی پکار پر بھی نہیں ٹھہرا تھا۔ وہ اسے بے یار و مددگار چھوڑ کر کس بے رحمی سے پلٹ گیا تھا۔ کیوں کیا اس نے ایسا؟ وہ رک کر اس سے کوئی سوال تو کرتا۔ کچھ کہتا کچھ پوچھتا تو سہی۔ ملزم کو بھی صفائی کا اک موقع دنیا کی ہر عدالت دیتی ہے۔ لیکن۔ وہ تو اک نفرت بھری نگاہ سے ہی اسے مجرم ثابت کرتا جو گیا تو پھر پلٹ کر ہی نہیں آیا۔

اس درجہ بے حسی پر اس کا دل تب ہی مر گیا تھا۔ اب تو بس اک زندہ لاش تھی۔ جسے قدرت کی ستم ظریفی کے ہاتھوں یہاں تک گھسیٹ کر لانا پڑا تھا۔ اس کے ساتھ تو ہر طرف سے ہی برا ہوا تھا۔ کچھ کھیل دشمن کھیل گئے۔ کچھ سجن کی بے پروائی مار گئی۔ اگر اسے فیصلے کا اختیار دیا جاتا تو وہ باقی کا سفر طے کرنے کے لیے کم از کم باذل جمال کا ہاتھ نہ تھامتی۔ مگر مصیبت تو یہ کہ کسی نے اس قابل جانا ہی نہیں۔ سب نے اپنی سی کی۔ کیا اپنے کیا پرائے۔ اس کے لیے تو سب ایک ہو گئے تھے۔ وہ سب ہی سے نالاں تھی۔ اور اس سے تو بے حد خفا۔ وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ تب ہی تو کوئی بھی وضاحت دیے بنا منہ پھیر لیا۔ باذل نے عالم طیش میں صوفے پر ترتیب سے رکھے اپنے سارے کپڑے ہاتھ مار کر گرا دیے۔

"آئندہ کوئی ڈرامہ رچانے کی کوشش کی نا تو اچھا نہیں ہو گا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے کسی فریب میں آؤں گا۔ مجھ پر بہت اچھی طرح سے کھل گئی ہے تمہاری اوقات۔ بہتر ہو گا تم بھی خود کو پہچان کر رہو۔"

وہ انگلی اس کی جانب اٹھائے سخت لہجے میں کہہ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے کمرے سے ہی نکل گئی۔ اذان فجر کا وقت ہو گیا تھا۔ اسے نماز پڑھنا تھی۔

☆☆☆

آج کل پھر اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسکول سے چھٹی ہوتے ہی وہ امرودوں کے باغ کا رخ کرتا اور کچے پکے امرود توڑ توڑ کر کھاتا یا غلیل پکڑے معصوم چڑیوں کی جان دق کرتا۔ اب بھی وہ اسی مشغلے میں گم تھا۔ جب اک درخت کے پیچھے سے کسی نے ہاتھ نکال کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ صورت دیکھتے ہی اس کا دل رکنے کو تھا۔ بے بس پرندے کی مانند پھڑ پھڑا کر خود کو چھڑانا چاہا مگر بے سود۔ اس کے سوکھتے ہونٹوں پر فریاد آئی تھی۔

"وہاج بھائی۔ مجھے چھوڑ دیں۔ قسم لے لیں میں نے کچھ نہیں کیا۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے تو جیسا آپ نے کہا تھا۔ میں نے بالکل ویسے ہی کیا تھا۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ وہ خبیث آدمی یہ سب کچھ کر گزرے گا۔ ورنہ میں۔"

"اس سے مجھے بھلائی کی امید تھی بھی نہیں۔ اس کی جو اوقات تھی، اس نے اسی مطابق ردعمل دیا تھا۔ اور اب جو مجھ سے بن پڑے گا۔ وہ میں کروں گا۔ کیونکہ مجھے صرف اپنا بدلہ ہی نہیں چکانا ہے۔ بلکہ کسی کی زندگی بھی بچانی ہے۔ اور اب اس نیک کام میں تم میرا ساتھ دو گے۔" اور اس کی جان میں جان آئی تھی۔ وہ تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں ان دونوں کے کیے کی سزا اسے ہی نہ دے ڈالے۔ جھٹ ہامی بھری۔

"میں...... ہاں...... ہاں...... اگر کام میرے کرنے کا ہوا تو ضرور کروں گا وہاج بھائی۔ آپ کام بتائیں۔"

"ایسے نہیں۔ پہلے وعدہ کرو۔ ذرا سی بھی غفلت نہیں چلے گی۔ اور کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے

دو گے۔" اس نے ہاتھ بڑھایا تھا۔ ▪ متذبذب ہوا۔

"کیا کوئی بہت مشکل کام ہے؟"

"نہیں، تمہارے لیے تو بالکل بھی نہیں۔ ایک چھوٹا سا تو کام ہے۔ جو تم نہایت آسانی سے سرانجام دے سکتے ہو۔" وہاج نے شانہ تھپک کر حوصلہ بڑھایا۔

"اچھا۔ اگر ایسی بات ہے تو پھر بتائیں۔" اور وہاج نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کان میں کچھ کہا تھا۔ جسے سنتے ہی وہ بدک کر پرے ہوا۔

"یہ...... یہ تو چوری ہو جائے گی نا وہاج بھائی۔ مم...... میں کیسے۔"

"کمال ہے احسان جیسے بدقماش شخص کا بھانجا اور سجاد جیسے آوارہ مزاج کا بھائی ہو کر تم ایک اتنا سا کام کرتے ڈر رہے ہو۔" وہاج کو اس کا انکار برا لگا تھا۔

"کیونکہ میں ان دونوں جیسا نہیں ہوں۔ جو چیز غلط ہے میں اسے غلط ہی جانتا ہوں۔ میری ٹیچر نے تو مجھے یہی سکھایا تھا۔ اور مجھے ان کی بتائی ہر بات یاد ہے۔"

"اور تمہاری اس ٹیچر کے ساتھ جو ہوا۔ تم وہ بھول گئے؟ اس کی عزت پر دھبہ لگانے والے تمہارے یہی رشتے دار ہی تھے۔ جب تم اچھے اور برے کا فرق جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہو گے۔ کہ مظلوم کی مدد کرنا بھی بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن خیر جیسا تم مناسب سمجھو۔ میں تمہیں فورس نہیں کروں گا۔ میرے اور میرے خاندان کے ساتھ جو ہوا۔ سو ہوا۔ مگر اب تم تیار رہو جو ▪ بدکردار شخص تمہارے خاندان کے ساتھ کرے گا۔ میری بہن تو میرے پاس ہی ہے۔ میں اس کے آنسو پونچھ سکتا ہوں۔ مگر کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ایسا کر سکو گے؟ وہ تو اسے یہاں سے لے جائے گا نا۔ اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر وہ اسے کہاں لے جائے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کرے۔ تم دوبارہ اس کی شکل دیکھ بھی پاؤ گے یا نہیں۔"

ارباز کا دل بیٹھنے لگا۔ جس قدر اذیت وہ کاٹ رہا تھا۔ وہ اس کا درد سمجھ سکتا تھا۔ اور کسی پر ناحق کیا گیا ظلم اک دن پلٹ کر ضرور آتا ہے۔ یہ بھی اسے علم تھا۔ اس کی استانی نے ہی تو بتایا تھا اسے۔ اور واپسی کے لیے قدم بڑھاتے وہاج کو بے اختیار ہی گھبرا کر پکار بیٹھا تھا۔

"آپ جیسا کہیں گے، میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"سچ؟" وہ ٹھہر گیا تھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوہ جیو میرے شیر۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس نے بے اختیار خوشی کا اظہار کرتے پلٹ کر گلے لگایا۔

☆☆☆

آج کی صبح بھی بالکل ویسی ہی تھی۔ وہی چڑیوں کی چہچہاہٹ، وہی سنہری کرنوں کی گدگداہٹ، وہی قاعدے کا سبق یاد کرتی بچیوں کی آوازوں کی نرماہٹ اور ان سب کے ساتھ ساتھ اک اور لہجے کی کھنکھناہٹ جو بس اس کی سماعتوں پر ہی گراں بار ہوتی جا رہی تھی۔ اس قدر کہ وہ جھنجھلاتا بستر کی چادر پھینک کر اٹھا تھا۔

"شاباش بچو۔ آج سب نے بہت اچھی طرح سبق پڑھ لیا ہے۔ اور سب کو اپنا اپنا سبق یاد بھی ہو گیا ہو گا۔ اسی لیے سارے جلدی سے قاعدے بند کرو اور اب چھٹی۔ دوڑ جاؤ اپنے اپنے گھر کو۔ کوئی مجھے یہاں نظر نہ آئے۔" اور بچیاں تو جیسے اسی انتظار میں تھیں۔ جھٹ پٹ قاعدے جزدان میں رکھنے لگیں۔ آپا ہکا بکا اس کے ماتھے پر پڑے بل دیکھ رہی تھیں۔ اس کا رخ ان کی جانب ہوا تھا۔

"حد کرتی ہیں آپ بھی۔ کتنی بار عرض کر چکا ہوں۔ جب میں گھر ہوتا ہوں تو اس دن ان بچیوں کو صحن کی بجائے اپنے کمرے میں بٹھا لیا کریں۔ اگر مجھ سا کم بخت کبھی آپ کے دولت کدے پر آ ہی جاتا

ہے تو کبھی بھول کر اس کے آرام کا تھوڑا سا خیال ہی کر لیں۔ میں چند گھڑیاں سکون کی جینے آتا ہوں یہاں۔ لیکن وہ بھی مشکل کر دی گئی ہیں میرے لیے۔ اگر آپ کو میرا یہاں آنا گوارا نہیں تو صاف بتائیں۔ میں آئندہ بھی ادھر منہ بھی کر گیا تو کہیے گا۔"

وہ سنا تو نہیں رہا تھا۔ مگر کینہ توز نگاہ اس پر تھی جو اک بچی کو سبق دیتی اس کے قاعدے پر ہی جھکی رہ گئی تھی۔ اب معاملہ یہ تھا کہ بچی تو قاعدے سمیت غائب اور وہ ہنوز خمیدہ۔

"کیا ہو گیا ہے۔ صبح سویرے یہ کیا الٹا سیدھا بول رہے ہو۔ خدانخواستہ مجھے کیوں ناگوار گزرنے لگا تمہارا گھر آنا۔ میں تو تمہارے جاتے ہی آنے کے لیے دن گننے لگتی ہوں۔ اس بار تم پورے بائیس دن بعد گھر آئے ہو۔ اور وہ بھی میاں جی کے دس بار فون کرنے پر۔ گھر آنے کو تو تمہارا اپنا دل نہیں کرتا۔ اور خواہ مخواہ کی الزام تراشیاں مجھ پر۔ اور کب تمہارے آرام کا خیال نہیں رکھا میں نے۔ ذرا وہ دن تو گنواؤ مجھے۔" ان کا حساب پورا تھا۔ کڑے تیور لیے اب اس سے بھی چاہ رہی تھیں۔ وہ بھلا کہاں تھا اس لائق۔

ان کا حساب چکتا کرنے کے لیے تو اسے گھڑیاں نہیں بلکہ شاید صدیاں درکار تھیں۔ تب ہی لاجواب ہوتا۔ زوردار "ہونہہ" کرتا واپس پلٹ گیا۔

وہ اسے جاتا دیکھتی رہیں۔ سچ کہتے ہیں۔ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔ انہوں نے تو اپنے تئیں اس کی خواب نگری میں رنگ ہی رنگ بھر دیے تھے۔ وہ تو بن کہے ہی اس کا حال دل جان گئی تھیں۔ اور ایک وہ تھا کہ ممنون ہونے کے بجائے الٹا منہ کو آنے لگا تھا۔

اس روز زینت خاتون کے منہ سے کرامت کے نادر خیالات جانتے ہی انہوں نے خلوص نیت سے اپنے سپوت اعظم کا نام پیش کر دیا تھا۔ اگر قدرت کی طرف سے ایسا ہیر پھیر نہ آتا تو اللہ جانتا ہے۔ وہ یہ فریضہ کیسی دھوم دھام سے ادا کرتیں۔ کہ اگلی کئی دہائیوں تک ان کے شہزادے کی شادی یاد رکھی جاتی۔ ان کی تو دلی خواہش پوری ہوئی تھی۔ یہ سب ایسے ہی ہونا لکھا تھا۔ اور تم پشتم جیسے بھی ہوا۔ بہت اچھا ہو گیا۔ وہ تو بے حد خوش تھیں۔ مگر وہ ان دونوں کا کیا کرتیں۔ خلاف توقع جن کے منہ مشرق اور مغرب کا رخ کیے رہتے تھے۔ بادل کوئی آسمان سے اتری مخلوق تو تھا نہیں۔ وہ بھی اسی زمین پر رہنے والا اک عام سا مرد تھا۔ تب ہی تو ادھر ادھر کی سنی سنائی نے اس کے دل و دماغ پر بدگمانی کی تہ جما دی تھی۔ اور اس کا بہتر حل تو یہی تھا کہ زرتاج خود اپنے ہاتھوں سے اس کے اندر لگ جانے والے جالے اتار دیتی۔ مگر ان کے سمجھانے پر وہ تو صاف انکاری ہو گئی۔

"میں ایسی کوئی کوشش نہیں کروں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ میں مر جاؤں۔ ایسی ہی بے اعتباری تھی مجھ پر تو یہ احسان بھی کیوں کیا۔ آپ نے ان کے ہاتھ پیر تو نہیں باندھے تھے نا۔ صاف انکار کر دیتے۔ کیوں خود کو اس جبری مشقت میں ڈالا۔ میں کوئی چور تو نہیں۔ کہ بڑھ بڑھ کر اپنی صفائیاں پیش کروں۔ بنا کسی قصور کے مجھے یہ سب جھیلنا پڑا ہے۔ آپ تو سب جانتی ہیں آپا۔ آپ کو مجھ پر اعتبار ہے۔ اور اس چھت تلے رہنے کے لیے مجھے اتنا آسرا ہی کافی ہے۔ مجھے نہیں ضرورت مانگے کا بھروسہ لینے کی۔ میں چپ چاپ یہ سزا اس وقت تک کاٹنے کو تیار ہوں جب تک میرے دامن پر لگا یہ داغ دھل نہیں جاتا۔ اور مجھ سے وعدہ کریں۔ آپ بھی ان سے کچھ نہیں کہیں گی۔ کوئی دلیل۔ کوئی تاویل۔ کوئی وضاحت نہیں دیں گی انہیں۔"

اس کا لہجہ ایسا قطعیت بھرا تھا جو ان کے ہونٹوں کو بھی مقفل کر گیا تھا۔ اور اب انہیں دیکھ دیکھ کر سوائے کڑھنے کے اور کیا کرتیں۔ وہ ڈھیلے ہاتھوں سے چٹائی لپیٹ رہی تھی۔ جو آج جلدی چھٹی ملنے کی خوشی میں بچیاں یونہی چھوڑ گئی تھیں۔ اک گہرا سانس بھرتے وہ اسے آواز دینے کا قصد کر رہی تھیں کہ مسجد سے واپس آتے میاں جی نے عادتاً اسے پکا

راتھا۔
"زرتاج پتری! اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہوگئی ہو۔تو کچھ خیال اس بابے کا بھی کرلو۔لسی بن گئی ہے تو منٹ مار کے ایک بڑا گلاس لے کر آؤ میرے لیے۔" وہ ان کے پاس ہی تخت پر آبیٹھے تھے۔اور انہیں تو بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔
"لگتا ہے وہ دن میری زندگی میں تو آئے گا ہی نہیں۔جب آپ کسی بات کو سمجھ جائیں گے۔اب پھر وہی فرمائش۔کتنی بار کہوں ڈاکٹر نے آپ کو لسی پینے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔پہلے ہی کتنے ہفتے لگے ہیں آپ کی کھانسی کو ٹھیک ہوتے۔اب کیا پھر بیمار پڑنے کا ارادہ ہے۔"
"اوہ تو میں کون سا ادھر پوری چاٹی منگوا رہا ہوں۔کم سنائی دیتا ہے تمہیں۔ایک گلاس ہی تو لانے کو کہا ہے۔اور وہ بھی کتنے دن بعد۔جس کمینے ڈاکٹر نے مجھے لسی منع کی تھی۔وہ تو رہ گیا اپنے گھر۔پر تم تو مجھ غریب پر مفتے کی ہی ڈاکٹرنی بن بیٹھی ہو۔جب بھی کسی چیز کا نام لیتا ہوں۔شروع ہو جاتی ہو۔پرسوں آلو والے پراٹھوں کی فرمائش کی تھی۔تو کہہ دیا۔صحت کے لیے اچھے نہیں۔معدہ خراب ہو جائے گا۔کل آملیٹ کا کہا تب بھی تم نے چٹا جواب پکڑا دیا کہ اس سے بلڈ پریشر تیز ہو جائے گا۔اوئے تم نے مجھے جینے بھی دینا ہے کہ نہیں۔" میاں جی کو غصہ آ گیا تھا۔
"آپ سے تو بات کرنا ہی مشکل ہے۔" ان کا مزاج پہلے ہی بگڑا ہوا تھا کہ اب یہ نیا فضیحتا۔وہ زچ ہوتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"ہاں۔ہاں کہہ دو بڈھا ہو گیا ہوں۔سٹھیا گیا ہوں۔دماغ چل گیا ہے میرا۔" وہ ان کے انداز پر اور سیخ پا ہوئے۔تڑخ کر کہا۔
"زرتاج! ان کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی لا کر پلاؤ۔میں ان کے لیے ناشتا لے کر آتی ہوں۔" شمسہ کو میدان چھوڑنا ہی مناسب لگا تھا۔
"ٹھنڈے پانی سے کچھ نہیں ہوگا مجھے۔ہے نا؟ جیسے اس سے تو کھانسی نہیں لگتی۔بس لسی ہی لڑ جائے گی۔
آئی وڈی سیانی۔نہیں کرنا میں نے ناشتا بھی۔رکھوا اپنے پاس۔کمی نہیں ہے مجھے کسی چیز کی۔ابھی جا کے اپنے کسی شاگرد کو آواز ماروں نا تو نعمتوں کے ڈھیر لگ جائیں گے میرے لیے۔" وہ تو ایسے برافروختہ ہوئے کہ اٹھ کر چل دیے۔شمسہ نے بوکھلا کر اسے دیکھا تھا۔وہ لپک کر ان کی راہ میں آئی۔
"کیا ہو گیا ہے میاں جی۔صبح سویرے اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔آپا نے ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہا۔وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں۔خالی پیٹ ٹھنڈی لسی آپ کی صحت کے لیے نقصان کا باعث بھی بن سکتی ہے۔آپ پہلے ہلکا پھلکا ناشتا کرلیں۔پھر جو آپ کہیں گے، وہ میں خود بنا کر دوں گی۔پلیز یقین کریں میرا۔" اس شور شرابے پر وہ ایک بار پھر بے چین ہوتا کمرے سے نکلا تھا۔سنہری دھوپ کے ہالے میں وہ صبح بہاری لڑکی ان کا بازو پکڑے ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔میاں جی کا سارا غصہ پل میں کافور ہوا تھا۔مسکرا کر اس کا سر تھپکا۔
"اس پورے گھر میں اک تیری بات کا ہی تو یقین ہے مجھے۔میں جانتا ہوں میری زرتاج پتری جھوٹ نہیں بولتی۔لے میرے بچے! فیر تیرے ہی کہنے پر ناشتا کر لیتا ہوں میں۔چل جا چھیتی نال لے کہ آ۔اور ہاں تھوڑی دیر بعد لسی ضرور یاد رکھنا۔"
"اور جس نے بھی ایسی کوئی حماقت کی نا تو پھر وہ اپنی خیر منا لے۔" وہ جو عین دروازے کے درمیان میں کھڑا تھا۔پھنکارتے ہوئے بولا۔تیغ صفت نظریں کچن کا رخ کرتی زرتاج بانو پر جمی تھیں۔میاں جی کا جاتا غصہ اس کا انداز دیکھ کر واپس پلٹ آیا تھا۔
"کیا مطلب ہے بھئی تیرا۔یہ کیسے دھمکا رہا ہے۔اور دیکھ کیسے رہا ہے اسے۔یاد رکھ وہ تیری بیوی بعد میں، میری دھی پہلے ہے۔خبردار جو اس پر آنکھیں نکالیں۔جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں تیرے ویاہ کو

اور تو اس پر رعب بھی جمانے لگا ہے۔ آرام سے رہ آرام سے۔ یہ مت سمجھ کہ تجھ سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہیں ہے۔ میں ہوں ابھی سمجھے۔''

انہوں نے تو ٹھیک ٹھاک کلاس ہی لے ڈالی۔

وہ تلملاتا پھر سے اندر کی جانب بڑھا تھا۔ مگر ان کی بات ابھی ختم کہاں ہوئی تھی۔ پھر سے بولے۔

''اور یہ کوئی ویلا ہے تمہارے اٹھنے کا۔ میں دوسروں کے بچوں کو کس منہ سے مسجد آنے کا کہوں۔ جب میرا اپنا بچہ نہیں جاتا۔ وہاں تم سارا وقت کیا کرتے ہو۔ نماز پڑھتے ہو یا نہیں؟ میں نے بھی سوال نہیں کیا۔ لیکن کتنی بار سمجھایا ہے۔ یہاں آکر اس بات کا خاص خیال رکھا کرو۔ کہیں اور سے نہیں تو اپنی بیوی کو دیکھ کر ہی سبق سیکھ لو۔ ماشاء اللہ صبح سویرے اٹھتی ہے۔ نماز، قرآن کی تلاوت کے بعد ڈھیر ساری بچیوں کو بھی پڑھاتی ہے۔ سویرے ہی سویرے کتنی نیکیاں کما لیتی ہے۔ اور ایک تو ہے کہ تیری آنکھ ہی دس بجے سے پہلے نہیں کھلتی۔''

انہوں نے مبالغہ آمیزی کی حد کرتے مثال بھی دی تو کس کی۔ وہ ناشتا لیے آتی ان کی ''لاڈو رانی'' کو ایک بار پھر سے گھورنے ہی والا تھا کہ ان کی پہلی جھاڑ کسی بلب کی طرح ذہن کے اک گوشے میں روشن ہوئی تھی۔ کسی روٹھے ہوئے بچے کا سا منہ بنائے اس نے ''جی اچھا'' کہہ کر جان بخشی کروائی۔ کہ اس کے بنا اور کوئی چارا نہیں تھا۔ ان سے کیا بعید، وہ اس کے جلے دل پر کچھ اور گرما گرم انڈیل دیں۔ اور بھاپ اڑاتی سجی سجائی ٹرے اپنے سامنے دیکھ کر ان کا موڈ آپ و آپ خوش گوار ہو گیا تھا۔

''جیوندی رہ پتری۔ اللہ ڈھیر خوشیاں دے۔ سہاگ سلامت رکھے۔ اب جا اس نالائق کے لیے بھی اچھا سا ناشتا لے کر آ۔ تجھے پتا ہے نا کیا شوق سے کھاتا ہے یہ؟'' وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ جس نے جھکا سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ کچھ اور جل کر خاک ہوا تھا۔ اس کی معصومانہ ادائیں اس قدر بری لگنے لگی تھیں کہ اللہ کی پناہ۔ اگر چند پل اور اس منظر کا حصہ بنا رہتا تو جانے کیا کر گزرتا۔ وہ جلبلاتا واش روم کی جانب بڑھا تھا۔ تولیے سے منہ پونچھتا واپس آیا تو اس کی ٹرے بھی آ چکی تھی۔

''چل پتر! تو بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ کر ناشتا کر میرے سامنے۔ تیری آپا بتا رہی تھی۔ تو دھیان سے کچھ کھاتی پیتی نہیں ہے۔ ایسے تو بری بات ہے۔ کل کلاں کو تیرے ماں پیو ہم سے سوال کریں گے۔ ہم تیرا خیال نہیں رکھتے تو۔''

''کیوں وہ کیوں سوال کریں گے۔ ہم نے ان سے کوئی سوال کیا ہے کیا؟'' میاں جی کی بات ابھی پوری نہیں ہوئی تھی کہ وہ بنا سوچے سمجھے ہی بول اٹھا تھا۔ جہاں زرتاج نے اک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا وہیں وہ الجھ کر پوچھنے لگے۔

''کیا مطلب۔ کیسا سوال؟''

''کچھ نہیں۔ وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ کل مجھے واپس شہر جانا ہے۔ اور آپ کو بتایا تھا اس بار آخری ٹرم ہے میرا۔ تو کچھ ہی دنوں تک فیس جمع کروانا ہے۔'' وہ جو اسے دیکھنا ہی چھوڑ چکی تھی۔ تو اب بالکل سرد نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ اسے بات بدلنے کو بروقت بہانہ سوجھ گیا۔

''ہاں۔ ہاں یاد ہے مجھے۔ میں بھلا بھول سکتا ہوں۔ اسی لیے تو میں نے کئی دن پہلے ہی فیس کے پیسے تیری ماں کو پکڑا دیے تھے۔ جاتے ہوئے اس سے لے لینا۔''

میاں جی اور کسی معاملے میں کبھی کوتاہی برت بھی جاتے مگر اس کے تعلیمی معاملات میں کبھی بھول چوک کے مرتکب نہ ہوئے تھے۔ اب بھی جھٹ بتایا۔ کچن سے نکلتی شمسہ آپا نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا تھا۔

''اب میں کچھ بولی تو کہیں گے۔ میں سٹھیا گیا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ جبکہ حقیقت یہی ہے میاں جی کہ آپ کی یادداشت اب ٹھیک سے کام نہیں کرتی۔ آپ ہر بات بھول جاتے ہیں۔ یا صرف میرا ہی کہا بھولنے لگے ہیں۔ حد ہو گئی ہے ویسے۔ وہ جو

روپے آپ باذل کو بتا رہے ہیں، وہ تو آپ تب ہی مجھے دے چکے تھے۔ یاد نہیں کہاں خرچ ہوئے تھے وہ۔ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا کہ ان پیسوں سے میں نے زرتاج کے لیے سونے کی جھمکیاں، ایک انگوٹھی اور ناک کی۔"

"کک...... کیا مطلب ہے آپ کا؟ اتنے پیسے فالتو اڑا دیے آپ نے۔" ابھی تو ان کی بات بھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ وہ تڑپ کر اٹھا تھا۔

"ہائے۔ ہائے۔ فالتو کیوں۔ خیر سے اپنی بہو پر خرچ کیے ہیں میں نے۔ دیکھنے والے تو یہی کہتے ہوں گے نا کہ ایک اکلوتی بہو اور وہ بھی ناک کان سے خالی۔ اب دیکھنے والوں کو پتا تو چلے گا نا کہ باذل جمال کی بیوی ہے۔ تمہاری ہی عزت میں اضافہ ہوگا۔ اور ماشاء اللہ دیکھو تو تب سے کیسا سج گیا ہے اس کا روپ۔ کتنی سوہنی لگنے لگی ہے خیر سے۔" وہ اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔ اور خود کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کرتے باذل کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان کی بہو نہ سہی تو کم از کم ان چار لوگوں کو تو فائر کر ہی دے۔ جن کے باعث اسے ایسے عظیم نقصان کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ اور اگر اب اتنی رقم کا انتظام نہ ہو پایا تو...... اور اس "تو" کے آگے اسے تارے ناچتے دکھائی دینے لگے تھے۔ اندر کی صدماتی کیفیت صورت پر بھی جھلکنے لگی تھی۔ تب ہی تو میاں جی نے حوصلے کی کمک بہم پہنچانا چاہی۔

"اوہو۔ باذل پتر! تو ایک دم اتنا پریشان کیوں ہو گیا ہے۔ تیری فیس کی طرف سے پہلے بھی دیر ہوئی ہے؟ نہیں نا۔ اس باری بھی وقت پر ہی جمع ہو جائے گی۔ بلکہ تو شکر کر کہ تیری کنجوس ماں نے ساری حیاتی میں پہلی واری دل کھول کر خرچا کیا تو وہ بھی تیری بیوی پر۔ اچھا اب چھوڑ ساری باتیں۔ چل آرام سے ناشتا کر۔ دیکھ تو تیری وجہ سے وہ بھی ہاتھ روک کر بیٹھی ہے۔" ان کا اشارہ اس کی جانب تھا۔ جو لگتا تھا پتھر کا بت بن چکی ہے۔

"مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔" کہتا پلٹ کر کمرے میں گیا اور دھاڑ سے دروازہ بند۔ شمسہ آپا حیران سی ادھر دیکھ رہی تھیں۔ میاں جی بگڑ اٹھے۔

"پاگل ہو گیا ہے یہ لڑکا۔ جب میں نے کہا ہے کہ فکر کی بات نہیں ہے۔ میں آج ہی انتظام کر لیتا ہوں۔ ہو جائے گی فیس جمع۔ تو پھر یہ ڈرامہ کرنے کا کیا مقصد ہے۔ جاؤ اسے سمجھاؤ جا کر۔"

اب جانے انہوں نے یہ حکم نامہ کسے جاری کیا تھا۔ اسے یا پھر آپا کو؟ وہ ابھی اسی سوچ میں تھی کہ ان کے پیچھے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"میں ذرا چولہے پر رکھا دودھ دیکھ لوں۔ کہیں گر نہ جائے۔ تم ناشتا لے جاؤ اس کے پاس۔" وہ ٹرے اٹھا کر اندر لے آئی تھی مگر آنکھوں پر بازو رکھے صوفے پر نیم دراز باذل جمال سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ کتنا روکا تھا اس نے آپا کو۔ مگر ان کی تو ایک ہی رٹ تھی۔ اب دیکھ لیا انجام۔ انہوں نے تو اپنی سی کر کے اس کی نظر میں اور برا بنوا دیا تھا۔ ویسے وہ خواہ مخواہ فکرمند نہیں تھا۔ اگر سچ میں فیس کا انتظام نہ ہو سکا تو۔ اور اس تو کے آگے اس نے وہی کیا تھا جو وہ کر سکتی تھی۔ یعنی چپکے سے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی سے انگوٹھی نکالی اور کانوں سے جھمکے اتارے۔ ٹرے میں رکھ کر واپسی کی راہ لینا چاہی تھی کہ اک انتہائی سخت گرفت میں کلائی کے پھنستے ہی کراہ کر وہیں رک گئی۔

"میں نے آنکھوں پر بازو رکھا تھا۔ پردہ نہیں ڈالا تھا اپنی عقل پر جو مجھے کچھ خبر نہیں ہوگی۔ پہلے جو کچھ ہوا۔ میں اسے چپ چاپ سہہ گیا کہ تب میں با اختیار نہیں تھا۔ لیکن اب تمہاری اک اک جنبش پر نگاہ ہے میری۔ تم جتنی ہمدرد ہو نا، بہت اچھے سے اندازہ ہے مجھے۔ یہ حرکت کر کے کیا ثابت کرنا چاہ رہی ہو۔ یہ سب میرے منہ پر مارنے کے بجائے جا کر چولہے میں جھونک دو۔ جب سارے امتحان میرے ہی لیے ہیں تو میں کسی بھی طرح سے نبٹ لوں گا۔ تمہارا روپ سج گیا نا، اب میرا مستقبل سنورے یا بگڑے۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آئی سمجھ۔ اٹھاؤ یہ

سب اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"
اُفف۔ بے گانگی اور بے رخی کی انتہا کے ساتھ ساتھ بدگمانی کی بھی کوئی حد نہ تھی۔ اس نے لفظوں میں لپیٹ کر کوڑا ہی مار دیا تھا اس کی پیٹھ پر۔ اذیت تو ایسی تھی کہ لب چیخ اٹھتے۔ مگر کمال ضبط تھا، اس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ مگر برا ہوان آنکھوں کا جو تیزی سے بھیگ رہی تھیں۔ اس نے ہی زور سے جھٹکا تھا۔ اور کمرے سے نکل گیا۔ وہ ہلنے کی سکت بھی کھو بیٹھی۔

☆☆☆

اس کا عروسی لباس اتنا شاندار تھا کہ آج تک پورے گاؤں کی کسی اور لڑکی کو ایسا جوڑا نصیب نہ ہوا ہوگا۔ شہر کی مہنگی ترین بیوٹیشن نے اس کا روپ سنوارا تھا۔ سجنے سنورنے کا ڈھنگ تو اسے بھی خوب آتا تھا۔ مگر آج تو اس کی چھب ہی نرالی تھی۔ ایسا اجلا نکھرا، سانچے میں ڈھلا کسی موم کی گڑیا سا سراپا۔ وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی۔ کہ ہر دیکھنے والی آنکھ نے بے اختیار سراہا تھا۔ فاخرہ نے تو کئی بار نظر بھی اتاری۔ اور اس کی پہلے سے اکڑی گردن کچھ اور تن گئی تھی۔ اسے خود پر ہی پیار آرہا تھا۔ کیسا عالی شان مقدر لے کر آئی تھی وہ۔ ساری سہیلیاں اندر ہی اندر جل مر رہی ہوں گی۔ اسے پورا یقین تھا۔ وہ اس کی جدائی کا سوچ کر دکھی تھوڑا تھیں وہ تو اس کے ایسے بے مثال روپ سروپ اور اس کے اونچے بخت دیکھ کر حیران تھیں۔ اور حیران تو وہ خود بھی ہو گئی تھی۔
کیا یوں بھی ہوتا ہے کہیں؟
جتنی دھوم سے آج کا دن طلوع ہوا تھا۔ غروب کے وقت ویسا تام جھام کیوں نہیں تھا؟ وہ رخصت ہو کر اپنے گھر آچکی تھی۔ اور اب ہکا بکا در و دیوار تک رہی تھی۔
گھٹن زدہ کمرہ جس کی کھڑکی کھلی ہونے کے باوجود دم گھٹ رہا تھا۔ لگتا تھا مکین نے کئی دن بعد کمرہ کھولا ہے۔ فضا میں رچی عجیب سی سیلن کی بو تو یہی بتا رہی تھی۔ اس پر ہر چیز گرد و غبار سے اٹی۔ چھت سے لٹکتے بڑے بڑے جالے اور ان میں متحرک مکڑیاں تو لگ رہا تھا اسی کے گرد لپٹنے آرہی ہیں۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔ وہ دلہن بنی ضرور نظر آرہی تھی۔ مگر دلہنوں والا روپ بالکل بھی نہیں تھا۔ نہ چہرے پر وہ حیا کی مخصوص لالی، نہ ہونٹوں پر دھیمی سی مسکان، نہ تمتماتے رخسار نہ ہی دھڑکنیں اتھل پتھل۔ آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ سرخ ڈوروں اور خمار سے نہیں بلکہ کھارے پانی کے علاوہ ان میں رنج، ملال، غصہ اور جانے کیا کیا تیر رہا تھا۔ لانے والے اسے بڑے اہتمام سے لکڑی سے بنے پچاس سالہ قدیمی پلنگ پر بٹھا کر جا چکے سب کے نکلتے ہی وہ تو یوں اٹھی گویا کانٹے چبھے ہوں۔ اسی تیزی میں چوڑیاں، جھمکے، جھانجر سب بج اٹھے تھے۔ جنہیں نوچ نوچ کر اتارا۔ دوپٹہ بھی منوں وزنی لگ رہا تھا۔ اس کی پنیں نکال کر دور اچھال دیا۔ اس کا تنفس بے ہنگم ہو رہا تھا۔ تو اپنے ساتھ شرارت کرنے والی سکھیوں کو آسانی سے معاف نہیں کیا کرتی تھی۔ تو اسے معاف کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس نے پوری دنیا کے سامنے تماشا بنا کر رکھ دیا۔ اس نے لپک کر کھلے دروازے کی چٹخنی چڑھائی تھی۔ اس کے ارادے خطرناک تھے۔ تب ہی دروازے کو دھکیلا گیا تھا۔ پھر دوسری بار۔ اور یقیناً دروازہ اندر سے بند پا کر حیران ہوا تھا۔ کچھ دیر ہلکی دستک پر بھی جب اندر خاموشی طاری رہی تو اسے پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ اب دستک کے علاوہ بے تابی سے پکارا بھی گیا۔
"سائرہ۔ دروازہ کیوں بند کیا ہے تم نے۔ پلیز کھولو اسے۔" اور اس کے جلتے اعصاب پر ٹھنڈی سی پھوار پڑی تھی۔ دشمن کی بے بسی کیسے ساری کلفت پل میں اڑا دیتی ہے۔ اس کی تھکن بھی اتری تھی۔ انوکھا سا لطف آیا۔ نہ وہ دروازہ کھولے گی اور نہ ہی اپنا منہ۔ اب پھوڑتے رہو اپنا ماتھا۔ اک گہری سانس بھرتے وہ کھلی کھڑکی پاس جا کھڑی ہوئی۔ جو پچھلے صحن میں کھلتی تھی۔ جہاں ہنرمند ہاتھوں کی ترتیب دی گئی چھوٹی سی پھلواری مہک رہی تھی۔ پوری فضا

معطر تھی۔ جو اس کی مشام جاں بھی مہکا گئی۔ یک لخت جالی دار کھڑکی پر اک سایہ ابھرتے دیکھ کر وہ تیزی پیچھے کو ہٹی۔ اور وہ اسے اپنے پیروں پر کھڑا دیکھ کر پر سکون ہوا تھا۔

''سائرہ۔ اوہ میرے اللہ۔ تم ٹھیک ہو نا۔ خدا کی بندی! تم نے میری جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ کہیں تم جیسی پاگل نے۔''

''ہاں۔ جو خاک میرے سر میں پورے اہتمام سے ڈالی گئی، اس پر دل برداشتہ ہو کر کہیں مجھ جیسی پاگل نے خودکشی نہ کر لی ہو۔ واہ کیا سوچ ہے تمہاری۔ کیا تم نے مجھے اتنا ہی بزدل سمجھ رکھا ہے۔ ہاں۔ میں جان ضرور لوں گی وہاج کریم داد۔ لیکن اپنی نہیں تمہاری۔ آج سے تم اپنے دن گننے شروع کر دو۔''

وہ بولی نہیں پھنکاری تھی۔ ایسا غیض وغضب بھرا تھا اس کے لہجے میں کہ کوئی اور ہوتا تو سہم جاتا۔ مگر سامنے بھی وہاج کریم داد ملک تھا۔ جو اس کے انداز پر تحمل سے مسکرا دیا۔

''نہیں میں ایسا ہرگز نہیں سمجھا تھا۔ بھلا مجھ سے بہتر اور کسے اندازہ ہوگا تمہاری بہادری کا۔ مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ کہیں تم مارے خوشی کے بے ہوش ہی نہ ہو گئی ہو۔ آخر کو عین وقت پر تمہاری بدنصیبی خوش نصیبی میں جو بدل گئی ہے۔ تمہارے تو گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میرے جیسا خوبرو اور ذہین۔''

''ہونہہ۔ تمہارے جیسا۔ کسی دن تمہاری یہ خوش فہمیاں ہی تمہیں لے ڈوبیں گی۔ تم نے آج جو کیا ہے نا میرے ساتھ، میں اسے تمام عمر نہیں بھولوں گی۔ تم دیکھنا میں۔'' وہ تلملا کر اس کی بات قطع کر گئی تھی۔ وہ بھی بے قراری سے بول اٹھا۔

''تم مجھ سے خوامخواہ بدگمان ہو سائرہ جبیں۔ تم دروازہ کھولو۔ میں تسلی سے تمہیں ساری صورت حال سمجھاتا ہوں۔''

''ہرگز بھی نہیں، تم نے کیا مجھے ایسا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ تم مجھے کیا خاک سمجھاؤ گے معاملہ۔ تم نے آج جو کچھ میرے خاندان اور میرے ساتھ کیا، وہ سب با قاعدہ پلاننگ کے تحت کیا۔ تم اپنی ہوشیاری سے سارے زمانے کو بے وقوف بنا سکتے ہو مگر مجھے نہیں۔ کیونکہ میں تمہاری اوقات بہت اچھے سے جانتی ہوں۔ تم نے یہ اپنی اس دن کی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ جبکہ تمہیں تو اسی دن ڈوب کے مر جانا چاہیے تھا جس دن تمہاری بہن کے کالے کرتوت کھل۔''

''شٹ اپ۔'' وہ بولتی ہی جا رہی تھی۔ اس کے ضبط کا پیمانہ چھلک گیا۔ زور سے کھڑکی کی جالی پر ہاتھ مارا۔ وہ بے اختیار اک قدم پیچھے ہوئی تھی۔

''میں اگر تمہاری بکواس سن رہا ہوں تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں نکلتا کہ جو تمہارے منہ میں آئے بولتی جاؤ گی۔ میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔ اگر پھر کبھی ایسی بھیانک غلطی کی۔ میری بہن جو ہے وہ میں بہت اچھے سے جانتا ہوں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے کرتوت نہیں جانتی ہو۔ اگر جان گئی ہوتیں تو تمہیں ڈوب کر مرے کئی سال گزر چکے ہوتے۔ وہ بھی اگر تم میں ذرا سی غیرت ہوتی تو۔ اور ہاں میں نے تمہارے خاندان سے آج اپنا حساب برابر کیا ہے۔ کیونکہ انہوں نے ناحق میرے ساتھ ظلم اور زیادتی کی تھی۔ صرف اس لیے کہ تمہارے اس نام نہاد منگیتر کے سارے کالے کرتوت میں خوب جان چکا تھا۔ اور اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں وہ سب حقائق تم لوگوں پر بھی نہ کھل جائیں۔ اسی ڈر سے اس نے۔''

ابھی تو اس نے کتھا سنانا شروع کی تھی اور اس نے دھاڑ سے کھڑکی بند کر لی۔ وہاج کا غصہ کچھ اور بڑھا تھا۔ جالی پر پوری طاقت سے مکہ دے مارا۔

''اب کیوں چھپ رہی ہو۔ اب سامنا کرو میرا اور مجھ سے سنو، اس بے حیا کے سارے کالے کارنامے۔ بلکہ اگر کہو تو سارے ثبوت بھی

دکھادوں۔ وہ جھوٹا اور مکار تھا۔ اسی لیے اللہ کی مہربانی سے اپنے اصل ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔ تمہیں تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے۔ جس نے تمہیں اس جیسے شاطر اور عیار کے چنگل سے بروقت بچالیا۔ الٹا تم مجھ ہی پر دھونس جمارہی ہو۔ حد ہے بھئی۔ چلو اگر تم نے مجھ سے عناد پال ہی لیا ہے تو آج سے مجھے بھی اپنا پکے والا دشمن سمجھو۔ اب دیکھتے ہیں اس میدان میں جیت کس کی ہوتی ہے۔"

کھڑکی تو بند ہوئی ہی تھی، اب کمرے کی بتی بھی بجھادی گئی تھی یعنی یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اپنا منہ بھی بند کرلے۔ ایسی ہتک کا تو اسے گمان تک نہ تھا۔ اس لڑکی سے نیکی کی تھی اس سے؟ وہ بری طرح تلملا کر رہ گیا۔ اگر تو گھر میں مہمان نہ ہوتے تو ضرور اس بگڑی شہزادی کو مزہ چکھاتا۔ جس نے پہلے ہی دن اسے اس بے دردی سے کمرہ بدر کردیا تھا۔ ایک تو بے چارہ پہلے ہی کئی دن سے گھر بدری کاٹ رہا تھا۔ اللہ اللہ کرکے مشن کمپلیٹ ہوا تو اس پر شاباشی کے بجائے ایسی تواضع۔ خیر معاف تو وہ بھی نہیں کرنے والا۔ رات کہاں گزاری جائے؟ ٹھوڑی کھجاتا ادھر ادھر دیکھتے وہ درپیش مسئلے کا حل سوچ رہا تھا۔

☆☆☆☆

پھوپھی خورشید سے میاں جی کو خاص انسیت تھی۔ ان کے اچانک راہی عدم ہونے نے انہیں بڑا جذباتی دھچکا پہنچایا تھا۔ وہ تو اس دکھ سے بیمار ہی پڑ گئے تھے۔ پہلے ہی تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا تھا کہ اب ان کی خبر لینے کو بھی سارا خاندان امڈ پڑا۔ شمسہ آپا کو تو مہمانوں سے فرصت نہ تھی اور اُسے کچن سے۔ سارا سارا دن چائے اور کھانے پکاتے کردہری ہوجاتی۔ پھر برتنوں کا ڈھیر نبٹاتے حشر برا ہونے لگتا۔ کچھ موسم کے تیور بھی بدلنے لگے تھے۔ چوتھے دن تو چھینکوں پر چھینکیں مارنے لگی۔

"ابھی صبح ہی تو ملی ہو اپنی اماں سے۔ ہمارا شہزادہ بھی ادھر ہی ہے۔ پھر کیسے یاد آنے لگی ہے تمہاری۔" میاں جی کو دوا کھلا تھی ان کے لیے دودھ گرم کرنے آئی آپا نے مسکرا کر کہا۔ مگر اس کی لال بھبھوکا صورت پر نظر پڑتے ہی گھبرا گئیں۔

"لو بھئی، بدلتے موسم نے اپنا اثر دکھا ہی دیا۔ تمہیں تو لگتا ہے ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ شکل کیسی لال ٹماٹر ہو رہی ہے تمہاری۔ ماں صدقے تھک گئی ہے میری بچی۔ کام بھی تو اتنے ڈھیر سارے کیے ہیں۔ کتنے دن ہوگئے جان کھپاتے ہوئے۔ اب خبردار کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا۔ جاؤ اپنے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ باقی کے کام میں خود دیکھ لوں گی۔"

"ارے نہیں آپا! اب ایسے بھی کوئی پہاڑ نہیں توڑے میں نے کہ تھک جاؤں گی۔ ٹھیک ہوں میں۔ آپ فکر نہ کریں بس ذرا کچن کی صفائی ہی رہ گئی ہے۔ وہ نبٹا کر چلی جاتی ہوں۔" اس نے بھاری سی آواز میں کہا تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ بہت ہوگیا کام۔ گھر میں ایک بیمار بندہ ہی کافی ہے میرے لیے۔ مجھے تو میاں جی نے ہی مجھے چکرا کے رکھ دیا ہے۔ اگر تم نے بھی بستر سنبھل لیا تو کیا بنے گا میرا۔ کیا کیا دیکھوں گی میں۔ مجھ اکیلی سے تو اتنا سب کچھ اب ہوتا بھی نہیں۔ تم تو جس دن سے آئی ہو نکما ہی کردیا ہے مجھے۔ کام کا سوچ کر ہی جان نکلنے لگتی ہے میری۔" وہ بے قراری بھی اس کا ماتھا چھو رہی تھیں کبھی اس کی کلائی۔ انداز ایسا بے چارگی اور منت بھرا تھا کہ زرتاج کو ہنسی آگئی۔ بے ساختہ، کھنکتی ہوئی ہنسی، گردن پیچھے کو گرائے ہنستی چلی گئی تھی۔ ایک تو رخسار پہلے ہی قندھاری ہو رہے تھے کہ شفاف کھلکھلاہٹ نے ان پر خاص جگمگاہٹ سی اتاردی۔ آپا نے تو خوش گوار حیرت میں گھر کر دیکھا ہی تھا۔ دروازے میں کھڑا بازل بھی ارد گرد بھلائے مبہوت سا دیکھے گیا۔ آج کتنے دن بعد اسے ہنستے دیکھ رہا تھا۔ اسی بے فکری اور اسی معصومیت سے جو کبھی اس کی شخصیت کا خاصا ہوا کرتی تھی۔ اب تو زمانہ بیتا وہ تو جیسے

مسکرانے تک سے تائب ہو چکی تھی۔ چہرے کے گرد ہمہ وقت گہری سنجیدگی سایہ کیے رہتی۔ اور آنکھوں کی جوت تو جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔

کیا یہ انداز کسی دھوکے باز کے ہو سکتے ہیں؟ اس کے اندر سے کوئی سوال کناں ہوا تھا۔ اور قبل اس کے کہ جواب تلاش کرتا کہ آپا کی نگاہ پڑی تھی۔

"کچھ چاہیے تھا کیا؟" ان کی اکھڑی سی آواز جہاں اسے حواس کی دنیا میں واپس کھینچ لائی تھی۔ وہیں زرتاج کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہوئی۔ جگمگاتے عارض یک لخت ہی ماند پڑے تھے۔ لمحوں میں اس کی بدلتی رنگت کو آپا نے بھی بڑے دھیان سے دیکھا تھا اور ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ ان کے اجنبی لہجے پر وہ گڑبڑا کر کہہ گیا۔

"ج۔ جی...... ہاں ایک کپ چائے بنا دیں گی پلیز۔"

"مجھے تو تمہارے میاں جی کو دوا کھلانا ہے۔ ان کے لیے دودھ گرم کرنے آئی تھی۔ ہاں تم اپنی بیگم سے کہو۔ وہ بنا دے گی چائے۔" انہوں نے تو صاف کورا جواب تھما دیا تھا۔ وہ بھی جب سے آیا تھا ان کے بدلے انداز نوٹ کر رہا تھا۔ ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ اسپیشل بنا کر اس کے پیچھے پیچھے پھرنے والی آپا نے اس بار بے مروتی کی حد کر دی تھی۔ انہیں تو یکسر پرواہ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ خاموشی سے واپس جانے کے لیے مڑا تو انہیں یاد آیا تھا۔

"اور ہاں سنو۔ تمہارے پاس سر درد یا بخار کی کوئی دوا ہے تو زرتاج کو دے دو۔ بلکہ دیکھو کہیں اسے بخار تو نہیں۔ ایک تو یہ لڑکی اپنے کھانے پینے کا بالکل خیال نہیں رکھتی۔ اس پر آج کل گھر میں کام بھی اتنا ہے۔ یہ نہ ہو زیادہ بیمار پڑ جائے۔"

"جی اچھا۔" اس نے بغیر مڑے رک کر بات سن لی تھی۔ اور دھیمے سے دو لفظ بھی کہہ ڈالے۔ مگر وہ ٹھہرا نہیں تھا۔ جہاں آپا کا دکھ سوا ہوا۔ وہیں اس کے بت میں جان پڑی تھی۔ سر جھٹک کر سنک میں ڈھیر برتنوں میں ہاتھ مار کر کیتلی نکالی۔

"میں نے آپ سے کہا بھی ہے۔ کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر کیا ضرورت تھی بات کہہ کر گنوانے کی۔" وہ اس سے کوئی امید لگا کر نہیں بیٹھی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا رویہ روح میں تلخی اتار گیا تھا۔ شمسہ آپا متانت سے مسکرا دیں۔

"تمہاری تکلیف کا اسے نہیں بتاؤں گی تو کس سے کہوں گی جا کر۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے شوہر ہے تمہارا۔ اگر وہ تمہارا نہیں بنتا تو تم اس کی بن جاؤ۔ کامیاب عورت وہی ہوتی ہے جو گھر ہی نہیں بناتی بلکہ اسے بسا کر بھی دکھاتی ہے۔ مسکراہٹ کے رنگوں سے خالی گھر بے رونق اور بے برکت ہوتے ہیں۔ عورت تو یوں بھی ازل سے قربانیاں دیتی آئی ہے۔ کبھی اپنی خودداری کی بھی اپنے جذبات کی۔ تو کبھی اپنی انا کی۔ وہ بے اعتباری کی آگ میں جھلسا ہوا ہے۔ اسے اس جلن سے نکالو۔ مت ظلم کرو اس پر بھی اور خود پر بھی۔ تمہیں اپنی 'میں' کو گروی رکھ کر اس کی 'تو' کو اپنانا ہوگا۔ اور یہ آج سے نہیں بلکہ ابھی سے کرو۔ دو کپ بہترین سی چائے بناؤ۔ ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی رکھ لو۔ مجھے پتا ہے میاں جی کی پریشانی میں اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اور مارے غصے کے میں نے بھی نہیں پوچھا اسے۔ اور چلو اسی بہانے تم بھی کچھ کھا لو گی۔ بس خیال رکھو اس کا بھی اور اپنا بھی۔"

وہ نرم لہجے میں اسے نصیحتیں کرتی شانہ تھپتھپا کر جا چکی تھیں۔ پانی ابل رہا تھا۔ اس نے جلدی سے پتی ڈالی۔ اور جب وہ ٹرے سمیت کمرے میں آئی تھی تو وہ بیڈ پر نیم دراز کتاب کا مطالعہ کرنے میں منہمک تھا۔ اس کے ایگزامز شروع ہونے میں چند ایک دن ہی تو رہ گئے تھے۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھتے حلق تر کیا تھا۔ اور گلا کھنکھار کر لب کشا کیے۔

"وہ۔ آپا کہہ رہی تھیں، آپ نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ پہلے کھانا کھا لیں پھر۔" اس نے نظر اٹھائی تھی۔ اور آدھا فقرہ اس کے حلق میں پھنسا

رہ گیا۔ آپا کے لیکچر کا ہی اثر تھا جو وہ اتنا بھی بول گئی تھی۔ بے شک وہ اسے مکار ہی سمجھتا رہے۔ اس سے نہیں بھگتی جائیں گی پیشیاں۔ اور ایسی سرد نظریں۔ اسے کچھ اور نہ سوجھا تو الماری کھول کر اسی میں منہ دے لیا۔ شدید تھکن اور نیند آنے کے باوجود وہ اس کے جاگتے بستر پر جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہائے کاش۔ آج گھر میں مہمان نہ ہوتے تو وہ کہیں بھی جا کر پڑ جاتی۔ نیند بھی قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہے جو وقتی طور پر ہر غم بھلا دیتی ہے۔ اس کا جی چاہا، کھڑے کھڑے آنکھیں موند کر ہر فکر سے آزاد ہو جائے۔ اور شاید وہ حواس کھو بھی دیتی۔ جو چھینک کسی الارم کی طرح نہ بج اٹھتی۔ اس کی خوابیدہ کیفیت تو اڑن چھو ہوئی ہی تھی۔ اس نے بھی اک بار پھر سے نگاہ اٹھا کر دیکھا تھا۔

''اگر تو تمہیں کھڑے کھڑے نیند لینے کا تجربہ ہے پھر تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر آج پہلی بار یہ کارنامہ انجام دو گی تو مجھ پر ترس کھاؤ۔ آپا میری جان کو آجائیں گی۔ ویسے بھی آج کل انہیں دنیا میں تم سے زیادہ پیارا کوئی بھی نہیں لگتا۔ کیوں ڈرامہ کرتی ہو ان کے سامنے۔ ان کی ہمدردیاں سمیٹ تو رکھی ہیں پہلے ہی۔ اب اور کیا چاہتی ہو؟'' اس پر لگے الزام پہلے ہی کم نہ تھے کہ اب فہرست میں اک اور کا اضافہ شدید رنج سے دوچار کر گیا۔ ڈرامہ؟ کیا وہ ڈرامہ کر رہی ہے۔ چند ثانیے تو کھلے منہ سے اسے دیکھے گئی۔ کتنا اچھا ہوتا وہ اس سے ہم کلام نہ ہی ہوتی۔ تو یہ سب سننے کو تو نا ملتا۔ اسے خود پر ہی افسوس ہوا تھا۔ آپا کی ساری نصیحتیں بھی بھک کر کے اڑ گئیں۔ اب اس کمرے میں مزید رکنا حماقت ہی ہوگا۔ ٹھا سے الماری کا پٹ بند کر کے اس نے قدم باہر کی جانب موڑے تھے۔ ادھر اس نے بھی کتاب بند کی۔

''اس سے پہلے کہ آپا تمہاری مزاج پرسی کو آ جائیں۔ اور جاتے جاتے میری بھی کر جائیں۔ یہاں آ کر اس دراز میں سے تھرمامیٹر نکالو۔ تمہارا ٹمپریچر چیک کرنا ضروری ہے۔ تاکہ اس کے بعد میڈیسن دی جا سکے۔''

''شکریہ۔ اس کی ضرورت نہیں۔ بالکل ٹھیک ہوں ں ں...... میں......'' اس کے بڑھتے قدم زنجیر ہوئے تھے۔ فوری جواب دیتے پھر چھینک آنے کو تھی جسے ناک دبا کر بمشکل روکا۔ اس کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے تھے۔

''میں بھی وہ ڈاکٹر نہیں جس نے کبھی خدمت خلق کا اعلان کیا ہو۔ یہ تو آپا نے کہا ہے تو اسی لیے یہ مہربانی کر رہا ہوں تم پر۔ اسی کو غنیمت جانو اور جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ اور یاد رکھو مجھے ایک بات کو دوبارہ کہنے کی نہ عادت ہے اور نہ...... ضرورت۔'' کچھ توقف کے بعد جو لفظ اس کے ہونٹوں سے نکلا تھا۔ اس نے زرتاج بانو پر ایک بار پھر اس کی اوقات بہت اچھے سے واضح کر دی تھی۔ وہ کرب سے لب دبا گئی۔

''میں نے جو کہا وہ تم نے سنا نہیں۔ یا ایک بار پھر بہت اچھے سے سننا چاہتی ہو؟'' اس کی اکتائی آواز سماعت میں اتری۔ اس نے پلٹنے میں ہی عافیت جانی تھی۔ جتنا اجنبی وہ ہو رہا تھا۔ اس سے کیا بعید جا کر آپا سے ہی شکایت جڑ دے۔ وہ بے چاری پہلے ہی پریشان ہیں۔ جب اوکھلی میں سر آ ہی چکا ہے تو اب موسلوں سے کیا ڈر۔ اس نے کانپتے ہاتھ سے دراز کھولی تھی۔ باذل کی نگاہ اس کے ہاتھ پر ہی تھی۔ شفاف ناخن والی مخروطی انگلیوں میں سے تیسری انگلی میں اک سرخ نگ جڑی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اور جو اس کے موم سے سفید ہاتھ کو مزید دلفریب بنائے دے رہی تھی۔ یہ اس کے نام کی پہلی انگوٹھی تھی۔ لیکن جو اس نے اپنے ہاتھ سے اسے نہیں پہنائی تھی۔ اس نے تھرمامیٹر اس کی جانب بڑھایا تھا۔ اسے جانے کیا سوجھی، کلائی ہی تھام لی۔ زرتاج کی دھڑکنیں بے ربط ہوئی تھیں۔ سانس گم۔ وہ پوری توجہ سے اس کی نبض کی رفتار ماپ رہا تھا۔ پھر دراز سے دوا نکالی اور چائے کا کپ اس کی جانب بڑھا دیا۔

''گرما گرم چائے کے ساتھ دو گولیاں لے لو۔

جلد افاقہ ہوگا۔" اس نے پیشہ ورانہ انداز سے ہدایت دی تھی۔ وہ بھاپ اڑاتے کپ کو دیکھتے جلدی میں کہہ گئی۔

"مگر یہ چائے تو میں آپ کے لیے۔" اور فقرہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اس نے بازو سے کھینچ کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ اس جارحیت پر اس کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوئے تھے۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے ایک بات کو بار بار کہنے کی عادت نہیں ہے۔ تم نے اگر اس کمرے میں رہنا ہے تو یہ عادت ڈالنا ہوگی کہ ایک ہی بار میں میرے کہے کو سننا بھی ہے اور سمجھنا بھی۔ انڈر اسٹینڈ۔ اب پکڑو یہ۔ اور ایک منٹ کے اندر ختم کرو۔"

اُفف۔ اللہ ایسے ظالم اور بے حس طبیب سے کسی کا واسطہ نہ ڈالے۔ اس نے اپنے سلوک سے ثابت کیا تھا کہ وہ ڈنگر ڈاکٹر ہی ہے۔ جیسے کسی جانور کے منہ میں زبردستی دوا ٹھونسی جاتی ہے۔ بالکل ویسے ہی اسے بھی دوا کھلا کر، گرم کپ اس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا۔ (شکر ہے وہ بھی منہ سے نہیں لگا دیا) ایسی بے رحمی پر اس سے تو گھونٹ بھرنا بھی محال ہو گیا۔ حلق میں تو نمکین گولہ اٹکا ہوا تھا۔ جس میں اب دوا کی کڑواہٹ بھی گھل مل گئی تھی۔ نگلنا مشکل تھا تو اگلنا بھی ناممکن۔ وہ کسی شاطر شکاری کی طرح نظر ٹکائے بیٹھا تھا۔ ذرا جو چوک ہوئی تو سیدھا فائر۔ اس کے تیور تو یہی بتا رہے تھے۔ وہ اندر سے تو پہلے ہی مر چکی تھی۔ اب باقی کی کسر بھی پوری ہو جائے اسے فرق نہیں پڑتا تھا۔

مگر ایک تو یہ آنکھیں۔ جو ایسی دغاباز ہوتی ہیں عورت کو کبھی اپنا بھرم برقرار رکھنے ہی نہیں دیتیں۔ پل سے بھی پہلے دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتی ہیں۔ کیا جاتا ان کا جو اس پل پتھر کی ہو جاتیں۔ لمحوں میں رخسار تربتر ہوئے تھے۔ اور وہ جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس منظر پر پلک جھپکنا ہی بھول گیا۔ اسے فرق کرنا مشکل ہو گیا کہ اس کی ناک کی لونگ کا موتی زیادہ چمکدار ہے یا اس کے ریشمی عارض پر پھسلتے قطرے۔ جو قطار در قطار بہتے ہی چلے آ رہے تھے۔

آج اس کے اس قدر قریب یہ وہ چہرہ تھا جو اس کے دل میں بستا تھا۔ ان پنکھڑی سے لبوں کو وہ ہمیشہ سے ہنستا دیکھنے کا خواہاں تھا۔ اور ان آنکھوں میں تو وہ ذرا سی نمی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کیسا ستم تھا۔ جب پورے حق سے دیکھنے کا وقت آیا تب سے ان کو صحرا سا ویران دیکھ رہا تھا۔ اور آج برکھا برسی تو ایسی کہ جل تھل کر گئی۔

وہ اس پل سارا غصہ، ساری خفگی بھول گیا۔ بے اختیار ہاتھ بڑھا کر ان موتیوں کو اپنی ہتھیلی پر چن لیا۔ ہچکیاں لیتی زرتاج بے چاری اس التفات پر ڈر ہی گئی۔ بدک کر پرے ہوئی تھی۔ مارے گھبراہٹ کے جھٹ سے کپ لبوں سے لگا کر ٹھنڈی پڑتی چائے اندر انڈیلی۔ دوپٹے سے گالوں پر ٹھہری نمی صاف کرتے اٹھنا چاہا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اس کی کلائی ایک پر حدت ہاتھ میں تھی۔ جس نے عجب وارفتگی سے اسے اپنی جانب کھینچ لیا تھا۔

☆☆☆

وہ جوتی لے کر اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ لپک جھپک شہتوت کے درخت پر جا چڑھا تھا۔

"بدذات، کمینہ، آوارہ سارے زمانے کا۔ کیا سمجھتا ہے آج بچ جائے گا میرے ہاتھوں۔ میں نے تیرا خون پی جانا ہے کم بخت۔ میں کہتی ہوں اتر نیچے۔"

وہ پوری قوت سے چلائی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہنستے زبان چڑا دی۔ سر پر دوپٹہ لپیٹے تائی فاخرہ صحن میں چارپائی ڈالے پڑی تھیں۔ اس شور پر اکتا کر دیکھا۔

"کچھ میری حالت کا ہی خیال کر لے۔ بس کر دے۔ اب چھوڑ دے اس وچارے کی جان۔"

"وچارا؟ یہ وچارا ہے اماں۔ یہ بن مانس کے منہ والا تمہیں وچارا لگتا ہے۔ یہ غدار ہے۔ چور ہے۔ اسی نے سجاد بھائی اور احسان کے فون چوری کر کے

اس تک پہنچائے تھے۔ پھر جس سے اس نے ان کے خلاف جھوٹے ثبوت بنا کر پولیس کو دے دیے۔ اس نے جو میرے ساتھ کیا ہے نا، وہ میں ساری حیاتی معاف نہیں کروں گی۔"

"جھوٹے ثبوت نہیں تھے میری بہن! وہ سب سچ تھا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ فون گم ہونے کے بعد کیا حالت ہوگئی تھی ماما احسان کی۔ اور پھر کیسے فوری شادی کے لیے اماں اور سجاد بھائی کو اپنی کچھے دار باتوں سے گھیرا تھا اس نے۔ میں تو تب بھی سب کو سمجھا تا رہا تھا۔ مگر میری کسی نے ایک نہ سنی۔ اگر اس وقت کوئی میری بات سمجھ گیا ہوتا تو۔"

"چپ کر جا۔ آیا وڈا سیانا۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ اب یقین ہو گیا ہے تجھے سارے سبق کون پڑھاتا تھا۔ وہ کم بخت تو پیچھے پڑا رہتا تھا میرے۔ بڑی دفعہ بستی کروا چکا تھا مجھ سے۔ بس موقع لگ گیا اسے۔ اور تو۔ تو نے دی اسے شہ۔ ساتھ مل گیا اس دشمن کے۔ ہماری عزت کے ساتھ میری زندگی کا بھی ستیاناس کروایا۔ اللہ پوچھے گا تجھے۔" وہ پٹتی عورتوں کی طرح منہ بھر بھر کے بددعائیں دے رہی تھی۔ ماں کے کلیجے پر ہاتھ پڑا تھا۔ فوراً ٹوکا۔

"اس نے کچھ نہیں کیا سائرہ۔ میری شہزادی! تو اب سمجھ لے اس بات کو۔ تیرے ساتھ جو بھی ہوا وہ سب تیرا مقدر تھا۔"

گزشتہ دنوں میں پیش آنے والے حالات نے تائی فاخرہ کے بھی کس بل نکال دیے تھے۔ ■ جو ہمیشہ سے اپنی اولاد کی پشت پناہی کرتی رہی تھیں۔ سجاد کی جو تربیت ہوئی اور جیسا مزاج سائرہ کا بن گیا تھا۔ اب اس میں بھی انہیں اپنی خطائیں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے زرتاج کے ساتھ کیا تھا وہ سمجھ دار ہوتیں تو تب ہی نصیحت پکڑ لیتیں۔ مگر انہیں تو تب بھی وہ دونوں ہی سچے اور اچھے نظر آ رہے تھے۔ بلکہ اس سارے ڈرامے کی تشہیر کا فریضہ بھی انہوں نے کیا خوب نبھایا تھا۔ ہر آنے جانے والی کے سامنے بارہ مسالے ڈال ڈال کر قصہ گوئی کرتی رہیں۔

اور وہ تو بڑائی کا ثبوت دینے کو ان دونوں کمینوں کی باتوں میں آ کر اس کا رشتہ بھی لینے چلی گئی تھیں۔ لیکن وہاں جا کر انہیں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ مطمئن نظر آتی زینت خاتون نے ان سے کوئی بھی باز پرس کیے بنا مٹھائی کی پلیٹ ان کے سامنے لا دھری تھی۔ اس اطلاع کے ساتھ کہ زرتاج کا نکاح طے ہو گیا ہے۔

کوئی اور گھرانہ ہوتا تو ان کے ساتھ وہ سلوک کرتا کہ وہ بھی یاد رکھتیں۔ مگر یہ تو زینت کا ظرف تھا۔ کہ انہیں کچھ بھی جتایا نہیں۔ اور ان کے سر سے تو کوئی بوجھ اترا تھا۔ ہاتھ جھاڑ گھر کی راہ لی تھی۔ اور پھر اک وہ وقت آیا جب وہی خاندان ان کے لیے نجات دہندہ بن گیا۔ کیسی الجھن آ پڑی تھی ان کے سر پر۔ ان کی سات پشتوں میں کسی کے ساتھ وہ نہ ہوا تھا جو ان پر بیتی۔ اگر تب کریم داد ملک جس کے پورے خاندان سے وہ بے نام سی دشمنی لیے بیٹھی تھیں۔ وہی ان کی مدد کو نہ آتا تو۔۔ اُفف۔ وہ دن سوچتے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ ان کا فخر بن کر ان کا غرور۔ سب مٹی بنا ان کے ہی منہ پر آ پڑا تھا۔ کیا کیا نا سپنے بن ڈالے تھے انہوں نے۔ اک ٹھنڈی آہ بھرتے انہوں نے اپنی نازک طرح دار سی بیٹی کو دیکھا۔ جس کے لیے یقیناً ان حالات کو ایک دم سے قبولنا مشکل تھا۔ مگر اب قبولنا تو تھا نا۔ اور یہی وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھیں۔ مگر وہ بھی اپنے نام کی ایک ہی تھی چمک کر بولی۔

"مقدر ہونہہ۔ میں نہیں مانتی ایسے مقدر کو۔ اس شخص کی شکل سے بھی نفرت ہے مجھے۔ جس کے ساتھ اٹھا کر اس دن بھیج دیا تھا مرے باپ کا واسطہ دے کر۔" اس کا لہجہ زہر زہر تھا۔ وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھیں۔ گھور کر دیکھا اور چیخ کر گویا ہوئیں۔

"نا تو اور کس کے ساتھ بھیجتی تجھے۔ جس لڑکی کی بارات دروازے تک آ کر واپس لوٹ جائے اور وہ بھی ایسی بری ذلت کے ساتھ۔ ■ پھر ساری عمر

کے لیے اپنے خاندان کی جان کا روگ ہی بن جاتی ہے۔ کوئی عزت دار آدمی اس کا ڈولا لینے نہیں آتا۔ پھر ویسے ہی لوگ آتے ہیں۔ جو اس دن بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آٹھ بچوں کا پیو ریاض۔ جو اونتر جانا پہلے ہی دو بیویاں ڈکار کے بیٹھا ہے۔ یا پھر وہ مردوا کرامت۔ جس کی زنانی اس کے منہ پر تھوک کر چلی گئی۔ ہماری ہی کرنیوں کے باعث۔ نہ اس دن وہ کم بختی مارا احسان وہ تماشا لگاتا نہ ہمیں یہ سب دیکھنا پڑتا۔ کسی کی آئی آئے اس ٹٹ پینے کو۔ پولیس والے گولی ماردیں اسے۔ خاک پڑے اس ویلے پر جب وہ بدبخت میرے گھر آیا تھا۔ ہائے۔ کیسا جھوٹا اور مکار نکلا۔ کیا کیا نہ کہانیاں سناتا رہا مجھے۔ اور میں بھی کیسی عقل کی کوری نکلی اس کی ساری بکواس پر آنکھیں بند کر کے یقین کرتی گئی۔ میری تو ایسی مت ماری گئی تھی کہ کبھی سوچا ہی نہیں کہ وہ اتنا بڑا کاروبار چھوڑ کے اس نکے سے پنڈ میں کیوں آرام کر رہا ہے۔ مجھے کیا خبر تھی وہ منشیات اور قتل کے مقدمے سے بھاگا ہوا مفرور مجرم ہے۔ روز نت نوے کھانے بنا بنا کے ٹھنساتی رہی اس بدبیتے کو۔ چنگے بھلے پیسوں کو آگ لگائی ان دنوں میں۔ ہماری محنت کی کمائی کیسے میسنا بن کے ڈکارتا رہا وہ کمینہ۔ یہ تو اللہ کا کرم تھا جو میں نے ابھی تک تیرے جہیز کے لیے رقم نہیں دی تھی اسے۔ ورنہ تو وہ بھی ڈکار جاتا۔ میری تو حسرت ہی رہ گئی اس لعنتی کی ہڈیاں اپنے ہاتھوں توڑنے کی۔ وہ تو شکر کرتی ہوں جو پولیس وقت پر پہنچ گئی۔ اللہ بھلا کرے وہاج کا جس نے پچھلی ساری زیادتیاں بھلا کر بھی ہمارا بھلا سوچا۔ اگر وہ ہمت نہ کرتا تو سوچو کیسے پول کھلتے اس خبیث کے۔ وہ تو ہمارے سر میں کھے ڈال کے چلا جاتا نا۔"

"تو اب بڑا سر پہ تاج سج گیا ہے۔ مانو یا نا مانو میری بات۔ پر سچ یہی ہے کہ یہ سب اس نے ہم سے بدلے لینے کے لیے ہی کیا ہے۔ مجھے برباد کرنے کے لیے۔ اس نے اپنے منہ سے مانی ہے یہ بات۔ اس کے پیچھے ساری کارستانی اس ڈیڑھ ہوشیار کی ہے۔ جو انعام کے طور پر مجھے ہتھیا کے لے گیا۔" اس کے ملال کا کوئی انت نا تھا۔ ایسی افسردگی پر چن چن کر شہتوت کھاتے ارباز کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"سچ ہی کہتے ہیں نیکی کر گناہ لازم۔ وہاج بھائی جیسا کم عقل میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا۔ جسے تم ڈیڑھ ہوشیار کہہ رہی ہو نا آپا! اس شخص نے ہماری جان اس احسان نامی وبال سے بچا کر اپنی جان شکنجے میں پھنسا لی ہے۔ ویسے اماں! اچھا ہوتا اس دن آپ اپنی شہزادی سے مشورہ ہی کر لیتیں۔ ہو سکتا ہے یہ چاچا کرامت یا چاچا ریاض میں سے کسی کے ساتھ شادی کر کے خوش رہتیں۔ جن کے گھروں میں صبح سے لے کر شام تک کولہو کا بیل بنی۔"

"بکواس بند کر لے اپنی۔ میں نے منہ توڑ دینا ہے تیرا۔"

وہ تلملاتی اٹھی تھی۔ کھینچ کر جوتی ماری جو درخت کے تنے سے ٹکرائی وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ارباز کو ایک بار پھر دل کھول کر ہنسنے کا موقع ہاتھ لگا تھا۔ وہ تپ اٹھی۔

"تم نے بھائی ہو کر جو دشمنی مول لی ہے نا میرے ساتھ، وہ میں تمہاری سات نسلوں کو معاف کرنے والی نہیں ہوں۔" اسے تو رہ رہ کے غصہ آ رہا تھا۔ بس نہیں چل رہا تھا کچا چبا جائے۔ تائی فاخرہ نے ایک تاسف بھری نظر اس پر ڈالی۔

"کیوں بار بار بے وقوفوں کی طرح ایک ہی بات دہرائے جا رہی ہے۔ کسی نے تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں کی۔ تجھے تو شکر ادا کرنا چاہیے اللہ کا جس نے تجھے مصیبت میں پھنسنے سے بال بال بچا لیا۔ اگر تیری اس سے شادی ہو جاتی اور یہ بھید اس کے بعد کھلتے تو۔ اللہ معافی میری تو اس تصور سے ہی جان نکلنے لگتی ہے۔ میں تو لاکھ لاکھ شکر کرتی ہوں اپنے رب کا۔ جس نے سارے پردے کھولے۔ اور اس کے بعد وہاج کی مہربانی مانو جس نے عزت کی چادر تمہارے سر پر ڈال دی۔ تم کچھ بھی کہو۔ پر میرا دل مطمئن ہے۔ جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ وہ ویسا بالکل بھی

نہیں۔ اللہ نے چاہا تو اپنے گھر میں خوش رہو گی۔ بس بار بار پچھلی باتیں دہرانے کی بے وقوفی نہ کرنا۔ دفع کردو، سب باتیں بھول جاؤ۔"

"پتا نہیں اماں کس دل سے یہ مشورے دے رہی ہو مجھے۔ کیا بھول گئی ہو۔ جس کی مہربانی مانے بیٹھی ہو اسی کی وجہ سے تمہارا بیٹا اس وقت جیل میں پڑ رہا ہے۔" اس نے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بالکل غلط۔ وہ ان کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی عظیم غفلت کے باعث جیل کی ہوا کھا رہے ہیں۔ منشیات فروش اور کسی مفرور مجرم کو اتنے دن اپنے گھر میں پناہ دینے پر پولیس ان سے پوچھ گچھ کا قانونی حق رکھتی ہے۔ جب ان کی تسلی ہو جائے گی۔ تو چھوڑ دیں گے۔ ویسے مجھے یقین ہے، وہاج بھائی آرام سے تو ہرگز نہیں بیٹھے ہوں گے۔ وہ ان کی واپسی کے لیے بھی کوشش کر رہے ہوں گے۔ آپ اطمینان رکھیں اماں۔ جلدی گھر آجائے گا آپ کا بیٹا۔"

اربازان سے کہہ رہا تھا جو اک ٹھنڈی سانس لے کر پھر سے منہ پر دوپٹہ تان کر لیٹ گئی تھیں۔ بے شک انہوں نے پردہ کر لیا تھا مگر کان تو کھلے تھے نا۔ سائرہ جبیں تلملاتی اٹھ گئی تھی۔

"تم ساروں کو تو اطمینان نصیب ہو جائے گا۔ میں کہاں سے لاؤں۔ میری تو زندگی برباد ہو گئی ہے۔ بتا رہی ہوں۔ میرا نہیں گزارا ہونا اس فقطے کے ساتھ۔ میں نے کوئی نہیں جانا اس کے گھر۔"

"ہائیں۔ ہائیں۔ دماغ چل گیا ہے تیرا۔ پہلے بے عزت ہوئی ہوں میں پورے علاقے میں۔ اب باقی کی کسر بھی پوری کرنا ہے تم نے؟" سائرہ نے دوپٹہ کھینچ کر پرے کیا تھا۔ مگر ان کے سوال کے جواب کون دیتا۔ وہ تو تن فن کرتی کمرے کی جانب چل دی تھی۔

☆☆☆

ارباز کا رشتہ طے پا گیا تھا۔ اسی خوشی کی مبارک دینے زبردستی آپا نے اسے بھیجا تھا۔ وہ خود سے تو کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔ برابر ہی تو میکہ تھا۔ وہاں گئے بھی کئی کئی دن گزر جاتے۔ نا وہ کوئی فرمائش کرتی تھی نا کوئی مطالبہ۔ ایسی سیدھی سادی بہو تو لوگ دعائیں کر کر کے مانگتے ہیں۔ ایک شمسہ تھیں۔ انہیں اسے دیکھ دیکھ غصہ چڑھتا تھا۔ وہ عام لڑکیوں جیسا رویہ کیوں نہیں رکھتی۔ وہ پہلے بھی کوئی ایسا خاص نہیں بولتی تھی۔ مگر اس بار جب سے بازل ہو کے گیا تھا، وہ اور گونگی ہو گئی تھی۔

بیٹھے بیٹھے گم ہو جاتی۔ آنکھیں بھیگی رہنا تو معمول کی بات تھی۔ اکثر انہیں لگتا وہ روئی ہے۔ جب پوچھتیں تو صاف مکر جاتی۔ وہ تو اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئی تھیں۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اب یہی طریقہ نکالا تھا کہ کہیں بھی خوشی غمی پہ جانا ہوتا، وہ خود کوئی بہانہ کر کے پڑی رہتیں اور اسے آگے کر دیتیں۔ کسی طرح بھی سہی، اس یاسیت سے باہر نکلے۔

"ہائے اللہ۔ تمہاری بھی شادی کے دن آگئے۔ اب عید شبرات پر میں مہندی کس سے لگوایا کروں گی۔ سچی میں نے تو جب سے سنا تب سے ہی اس فکر میں پڑی ہوں۔ تمہیں پتا ہے نا مجھے تمہارے ہاتھ کے علاوہ کسی کی مہندی پسند نہیں آتی۔" یہ ہوتی ہیں سہیلیاں۔ مریم کو اس کی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اسے تو اپنا ہی وختہ پڑ گیا تھا۔ لبنیٰ ٹھوڑی تلے مٹھی رکھے اسے دیکھ رہی تھی۔ زرتاج بس مسکرا کر رہ گئی۔ ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتی زاہدہ نے ہی اسے مشورہ دیا تھا۔

"یہ کون سا ابھی بھاگی جا رہی ہے۔ ابھی تو وہ شگن ڈال کے گئے ہیں۔ شادی تو کوئی چھ مہینے سال بعد ہی ہو گی۔ اتنے وقت میں تم خود اس سے مہندی لگانا سیکھ لو۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔ سیکھنے سے کیا نہیں آجاتا۔ اب دیکھ لو میک اپ کرنا بھی تو میں نے اپنی کوشش سے ہی سیکھا نا۔ نہیں تو وہ سائرہ اول درجے کی چالاک۔ جسے دو برش پھیرنا کیا آگئے، وہ تو

نخریاں پٹی ہی بن گئی تھی۔ کئی بار کہا، مجھے بھی میک اپ کرنا سکھا دو پرنا جی۔ جب بھی میں اس کے پاس گئی وہ جان بوجھ کے کسی نا کسی کام میں مصروف ہو جاتی۔ اتنے پھیرے میں کسی دربار کے مارتی تو اب تک میرا بھی ویاہ ہو جانا تھا۔ پر اس نے اک واری بھی پلا نہیں پکڑایا تھا۔ پھر کیا مجھے بھی جنون چڑھ گیا۔ اور پھر خود ہی۔'' اب وہ اپنے دکھڑے شروع کر چکی تھی۔ لبنیٰ نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

''اففف۔۔ میری ماں بس کر دو۔ اور سائرہ کی برائیاں اب ذرا دھیان سے کرو۔ اس کی نند ہمارے درمیان ہی بیٹھی ہے۔'' اس نے مسکراہٹ دباتے کن اکھیوں سے زرتاج کو دیکھا تھا۔

''ہاں تو کیا وہ نہیں جانتی اپنی بھابی کو۔ اسے کچھ بھولا تو نہیں ہوگا جو اس کے ساتھ اس خاندان نے کیا اور پھر بھی حوصلہ دیکھو واج بھائی کا۔ اسی گھر کی لڑکی کو بچا لیا۔ اچھا ہوتا جانے دیتے اسے کراچی۔ ذرا اسے بھی تو مزا آتا۔ وہاں بڑے محل اور اونچی گاڑیاں دیکھ کر آتی۔ پر وہ بھی تو اس کے عشق میں جانے کب سے۔۔۔''

''اففف۔ ایک تو تم بھی نا بولتی بہت ہو۔ میں ابھی مہندی لے کر آئی۔ اور تمہیں آج سکھا کر ہی بھیجوں گی۔ لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم اپنا یہ منہ بند رکھو گی۔''

لبنیٰ اکتا کر اٹھ گئی۔ زرتاج کے چہرے کا رنگ سفید پڑ گیا تھا۔

آپا تو اسے زبردستی کہیں نہ کہیں دھکیل دیتی تھیں۔ لیکن یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا کہ ہر بار وہ اک نیا زخم لے کر گھر جاتی تھی۔ اس کے لبوں پر وہ جو ذرا سی مسکان چھب دکھلا رہی تھی وہ بھی اڑ گئی۔ وہ اتنی بے دھیان بیٹھی تھی کہ لبنیٰ نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے پتا بھی نہ چلا۔

''شمسہ آپا خود تو ہمیشہ مہندی سے ہاتھ رنگ کے رہتی ہیں۔ کمال ہے وہ تمہیں کچھ نہیں کہتیں۔ تمہاری ہتھیلیاں آج بھی کوری ہیں۔ اور صورت بھی سادہ۔ لڑکی آخر کب بدلو گی خود کو۔ باذل بھائی کی ساری زندگی شہر میں گزری ہے۔ ان کے ساتھ تو لڑکیاں بھی پڑھتی رہی ہوں گی۔ وہاں کتنی پیاری پیاری لڑکیوں کو دیکھ کر آتے ہوں گے وہ۔ اور ادھر ان کی بیوی اس قدر سادگی پسند۔ تم یہی حلیہ بنا کر رکھو گی تو کیا بنے گا تمہارا۔'' لبنیٰ نے تو لتے ہی لے ڈالے۔ پھر مریم کیوں پیچھے رہتی۔ وہ تو پہلے ہی اپنا ہنر آزمانے کے موقعے تلاشتی رہتی تھی۔ اسے مہندی کا رونا بھول گیا۔ بھاگ کر اپنا وینٹی باکس لے آئی۔ اب وہ مٹی کا بت تھی۔ اور وہ دو فنکار۔

وہ اتنی مگن تھیں کہ دروازے پر ہوتی ہلکی سی دستک پر کسی کا دھیان ہی نہیں گیا تھا، وہ تو گلی میں کھیلتے عمر نے ڈاکٹر صاحب کو اپنے گھر کے باہر دیکھا تو کھیل چھوڑ کر بھاگا آیا۔ وہ زبردستی انہیں دھکیلتا اندر ہی لے آیا تھا۔ لبنیٰ تو اپنا کام کر چکی تھی۔ مریم اپنی کارگزاری کو فائنل ٹچ دے رہی تھی۔

''زرتاج آپا! دیکھیں تو کون آیا ہے؟'' اس کی چہکار پر سب کی گردن گھومی۔ اور جہاں ان تینوں کے منہ سے کورس میں۔ ''ہائے اللہ'' نکلا تھا۔ وہیں زرتاج کی سانس رکی۔ وہ کب آیا شہر سے۔ کیا ابھی؟ اففف۔ توبہ۔ اس کا حلیہ۔ باذل نے پورے دھیان سے دیکھا تھا۔ عمر بھاگ کر اپنا چوزہ لے آیا جو کل سے نڈھال پڑا تھا۔ وہ سب ہنس دیں۔ (علاوہ اس کے جس کی صورت پر اک تناؤ سا تھا)۔

''آپ کی ڈاکٹری چل گئی اس پنڈ میں باذل بھائی۔ یہاں تو سارے مفتے کے مریض آئیں گے آپ کے پاس۔'' زاہدہ بولی تھی۔

''نہیں بھئی، بہت خدمت کر چکا میں۔ یہ آخری مریض ہے۔ جسے میں چیک کر رہا ہوں۔ اس کے بعد بہت جلد میں یہاں کلینک شروع کر رہا ہوں اور وہاں کوئی فیس جمع کرائے بنا داخل نہیں ہو سکے گا۔ میاں جی نے اتنا خرچا کیا ہے میری پڑھائی پر۔ اب ہی تو وقت آیا ہے وصولی کا۔''

اس نے اپنے پروگرام سے فوری آگاہی دی

تھی۔ زرتاج کلس کر رہ گئی۔ وہ اک جھٹکے سے اٹھی۔
"مہندی سوکھ گئی ہے۔ میں ہاتھ دھولوں۔"
لبنیٰ کے دیکھنے پر کہتی صحن میں لگے بیسن کی جانب بڑھی۔
"صرف ہاتھ ہی دھونا۔" اس کے پاس سے گزری تھی جب وہ لگاوٹ بھرے لہجے میں کہہ گیا۔
"ہاں اس کا کیا بھروسا یہ منہ بھی دھو کر آجائے۔ اور میری ساری محنت پانی میں چلی جائے۔ ویسے زرتاج کی اسکن بہت شفاف ہے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور کتنی پیاری لگ رہی ہے۔ آپ نے تو ذرا بھی تعریف نہیں کی باذل بھائی۔ میں نے آج دوسری بار اس پر اپنا فن آزمایا ہے۔ پہلی بار یہ میرے ہاتھ صغریٰ آپا کی مہندی والی رات لگی تھی۔ جب اس کے نانا کرتے بھی میں نے خوب تیز میک اپ کر دیا تھا۔ تب تو مجھے اتنا کوئی خاص چیزوں کا پتا بھی نہیں تھا۔ بس سائرہ کی چڑ میں ہی پکڑ لیا تھا میں نے اسے۔ کیوں زرتاج یاد ہے نا۔"
مریم ہنستے ہوئے اپنا کارنامہ بتا رہی تھی۔ مہندی مسل مسل کر چھڑاتے اس کے ہاتھ ساکت ہوئے تھے۔ رات اسے بھلا کیسے بھول جاتی۔ وہ مریم سے کہہ رہا تھا۔
"تب کا تو مجھے پتا نہیں۔ ہاں، آج تو تم نے کمال ہی کر دیا ہے۔ خوب اچھا پینٹ کر لیتی ہو تم۔ تم نے تو میری بیوی کو بدل کر ہی رکھ دیا ہے۔ اتنا خوبصورت بنا دیا ہے اسے۔"
زاہدہ کو اس کے الفاظ پر اعتراض ہوا تھا۔
"ہماری زرتاج کو تو اللہ نے ہی خوبصورت بنا کر اتارا ہے باذل بھائی۔ اس میں مریم کا کوئی کمال نہیں۔"
"بالکل بھئی۔ سچ کہا۔ اللہ کی ہر تخلیق ہی خوبصورت ہے اور جسے انسان مزید نکھارے تو وہ انعام کا حقدار تو ہوتا ہے۔ لو بھئی مریم یہ تمہارے لیے۔" وہ کڑ کڑاتا نیلا نوٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔
"ہائے سچی یہ میرے لیے۔" مریم کو تو یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کسی نے ایسے سراہا بھی تو نہیں تھا۔
"ہاں تمہارے لیے۔ اور یہ لبنیٰ تمہاری مٹھائی۔ تمہاری سہیلی تمہارے لیے لے کر آئی ہے یا نہیں۔ لیکن یہ تم اپنے بھائی کی طرف سے رکھو۔" اور زرتاج کو یاد آیا۔ آپا نے اس سے کچھ کہا تو تھا اور شاید کچھ نوٹ بھی ٹیبل پر رکھے تھے۔ کہ یاد سے لے جا کر لبنیٰ کی مٹھی میں دبا دینا۔ شگن ہوتا ہے۔ اور اف۔ اس کی یادداشت وہ سرے سے بھول ہی گئی۔ اپنی خفت مٹانے کو منہ پر ہاتھ پھیرا۔ چٹے سفید ہاتھوں پر چڑھا لال رنگ خوب دہک رہا تھا۔
"واؤ۔ کتنا زبردست رنگ آیا ہے۔ اور بھئی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ زرتاج کی ساس اس سے پیار کرتی ہیں۔ لیکن باذل بھائی کا ہمیں پتا نہیں۔" مریم کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ اس سے کیا بعید جانے اور کیا کیا کہہ دے۔ وہ گڑبڑا کر جلدی سے بول گئی۔
"گھر چلیں۔" باذل فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اسی کے حکم کے انتظار میں تھا۔
"آپ کا بھی پتا لگ گیا باذل بھائی۔" مریم کی ہنسی کا ساتھ ان سب نے دیا تھا۔ وہ خفیف سی گھورے گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اسے اپنے پیچھے آنے کا کہتا باہر چل پڑا۔ وہ اچھی طرح چادر لپیٹے اس کے پیچھے آئی تھی۔ ایک سے دوسری گلی میں تو گھر تھا۔ اور اس کی سانس دھونکنی کی طرح پھول گئی تھی۔ اس پر آپا نے دیکھتے ہی چٹاچٹ جو بلائیں لینا شروع کیں۔
"ماں صدقے جائے۔ کتنی سوہنی لگ رہی ہے میری شہزادی۔ بس ایسے ہی سج سنور کے رہا کر۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ پورے پنڈ میں کسی کی بہو میری بہو جیسی نہیں۔ میرے گھر میں تو اجالا ہو گیا ہے قسمے۔ بس ہو گیا فیصلہ ابھی رضیہ تائی عارف کمبوہ کے پتر کے ویاہ کا بلاوہ دے کے گئی ہے۔ تو نے بھی اس

شادی پر جانا ہے۔ اور تجھے تیار کرنے کے لیے تب مریم کو ہی بلاؤں گی۔ آخر کو چار لوگوں میں جانا۔‘‘
اف ایک تو آپا کے یہ چار لوگ۔ ان کے شہزادے نے زور و شور سے سر ہلایا تھا۔
’’یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ ضرور لے کر جائیں اپنی بہو کو۔ اور چاہیں تو کل ہی جا کر اچھی سی شاپنگ بھی کر لیں۔‘‘
’’نا مجھے کیا پتا اچھی سی شاپنگ کا۔ تم اب خیر سے گھر پر ہی ہو۔ کل لے جاؤ اپنی بیوی کو شہر اور اپنی پسند سے خوب پیارے پیارے کپڑے، جوتے لے دو اسے۔‘‘ آپا نے فٹ تائیدی بیان جاری کیا تھا۔ بادل کی نگاہ اسی پر تھی۔ جو سر جھکائے کھڑی تھی۔
(ہونہہ۔ شاپنگ۔ اس دن کیسے آپا کی کلاس لے ڈالی تھی۔ مجھے سنائیں وہ الگ۔ اب پیسے خرچ نہیں ہوں گے کیا)۔ اک کان کا جھمکا گال پر ہلکورے لے رہا تھا۔ ڈھلتی شام کے سایوں میں سنہری رنگ کچھ اور سنہرا ہو گیا تھا۔ اس نے پل کی پل نگاہ پھیری تھی۔
’’گرمی بہت ہے آپا! ٹھنڈا پانی ہی پلا دیں۔‘‘
’’میں نے تو صندل کا شربت بنا کر رکھا ہوا ہے تمہارے لیے۔ تمہیں ہی آتے اس کی یاد ستائی تھی۔ گھر خالی محسوس ہوا تھا۔ فوراً ہی لینے چل دیے تھے۔ اب ذرا سانس لو۔ میں لے کر آتی ہوں۔‘‘
وہ شرارت سے کہتی کچن کی جانب بڑھ گئیں۔
اس کے وجود میں بھی جنبش ہوئی تھی۔ مگر یہ کیا۔ ایک قدم سے آگے بڑھ نہ سکی۔ شاید چادر کہیں اٹک گئی تھی۔ بوکھلا کر پلٹی۔ چادر کہیں اٹکی نہیں تھی۔ بلکہ اس کی دو انگلیوں میں پھنسی تھی۔ جس کی عجب بہکی بہکی نظریں اس کے سراپے پر ٹکی تھیں۔
’’بہت اچھی لگ رہی ہو۔ ایسی ہی پیاری بن کے رہا کرو۔ لیکن ایک کمی ہے۔ تمہارے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ہے۔ کیا ہوا ہے۔ ایسی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟‘‘
’’شکل ہی ایسی ہے۔‘‘ اسے جانے کس بات کا غصہ تھا۔ کلس کر کہہ گئی۔ وہ ہنس دیا۔
’’ہاں شکل تو ایسی ہی ہے۔ لیکن تھوڑا سا مسکرانے میں کیا حرج ہے۔‘‘ اور اس کے پاس تفصیلی جواب تو تھا۔ مگر ابھی وہ دے نہیں سکتی تھی۔ سو چادر چھڑاتے اندر کی راہ لی۔ اس کی نظر پیچھے تک آئی تھی۔ بالوں میں انگلیاں پھنسائے وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

☆☆☆

کسی ڈرامے کا ’’او ایس ٹی‘‘ چل رہا تھا۔ بول کیا کم دل فگار تھے کہ اس پر مناظر بھی ایسے دل سوز۔ جو دیکھنے سننے والوں کے کلیجے شق کرے۔ وہ شاید اپنی ٹریجڈی پر بھی اتنا دکھی نہیں ہوئی ہو گی۔ جس قدر کے اب دکھائی دے رہی تھی۔ حزن و ملال چہرے پر چھایا تھا۔
تائی فاخرہ نے دو بار کہا بھی کہ اس نامراد ٹی وی کی آواز ذرا کم کر دو۔ لیکن وہ تو یوں دکھ کے گہرے سمندر میں غرق تھی۔ جیسے وہاں تک کسی پکار کی رسائی ہی نہ ہو۔
آج یہ اس کا گیارہواں پھیرا تھا۔ وہ اس دن کی صبح سے جو مکلاوے کے نام پر میکے آئی تھی۔ تو واپسی کا نام نہیں لیا تھا۔ امی اور ابا تو پہلے ہی اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔ اس خاندان نے کم دکھ دیے تھے۔ جو وہ اک مستقل مصیبت بھی گلے ڈال لیتے۔ مگر بس وہی پاگل ہوا تھا۔ جو جانتے بوجھتے موت کے کنویں میں چھلانگ لگا بیٹھا۔ وہ کم عقل ہے۔ جانتا تھا۔ لیکن بالکل ہی عقل سے پیدل ثابت ہو گی۔ یہ اب خبر ہو رہی تھی۔
’’آجا پتر ہم ہی باہر چل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس لڑکی کو تو اللہ جانے کب عقل آنی ہے۔‘‘ تائی فاخرہ تھک ہار کر اٹھ گئی تھیں۔ وہ بھی اک نظر ڈالتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ کب سے گونگی بہری ہونے کی اداکاری کرتی سائرہ نے بھی ان کے جاتے ہی کھل کر سانس لیا تھا۔ ٹی وی کی آواز کم کر کے کانوں میں انگلیاں گھمائیں۔ کبھی کبھی دوسروں کو اذیت دیتے

دیتے خود بھی سہنا کتنا کٹھن ہو جاتا ہے۔ اس نے آنکھیں صاف کیں۔ اب یہ آنسو ڈرامے کی ہیروئن کے دکھ میں بہے تھے یا اپنے۔ یہ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

دالان میں ترتیب سے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر وہ تائی کے سامنے جا بیٹھا تھا۔ اور جیب سے رقم نکال کر ان کے حوالے کی۔ وہ سوالیہ نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

"آڑھتی کے پاس گیا تھا میں اپنی فصل کا حساب کتاب کرنے۔ تو اس نے آپ کی ٹماٹر کی فصل کے پیسے پکڑا دیے۔ گن لیں۔ ابھی کچھ اور بھی رہتے ہیں۔ وہ دو ایک روز تک گھر پہنچا جائے گا۔ میں نے اسے خاص تاکید کر دی ہے۔"

اور وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ یہ اسی فصل کے پیسے تھے جو سجاد نے انہیں بتایا تھا کہ خراب ہو گئی ہے۔ بس خرچہ ہی نکل آیا تو بڑی بات ہو گی۔ کیا ان کا بیٹا انہیں دھوکا دیتا رہا ہے۔ اور یہ خیال ان کا دل چیر گیا تھا۔ انہوں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ زیادہ دیر اس کا سامنا نہیں کر سکتی تھیں۔ پہلی کوتاہیاں ہی نہیں بھولتی تھیں کہ اب ان کی صاحبزادی کے نخرے۔ جو وہ شریف زادہ خندہ پیشانی سے جھیل رہا تھا۔ اگر اس کی جگہ وہ نامراد احسان ہی ہوتا تو۔ اور وہ جھرجھری لیتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تمہارے لیے بیسن کا حلوہ رکھا تھا۔ میں ابھی گرم کر کے لائی۔"

"او میری پیاری تائی۔ جگ جگ جئیں۔ یہ آپ ہیں جو اس بندہ ناچیز کو پوچھ لیتی ہیں۔ ورنہ تو کسی اور کو میری پرواہ ہی نہیں۔ مگر مجھے تو ہے نا۔ اسی لیے سوچا ہے کہ جا کر عزت سے اپنی سیٹ سنبھالوں۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ بار بار چھٹیاں مارنے پر باس فارغ ہی کر دے۔ اسی لیے آج رخت سفر باندھا ہے۔ شہر جا رہا ہوں۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔"

"اماں کو شہر سے بھلا کیا منگوانا ہو گا۔ آپا سے پوچھ لیں۔ ان کی کوئی رنگ گورا کرنے والی کریم شریم نہ ختم ہو گئی ہو۔" یہ ارباز تھا جو باہر سے آتا اس کا جملہ سن کر بولا تھا۔ تائی نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر اسے آنکھیں دکھائی تھیں۔ ضرورت ہی کیا ہے ایک سوئی ہوئی بلا کو جگانے کی۔

"کیا۔ یعنی کے ہزاروں کا نسخہ۔ اللہ توبہ۔ میرے بھائی میں نے کبھی ایسی چیز خریدی نہ استعمال کی۔ میں تو مزدور آدمی ہوں۔ وہاں اخبار کے دفتر میں کام کرتا ہوں۔ اخبار میں لپٹی روٹی کھاتا ہوں۔ اور رات پڑے تو اخبار لپیٹ کر سو جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرا وہاں کوئی واسطہ سروکار نہیں۔ ویسے جن لوگوں کے دل کالے ہوتے ہیں ان کو رنگ گورا کرنے میں اتنی دلچسپی کیوں ہوتی ہے؟" وہ نہایت معصومیت سے سوال کناں ہوا۔

"کیونکہ ان کو ڈر ہوتا ہے کہ کسی دن اندر کی کالک ان کی صورت پر بھی ظاہر نہ ہو جائے۔ اسی لیے وہ اس شعوری کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ جتنا بھی ہو سکے منہ چٹا کر لیا جائے۔" ارباز نے کسی ماہر قیافہ شناس کی طرح اپنا تجزیہ پیش کیا اور داد پائی۔

"واہ یہ تم نے بڑے پتے کی بات ہے۔ یہ تو سنہری حروف ہیں یار۔ تم نے تو میرا دل جیت لیا۔" ارباز آداب بجا لایا۔ ان کی یہ محققانہ گفتگو اس تک بھی پہنچی تھی۔ وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔ ٹی وی کا والیم ایک بار پھر بڑھ چکا تھا۔ دونوں اک دوجے کو دیکھ کر مسکرا دیئے۔ بس کے آنے میں تھوڑا ٹائم ہی رہ گیا تھا۔ یہ کیسے ہوتا کہ وہ اس سے ملے بنا چلا جاتا (یا ایک بار پھر اپنا ضبط آزمائے بنا کہنا زیادہ مناسب ہو گا)۔ وہ صوفے میں دھنس کر بیٹھی تھی۔ وہ چپکے سے برابر آ بیٹھا۔ ہونٹوں پر دوستانہ اور محبت بھری مسکان لیے۔

"اماں باہر ہیں۔" انداز اطلاع دینے والا تھا۔

"ہاں۔ جانتا ہوں۔ ان سے مل کر ہی آ رہا ہوں۔ کتنے دن بعد تو آیا ہوں میں۔ میں تو تم سے

ملنے کو ترس رہا ہوں۔ کیا ملو گی نہیں؟'' اس نے شرقاً غرباً بازو پھیلائے۔ سائرہ اور سمٹ گئی۔ لیکن بولی تو لہجے کا تنتنا برقرار تھا۔

''کیوں ملوں تم سے۔ ہو کون تم؟'' اور وہاج کے بازو کٹے شہتیر کی مانند گرے تھے۔ آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ پھر بوکھلا کر ارباز کو آواز دی۔

''جی وہاج بھائی۔'' وہ اگلے پل بوتل کے جن کی طرح آن حاضر ہوا۔

''یار تمہیں میری قسم مجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ بالکل سچ بتانا۔ یہ تمہاری پیاری آپا آج کل میں کہیں گری تو نہیں تھیں۔ سر پر تو چوٹ نہیں آئی۔ دیکھو مجھے پہچان نہیں رہیں۔ ان کی یادداشت چلی گئی ہے۔'' وہ روہانسا ہو چلا تھا۔

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ابھی واپس لے آتے ہیں یادداشت۔ آپا جو ڈرامے دیکھتی ہیں نا ان میں سے ننانوے فیصد میں یہی بیماری دکھائی جاتی ہے۔ اور پتا ہے پھر اس کا ایک آسان اور سادہ سا حل بھی بتایا جاتا ہے کہ کوئی بھی وزنی چیز لے کر مریض کے سر پر مارنے سے اس کی کھوئی ہوئی یادداشت۔''

''ٹھہر جا کمینے۔ تیری تو میں ابھی خبر لیتی ہوں۔''

وہ بے چارا ابھی پورا حل بیان بھی نہیں کر پایا تھا کہ ▪ جوتی لے کر اٹھی تھی۔ وہاج نے لپک کر روکا۔

''اونہوں۔ یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔ چھوٹا بھائی ہے وہ تمہارا۔ اچھے لہجے میں بولو۔ تاکہ وہ بھی تمہارے ساتھ ویسا ہی انداز اختیار کرے۔''

''اچھا اب تم بولنا سکھاؤ گے مجھے؟'' وہ اس کی جانب مڑی۔ اک جھٹکے سے بازو چھڑایا۔ وہ اک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ وہ تو لڑنے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ اس ساری صورتحال سے اب وہ بھی تھکنے لگا تھا۔ گرنے کے سے انداز سے صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر دھم سے گری تھی۔ جوتی پٹخ کر نیچے پھینکی۔ اگر تو اس کا فیورٹ سوپ نا آ رہا ہوتا تو یقیناً وہ اب تک جا چکی ہوتی۔ اب کڑوا گھونٹ بھر لیا۔ یوں بھی ▪ اس سے ڈرتی تھوڑا تھی۔ اس کا سارا دھیان سامنے روشن اسکرین کی طرف تھا۔ وہاج بھی اسے دیکھتا کبھی اس کی نظر کا تعاقب کرتا۔ جہاں اک خوبصورت عورت اپنے سامنے تن کر کھڑے مرد کی منت سماجت کر رہی تھی۔ وہ مرد اس عورت کا شوہر تھا۔ اور جو اس کے علم میں لائے بنا دوسری شادی کر چکا تھا۔ اب وہ اسے اپنی محبت اور قربانیاں یاد دلا رہی تھی۔ مگر مجال ہے جو اس مرد کے چہرے کی رعونت میں رتی بھر بھی کمی آئی ہو۔ الٹا وہ اس کی کجیاں اسے بتانے لگا۔ جب وہ اس کے لیے کما کر گھر آتا تھا اور وہ اپنی فالتو کی سرگرمیوں میں مصروف ہوا کرتی تھی۔ بہت ہی دل گیر منظر تھا۔ سائرہ جبیں تو پور پور اس عورت کے دکھ میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔ وہاج کی ''چچ چچ'' پر اس کا ارتکاز تتر بتر ہوا۔ قبل اس کے کچھ بولتی وہ کہہ رہا تھا۔

''کتنا افسوس ہو رہا ہے نا تمہیں اس عورت پر ہوا ظلم دیکھ کر۔ جبکہ میرا نہیں خیال کے اس پر کوئی ظلم ہوا ہے۔ جو بھی ہوا وہ اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔''

''فرض کرو۔ میں ہی تمہارے رویئے سے تنگ آ گیا تو پھر؟'' اور اس نے پورا سر گھما کر دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی تھی۔ اور اس کے رخسار دہک اٹھے تھے۔

''ہاں بھئی دیکھو نا کون ذی نفس نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی میں سکون ہو۔ اب اگر تم اپنا آپ ٹھیک نہیں کرو گی۔ تو پھر مجھے۔''

''ہاں تو اب تک کھڑے کیوں ہو۔ کیا کر رہے ہو یہاں۔ تنگ آ گئے ہو تو جاؤ نا۔ کیا لینے آئے ہو ادھر۔ نکلو۔'' وہ یک دم ہی حلق پھاڑ کر چلائی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے دھکیلا۔ چائے لیے آتی تائی نے گھبرا کر ٹوکا تھا۔

''پاگل ہوئی ہے۔ یہ کیا کر رہی ہے۔ سائرہ ہوش کر۔'' تائی نے اسے روکا بھی مگر وہ ٹھہرا ہی نہیں۔

''تم پچھتاؤ گی سائرہ جبیں۔ کیوں اجاڑ رہی ہو اپنے ہاتھوں سے اپنا مقدر؟ سمجھ جاؤ ورنہ بہت برا

انجام ہوگا۔" حسب سابق اسے سنانا شروع کر چکی تھیں۔ اور وہ بڑبڑائے جارہی تھی۔

"مکار۔ چالباز۔ جھوٹا۔ دعوے محبت کے کرتا ہے۔ چند دن برداشت نہیں کرسکا۔ تنگ پڑ گیا ہے مجھ سے۔ ایسی ہوتی ہے محبت؟ ایسے ہوتے ہیں عاشق۔"

☆☆☆

آسمان آج ہی اتنا نیلا اور روشن تھا یا اسے ہی لگ رہا تھا۔ فضا میں تیرتے پرندوں میں اسے اپنا آپ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کررہی تھی۔ ہر بوجھ سے آزاد۔ ہر فکر سے بے نیاز۔ اسے ہنسے کتنے دن ہوگئے تھے نا۔ لیکن اب تو وہ ہنس سکتی ہے۔

بھائی بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔ اس کا بھائی بھی اسے اپنی جان سے پیارا تھا۔ جس نے رخصتی کے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔

"تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ اس میں قصور وار میں بھی نکلتا ہوں۔ شاید کہ میرا طریقہ کار غلط تھا۔ ذرا جو تحمل سے معاملہ دیکھتا تو یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا۔ لیکن میرا تم سے وعدہ ہے۔ بہت جلد تمہارے مجرم تم سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگیں گے۔"

اور آج اس نے اپنا وعدہ ایفا کر دیا تھا۔ وہ سجاد کو لے کر آیا تھا۔ میاں جی' شمسہ آپا' اور۔ باذل جمال اس نے سب کے سامنے اپنے تمام جرم قبول تے اس سے معافی چاہی تھی۔ سجاد نے زندگی میں اس سے پہلے کچھ سیکھا تھا یا نہیں۔ لیکن گزرے دن اسے بھی خوب سبق پڑھا گئے تھے۔ خواہ مخواہ کا عناد بالکل سورج کی طرح ہوتا ہے۔ جس کا رخ آپ کسی کی طرف بھی موڑے رکھیں۔ لیکن اک دن یہ آپ ہی کی جانب پلٹ آتا ہے۔ اور تب اس کا نام ہوتا ہے فقط پچھتاوا۔ چہرے پر اطمینان لیے گردن اٹھائے بیٹھی زرتاج بانو اور لاپرواہ سے ڈاکٹر باذل جمال کو اس نے بس اک نظر دیکھا تھا۔ پھر دوبارہ دیکھنے کی جرات نہیں ہوئی تھی۔ خود جب گیا تو سر جھکا ہوا تھا۔

وہ آج بے حد مسرور تھی۔ اس کے دامن پر لگے سب داغ دھل گئے تھے۔ سامنے سے شمسہ آپا چلی آرہی تھیں۔ جن سے اس نے کہا تھا۔

"بہت دن ہوگئے امی سے ملے ہوئے۔ میں ان کی طرف چلی جاؤں۔" اور انہوں نے اس کے عقب میں کھڑے باذل کو دیکھا۔ جس کا رنگ ایک دم ہی گلابی سا ہو گیا تھا۔

"میں اندر سے اپنی چادر لے لوں۔ اور رات کھانے پر میرا انتظار مت کیجیے گا۔ میں امی کے پاس ہی ..وں گی آج۔" وہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی دیکھے بنا آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ بلبلاتا ہوا ان سے مخاطب تھا۔

"دیکھ رہی ہیں اپنی بہورانی کے انداز۔ مجھے دیکھ کر تو یوں جگہ چھوڑ دیتی ہے جیسے کوا غلیل دیکھ کر۔ اب اگر میں اسے کچھ کہوں گا۔ تو آپ لٹھ لے کر میرے پیچھے ہی پڑ جائیں گی۔ اب یہ کوئی طریقہ ہے۔ کیا سمجھا ہے اس نے مجھے۔ اس کا شوہر میں ہوں۔ اور مجھے ہی نظر انداز کرکے میرے سامنے آپ سے اجازت طلب کر رہی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کیسے جاتی ہے کہیں۔" وہ تن فن کرتا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ آپا کی جان ہوا ہوئی۔

"ہائے میرے اللہ۔ باذل پتر آرام سے۔ کچھ مت کہنا اسے۔ پیار سے سمجھاؤ۔"

وہ الماری میں لٹکی چادر نکال کر پلٹی ہی تھی کہ اس نے آکر پیچھے سے جھپٹ لی۔ اور بازو سے پکڑ کر کھینچتے دیوار سے لگا دیا۔ دائیں بائیں دونوں ہاتھ ٹکائے وہ اسے مکمل طور پر محصور کر چکا تھا۔ اس طرح کہ وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکی۔ پوری کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کے تیور غضب ناک تھے۔

"اگر تمہیں یاد ہو تو تمہارا نکاح مجھ سے ہوا تھا۔ میں چاہوں تو تم اس کمرے سے قدم باہر نہیں نکال سکتیں۔ اور تم گھر سے جانے کی بات کرتی ہو۔" اور زرتاج نے کچھ کہنے کے بجائے اس کے سینے پر دونوں ہتھیلیاں رکھتے پیچھے دھکیلنا چاہا تھا۔ باذل کو خوب لطف آیا۔ مسکراتے ہوئے اور چڑانے لگا۔

"میں بھی دیکھتا ہوں تمہاری ہمت۔ اب اس حصار سے نکل کر دکھاؤ مجھے۔" اور وہ مزاحمت ترک

کر کے عجیب انداز سے مسکرائی تھی۔
یہ آپ کی بھول ہے کہ میں اس حصار میں ہوں۔ میں تو اس سے کب کی نکل چکی۔ آپ کیا سمجھ رہے ہیں۔آپ کے پاس زرتاج بانو ہے؟ نہیں باذل جمال صاحب اس زرتاج بانو کا دل اور روح تو اسی پل مر گئے تھے۔ جب اس کے اندر محبت نے آخری ہچکی لی تھی۔
"آپ تو اسے وہیں مار آئے تھے۔ جب اس کی دردبھری پکار پر پلٹ کر دیکھا بھی نہیں تھا۔ اسے بے اعتباری کی آگ میں وہیں جھلستا چھوڑ دیا تھا۔ اور آپ تو اس سے نکاح پر بھی راضی نہ تھے۔ زبردستی کا سودا کیا آپ نے۔ اگر میاں جی آپ کو تھپڑ نہ مارتے تو شاید آپ۔"
بات ادھوری چھوڑ کر اس نے زور سے پلکیں میچ لیں۔ باذل کا جی چاہا اپنا ماتھا پیٹ لے۔
"اُفف۔ یہ آپا بھی نا۔ اب بھلا کیا ضروری تھا کہ یہ قصہ بھی اسے سنایا جاتا۔"
"اور...... اور پھر آپ کا رویہ۔ کیا سلوک کیا آپ نے میرے ساتھ۔ جہاں ساری دنیا کھڑی تھی۔ آپ بھی وہیں جا کھڑے ہوئے۔ مجھ پر انگلیاں اٹھانے والوں میں آپ بھی شامل تھے۔ یہ تھی آپ کی محبت۔ پانی کے بلبلے سے بھی زیادہ بے وزن اور ہلکی۔ مجھے آج کے دن کا شدت سے انتظار تھا۔ اب تو آپ کو یقین آ گیا نا کہ میں گناہ گار نہیں تھی۔ یا اب بھی کوئی ثبوت چاہیے آپ کو۔"
"اوہ میری جان۔ میں نے پہلے بھی کب کوئی ثبوت چاہا تھا۔ اور تم اگر یہ سمجھے ہوئے ہو کہ تم سے نکاح پر میاں جی کی مار پیٹ کے بعد زبردستی راضی ہوا تھا تو ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے کوئی مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اگر کسی نے مجبور کیا تھا تو صرف میری محبت تھی۔ جو خفا ہونے کے باوجود بھی اندر سانس لے رہی تھی۔ وقتی طور پر دل میں میل آ گیا تھا۔ لیکن جیسے ہی مجھے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تو میں نے اس کا ازالہ کیا نا۔ تم سے معافی مانگی تو تھی۔"
باذل نے نہایت نرمی سے عارض پر بہتے موتی سمیٹنا چاہے تھے۔ لیکن ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ (ہونہہ معافی۔ ایسے مانگتے ہیں معافی) اس کا غصہ کسی طور کم نا ہو رہا تھا۔
"اور تمہارے اطمینان کے لیے بتا دوں کہ میں نے وہاج کو صاف منع کر دیا تھا۔ کہ سجاد جیسے بدقماش شخص کی پرچھائیں بھی میرے گھر پر نہ پڑے۔ یہ کڑوا گھونٹ اس لیے پینا پڑا کہ تم ذہنی طور پر مطمئن ہو سکو۔ ورنہ اس کی معافی تلافی سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مجھے تمہارے معاملے میں کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں اس کے لیے میرا دل ہی کافی ہے۔ آج تک جو ہوا سو ہوا۔ اب تم سب بھول جاؤ۔ اور خوش۔"
"بھول ہی تو نہیں سکتی۔ کیسے بھول جاؤں وہ سارے دن۔ جب بھرے جہان میں مجھے اکیلا کر دیا گیا۔ پرے ہٹیں۔ مجھے جانے دیں پلیز۔" وہ تو جیسے کوئی تہیہ کیے ہوئے تھی۔ ایک بار پھر اسے دھکیلنا چاہا۔ باذل نے اس کے چہرے پر روانی سے بہتے آنسوؤں کو دیکھا اور ہاتھ ہٹا لیے۔
"اگر تم کوئی فیصلہ کر ہی چکی ہو۔ تم نے مجھ سے کوئی عناد پال ہی لیا ہے تو ٹھیک ہے۔ میں مزید اب کیا کہوں۔ تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو بے شک چلی جاؤ۔ لیکن اس سے پہلے بس ایک بار اپنے دل میں جھانک کر ضرور دیکھ لینا۔ کہیں کسی کونے میں رائی برابر بھی میرے لیے نفرت نظر آئے تو تم اپنے فیصلے میں آزاد ہو۔" وہ منہ پھیرے کھڑا تھا۔ اور یہ کیسی عجیب شرط عائد کی تھی اس نے۔ نفرت اور اس سے؟ کیا ایسا ممکن ہے۔ اس شخص سے وہ بدگمان ہو سکتی تھی۔ ناراض ہو سکتی تھی۔ غصہ ہو سکتی تھی۔ مگر اس کے لیے نفرت۔ کینہ وعناد اپنے اندر نہیں پال سکتی تھی۔ اور رہی محبت کی بات۔ تو اس سے محبت بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھی۔ اس کی تو نس نس میں وہی لہو بن کر دوڑ رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ سر گھٹنوں پر رکھا تھا۔ باذل نے دیکھا اور کمرے سے نکل گیا۔
کچھ دیر بعد وہ اس کے برابر بیٹھ رہا تھا۔ زرتاج نے اک جھٹکے سے گردن اٹھائی۔ اور اس کے ہاتھوں میں

گلابوں کا ڈھیر دیکھ کر بدک کر کھڑی ہوئی تھی۔
"کیا ہوا؟ اتنے خوبصورت پھول لے کر آیا ہوں تمہارے لیے اور تم ہو کہ......"
"آپ سے کس نے کہا تھا لے کر آئیں۔ مجھے ان کی خوشبو بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔ بلکہ مجھے تو آج کل ہر چیز کی خوشبو بری لگنے لگی ہے۔ جی متلانے لگتا ہے میرا۔ میں جا رہی ہوں کھلی فضا میں۔ اوو۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھے باہر کو لپکی تھی۔ اور باذل متحیر سا دیکھتا رہ گیا تھا۔
افففف۔ ایک تو لڑکیوں کے نخرے۔ اب بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ خوشبو بھی کسی کو بری لگتی ہے کیا۔ خوشبو تو......"
اور کہیں جھماکا سا ہوا تھا۔ آخر کو وہ ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر تھا۔ خوشبو کب اور کہاں اچھی نہیں لگتی۔ کبھی کسی باب میں پڑھا ہی ہوگا۔ وہ بنا اسپرنگ کے اچھلا تھا۔ سارے پھول ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس کا رخ بھی دروازے کی جانب تھا۔ دالان میں بچھے تخت سے پیر الجھا۔ کچن سے نکلتی شمسہ آپا سے ٹکراتے ٹکراتے بمشکل سنبھلا۔
"الٰہی خیر۔ کیا ہوا ہے لڑکے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار کدھر جا رہے ہو۔ کس بات کی جلدی ہے۔"
"وہ...... وہ آپا......! وہ میں...... نہیں وہ......
زرتاج......!" وہ حد درجے بوکھلایا ہوا تھا۔
"کیا وہ میں۔ اور کیا وہ۔ کیا ہوا ہے۔ جلدی سے بتاؤ۔" انہیں تو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بے تابانہ یہاں وہاں سر گھماتے خود کو تلاشتے باذل کو دیکھ کر چھت پر جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی زرتاج کو ہنسی آئے جا رہی تھی۔
اس پل اسے ہر کلفت بھول گئی تھی۔ زندگی کبھی کبھی کتنی خوبصورت لگنے لگتی ہے نا۔ اور باذل نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ اسی کی طرف آ رہا تھا۔
زرتاج کو ہنسی بھول گئی۔ افففف۔ یہ خیال ہی گال گلال کر گیا تھا کہ اس کا سوال کیا ہوگا۔
"اوہ میرے اللہ۔ یہ زندگی بھی نا کتنے رنگ ہیں اس کے۔" اب اسے وہ جگہ نہیں سوجھ رہی تھی۔ جہاں جا چھپتی۔

☆☆☆

بس جس دن بادل ذرا کھل کے کیا برستے کہ لکڑیوں کو تو موت ہی پڑ جاتی یا پھر اس سے وہی پرانا بیر نکالا جاتا کہ جل کر نہ دیتیں۔ آج پھر وہ مصیبت میں پڑی تھی۔ ایک تو سرس کی لکڑی اس پر سیلن زدہ۔ مانو عذاب ہی بن گئی تھیں۔ اتنا کڑوا دھواں جو جان کے ہی درپے ہونے لگا تھا۔ وہ جلتی آنکھیں زور سے میچے پھونکیں مار مار ہلکان ہو رہی تھی کہ کسی نے آ کر پھونکنی کھینچتے پرے پھینکی۔
"میں قربان...... مجھے خبر تھی ایسی ہی کسی مشکل میں پڑی ہوگی میری جان۔
گولی مارو ایسے کام کو جو نم کرے مژگان۔
ادھر آؤ دیکھو تمہارے واسطے کیا لایا تمہارا جانان۔"
یہ تو اسی ابن الڈھیٹ کی آواز تھی۔
وہ اسے کھینچتا واش بیسن تک لے آیا تھا۔
"اتنا آفت موسم دیکھ کر رہا نہیں گیا۔ دل ضد میں پڑ گیا کہ آج تو دیدار یار ہی کرنا ہے۔ بس پھر میں نے آفس سے چھٹی لی۔ کھانا پیک کروایا اور اس برستی بارش میں ایک سو کی اسپیڈ سے بائیک دوڑاتا یہاں تک آیا ہوں۔ سمجھو جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی صرف اپنی جان کی خاطر۔ اور ہاں تمہارے لیے کچھ شاپنگ بھی کی تھی وہ بھی دیکھ لو۔ بس وہ پنک بیگ ابھی مت کھولنا۔ اور بڑے زوروں کی بھوک لگ رہی ہے۔ تم فٹافٹ منہ ہاتھ دھو کر کھانا نکالو، میں اتنے تائی سے مل لوں۔" وہ اپنی ہی سنا کر اندر بڑھ گیا تھا۔
وہ سخت بدمزہ ہوتی نل کھولے منہ پر پانی کے چھپاکے مارنے لگی۔
چارپائی پر شاپنگ بیگز کا ڈھیر لگا تھا۔ کچھ سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کی کینہ توز نگاہ سارے سامان سے گھومتی پنک بیگ پر رکی۔ یہ عادت تو بچپن سے تھی جس کام سے منع کیا جاتا وہی کام انجام دینا۔ اور وہ بیگ کیا کھلا تھا گویا اس کے اردگرد ستارے بکھر گئے تھے۔ نہایت نفیس اور دل

آویزہ کام سے مزین سرخ کلر کا برائیڈل ڈریس تھا۔ وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔
"ہاہاہا...... اسی لیے منع کیا تھا۔ مجھے پتا تھا تم پہلے اسے ہی کھولو گی۔"
وہ پلر سے ٹیک لگائے ہنستا ہمیشہ سے زیادہ زہر لگا۔ وہ اسے اس سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کا یہ دعوا تو سچ ثابت ہوا۔ اسی لیے تیکھے چتونوں سے گھورا۔
"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ کتنا خوب صورت جوڑا ہے۔ اللہ پہننا نصیب کرے۔ لانے والے کے کاروبار میں برکت ڈالے۔ دونوں شاد آباد رہو۔ پھلو پھولو۔"
تائی فاخرہ نے دعاؤں کے ڈھیر لگا دیے۔ وہ ایک ایک چیز کو اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے سراہ رہی تھیں۔ اور وہ جس کے منہ سے کوئی ایک ہی تعریفی کلمہ سننے کا متمنی تھا۔ اس نے مجال ہے جو منہ سے بھاپ بھی نکالی ہو۔ اشیائے خوردونوش والے شاپر زاچکتے کچن کی راہ لی۔ وہ پیچھے ہی آیا تھا۔
"بہت مشکل سے صرف چوبیس گھنٹوں کی چھٹی ملی ہے مجھے۔ جس میں کچھ گھنٹے تو شاپنگ اور شہر سے گاؤں تک آتے ضائع ہو گئے۔ اب پیچھے جو ٹائم بچا ہے میرے پاس میں اس کا ایک ایک لمحہ تمہارے سنگ بتانا چاہتا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے میں کتنا بے قرار تھا تم سے ملنے کے لیے۔ اب جلدی سے کھانا لگاؤ۔ سب مل کر کھاتے ہیں۔ پھر گھر چلتے ہیں۔"
وہ یوں بے تکلف سا بول رہا تھا جیسے دونوں کے درمیان مثالی تعلقات ہوں۔ ادھر سائرہ جبیں یوں لاپروا تھی۔ گویا حس سماعت کے ساتھ ساتھ بصارت بھی کہیں رکھ کر بھول گئی ہو۔ ذرا جو اس کی کسی بات پر چہرے نے کوئی رنگ بدلا ہو۔
وہ مگن سا بولتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑنے بڑھا تھا کہ وہ طرح دیتی شوکیس سے برتن نکالنے لگی۔ وہ زچ ہوا۔
"سائرہ! میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ تم سن رہی ہو؟ دیکھو اگر آج بھی تمہاری یادداشت کہیں کھوئی ہوئی ہے تو مجھے ارباز کا مجرب نسخہ آزمانے میں کوئی تردد نہیں ہوگا۔ ہاں مانا کہ ایسا کرتے ہوئے میرے دل کو تھوڑی تکلیف ضرور ہوگی۔ لیکن تمہیں صحت مند دیکھنے کے لیے میں اتنا سا رسک تو لے ہی سکتا ہوں۔ آخر کو تم بیوی ہو میری اور مجھے تم سے محبت......"
"تم کمرے میں چلو۔ میں کھانا لے کر آ رہی ہوں۔" اس کی اتنی دھواں دھار تقریر کے جواب میں وہاں وہی ٹھنڈا ٹھار لہجہ تھا۔ وہ بے طرح بھناتا اسے پکڑ کر جھنجھوڑ گیا۔ سائرہ نے ہاتھوں سے چھوٹتے برتن بمشکل سنبھالے۔
"تم سمجھتی کیا ہو خود کو۔ کیوں تنگ کر رہی ہو مجھے۔ میں اتنے پیار سے بات کر رہا ہوں اور تم ہو کہ مزاج ہی نہیں مل رہے۔ چاہتی کیا ہو آخر؟ اس کمینے احسان سے تو شادی پر فٹافٹ تیار ہو گئی تھیں۔ کیا مجھ سے زیادہ محبت......" اور اس نے برتن سلیب پر پٹخے۔
"ساری عام لڑکیوں کی طرح میں بھی ایک اچھی زندگی جینے کی خواہاں ہوں۔ میرے بھی کچھ خواب تھے اور وہ گھاگ آدمی ان ہی کا سہارا لے کر مجھ تک آیا تھا۔ اسے مجھ سے محبت تھی یا نہیں۔ لیکن مجھے اس کمینے احسان سے ہرگز محبت نہیں تھی۔"
"اور مجھے تو تم سے محبت ہے نا۔ اب سے نہیں جانے کب سے۔ اور اس محبت سے تم ناواقف تو نہیں۔ پھر کیوں لے رہی ہو میرا امتحان۔ میرا تو ایک ہی خواب تھا اور وہ ہو تم۔ یہاں آ کر میری دنیا مکمل ہو جاتی ہے۔"
"لیکن میری تو دنیا ہی لٹ گئی نا۔ میرے تو سارے خواب ہی بکھر گئے۔ میرے ہاتھ کیا آیا وہ پرانا قلعہ۔ جس میں وہ نوابوں کے دور کا نادر و نایاب ساز و سامان سجا ہے۔ ہونہہ۔" وہ نخوت سے اس کی بات قطع کرتی کہہ گئی۔ اس کے انداز سے، وہاج کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ ایک متاسفانہ نگاہ اس کے سرخ پڑتے چہرے پر ڈالی۔ دلکش نقوش تنے ہوئے تھے۔
"بے وقوف لڑکی زندگی چیزوں کے ساتھ نہیں گزرتی۔ زندگی انسانوں کے ساتھ گزرتی ہے۔ تم ذرا

حوصلہ تو رکھو تمہارے مقدر کا سب پھل ملے گا تمہیں۔ اللہ نے تمہیں مجھ سا حسین وجمیل۔ ذہین وفطین شوہر دیا نا۔ اس کھونچو کے شر سے بال بال بچایا نا۔"

"اُفف۔ بس کردو۔ یہ محبت یہ پیار یہ سب بھرے پیٹ کی باتیں ہیں۔ میری کچھ خواہشیں تھیں۔ آرزو تھی کہ میرا بھی ایک سجا سجایا گھر ہو جس میں......"

"اس سجے سجائے گھر سے پہلے ہر عورت ایک مخلص اور با اعتماد جیون ساتھی کی شبیہہ تراشتی ہے۔ اس کا وہ ہمسفر جس کی محبتوں بھری چھاؤں میں وہ زمانے کے سرد وگرم سے محفوظ رہ سکے۔ کیا تم نے ایسا نہیں چاہا تھا؟ یا پھر میں سمجھوں تمہارا آئیڈیل وہی بد فطرت اور بد قماش احسان تھا۔" وہ شدید رنج اور طیش میں ایک بار پھر اسی کمینے کا تذکرہ کر گیا۔ سائرہ کے تو تلووں سے لگی سر پر بجھی۔

"محبت...... محبت کا راگ بھی الاپ رہے ہو اور بات بات پر مجھے اس منحوس کے طعنے بھی مار رہے ہو۔ تم مرد لوگ عورت کی کوئی غلطی بھول جاؤ۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں میں مانتی ہوں۔ مجھ سے اپنی زندگی کی بہت بڑی بھول ہوئی۔ میں نہیں پہچان سکی اس دو نمبر آدمی کو۔ اور یقین مانو میں بہت احسان مند ہوں تمہاری۔ تم نے میری زندگی برباد ہونے سے بچا لی۔ لیکن اب میں ساری زندگی یہ طعنے ہرگز نہیں سہہ سکتی۔ محبوبہ تھی تو میری خاطر کراچی تک چلے گئے۔ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نوسرباز کا سراغ لگایا۔ مجھے اس کے چنگل سے بچا کر اپنی پناہ میں لیا۔ اور اب کھڑے کھڑے کتنی بار اس کے نام کا جوتا مار چکے ہو۔ نہیں چاہیے مجھے ایسا پیار...... یہ پڑا ہے سب کچھ۔ کھاؤ اور اپنے گھر جاؤ۔" وہ بھی سائرہ جبیں تھی۔ دماغ الٹتے دیر نا لگی۔ وہاج کو تو لینے کے دینے پڑ گئے۔

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپے چھکوں پھکوں رونے میں مشغول تھی۔ جب اس کی مدہم سی پکار سماعت میں اتری۔ ایک بار۔ دوبار۔

"سائرہ! پھر بھی...... آواز نہیں دوں گا۔ بس ایک بار...... آخری بار میری...... طرف دیکھو۔" اور جانے کیا تھا اس پکار میں۔ اس لہجے میں کہ وہ بے اختیار سر اٹھانے سے خود کو روک نہ پائی۔ اور دھک سے رہ گئی۔ اس نے تو دھیان سے دیکھا ہی نہیں تھا کہ بلیک ڈریس پینٹ کے ساتھ گرے چیک دار شرٹ پہنے وہ کتنا اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس پر اک جگمگاتی مسکراہٹ جو اس کے ہونٹوں پر ہی نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی تارہ بن کر چمک رہی تھی۔ کوئی اور لمحہ ہوتا تو وہ نظر چرا جاتی۔ لیکن اب ہٹا نہ سکی۔ کیسے ہٹاتی؟ وہ اب اس کے نکاح میں تھی۔ اک مضبوط بندھن تھا دونوں کے درمیان۔ پھر وہ اب بھاگ کے جاتی بھی تو کہاں۔ دنیا نے تو پہلے ہی ایسے ایسے قصے گھڑے تھے کہ الاماں۔ ابھی تو وہ گرد نہ بیٹھی تھی۔ کہ وہ پھر سے کوئی خاک اڑاتی؟ اب ایسی بھی کم عقل نہ تھی۔ وہ تو بس اس کی انا تھی جو چوٹ کھائی ناگن کی طرح بلبلاتی تھی۔ جس وہاج کریم داد کی اوقات وہ سہیلیوں کے سامنے دو ٹکے کی بتاتی آئی تھی اب ایک دم سے کیسے اس کے برابر جا کھڑی ہوتی۔ اس کی تیکھی سی ناک نا کٹ جاتی۔ افففف۔۔۔ اور اس کی ناک تو کٹتی یا نہیں لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر آنکھیں ضرور پھٹ پڑی تھیں۔

وہاج کی کچھ دیر پہلے کی بے داغ شرٹ پر اب کئی نشان پڑ چکے تھے۔ اس کے بائیں ہاتھ میں تیز دھار چھری تھی اور بائیں ہاتھ کی کلائی سرخا سرخ۔ اس کے وجیہہ چہرے پر اک الوہی مسکان سجی تھی۔ مگر انتہائی کرب میں ڈوبی۔

"اب تو سب ناراضگیاں ختم کر دو گی نا مجھ سے...... کوئی شکوہ تو نہیں رہے گا نا۔" وہ رک رک کر بولتا اس کی رگوں سے جان کھینچ گیا تھا۔

"ہائے میں مرگئی۔ وہاج! یہ کیا کیا تم نے۔"

اس کی چیخ نے در و دیوار ہلائے تھے۔ وہ اٹھ کر تیر کی سی تیزی سے اس تک آئی تب تک ارباز ورتائی بھی بھاگتے پہنچے۔

"یا الٰہی خیر۔ کیا ہوا۔" ان کا دل پتے کی مانند لرز رہا تھا۔ وہاج کے چہرے پر بکھری مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی۔

"ہونا کیا ہے تائی۔ یہ اپنی شہزادی کے کام دیکھیں۔ میں اتنے پیار سے یہ سب کچھ اس کے لیے لے کر آیا ہوں بس سموسے لانا بھول گیا تو اس نے سارا کیچپ مجھ پر انڈیل دیا۔ ...ر۔۔ اور اسی غصے میں یہ مجھ پر چھری سے حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ تو ابھی زندگی باقی تھی جو بچ گیا۔ ورنہ تو......"

اففف۔

وہ بھلا کیا ڈرامے دیکھتی تھی جو ڈرامہ اس نے کیا تھا۔ وہ تو اس کی کمال اداکاری پر انگشت بدنداں ہی رہ گئی۔ تائی فاخرہ نے اپنی لاڈلی کو تیکھے چتونوں سے دیکھا۔

"کبھی تو عقل سے کام لیا کرو۔ وہ بے چارا تمہاری خاطر کتنی دور سے یہ سب لے کر آیا ہے۔ اور تم نے کیا حال کیا ہے اس کا۔ اتنا سوہنا لگ رہا تھا ان کپڑوں میں۔ تم نے تو ستیاناس ہی مار دیا۔ ہائے اس کی نوی نکور شرٹ پر داغ پڑ جائیں گے۔ چل جلدی سے صاف کر۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مارتی بڑبڑاتی واپس چل دیں۔ ارباز لپک کر تولیہ لے آیا تھا۔ وہ ابھی تک سکتے میں تھی۔ وہاج نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔ اور اشارے سے اپنی شرٹ صاف کرنے کا کہا۔

"تت...... تم...... مکار...... عیار...... چالاک آدمی۔ تمہیں تو میں چھوڑوں گی نہیں۔" وہ غصے سے بل کھاتی، غراتی اس پر جھپٹی تھی۔ اس نے اپنا کامیاب بچاؤ کرتے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ہائے صدقے۔ میں بھی تو یہی چاہتا ہوں۔ تم مجھے کبھی نہ چھوڑو۔ اس دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک میرے ساتھ چلو۔ میرے سنگ جیو۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"کبھی معاف نہیں کروں گی تمہیں۔۔ کبھی نہیں۔"

"مت کرنا۔ مجھے تم سے ایسی کوئی امید ہے بھی نہیں۔ بس ایسی ہی رہنا۔ مجھے ایسے ہی اچھی لگتی ہو۔" وہ پوری جان سے سلگی۔ اس سے کچھ کہنے کا مطلب اسے اور شہہ دینا تھا۔ کیسے بتاتی کہ ابھی گزرے ایک پل میں اس پر کیا بیتی۔ اگر سچ میں اسے کچھ ہو جاتا تو......اوہ۔ وہ جھرجھری لے کر رہ گئی۔

اس "معصوم" سے نظر ملانے کی تاب نہیں رہی تھی۔ تولیہ کھینچ کر شرٹ صاف کرنے لگی۔ اور پہلی بار اس کی لانبی پلکیں وہاج کریم داد کے سامنے تھرتھرائی تھیں وہ اس ادا پر نہال ہی تو ہو گیا۔

"اونہوں۔ رہنے دو میں شرٹ بدل لیتا ہوں۔ تم جلدی سے کھانا لگاؤ۔ اور وہ برائیڈل ڈریس میں دھوپ میں سکھانے کے لیے لے کر نہیں لے کر آیا۔ اور اب تمہارے پاس صرف ایک گھنٹے کا ٹائم ہے۔ جلدی سے ریڈی ہو جاؤ۔ ہمیں زندگی کے خوب صورت سفر پر جانا ہے۔ جہاں......" وہ پھر سے ڈائیلاگ بازی شروع کرنے کو تھا جبکہ وہ مدت وقت سن کر بوکھلا گئی۔ دوسروں کی شادی پر کئی دن پہلے سے تیاری کرنے والی کو اپنے لیے وقت مل رہا تھا تو کتنا۔ بے ساختہ ہی منہ سے نکلا۔

"کیا صرف ایک گھنٹے کا ٹائم۔ اتنے قلیل وقت میں کیا تیاری ہو گی مجھے تو......"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ ایک گھنٹے کا مطلب ہوتا ہے۔ ون او کلاک۔ بس اسی میں جو کرنا ہے کرو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔ ورنہ اس سے کے بعد میں اٹھا کے لے جاؤں گا۔ اور اسے صرف دھمکی مت سمجھنا۔ تو چلو تمہارا ٹائم شروع ہوتا ہے اب سے......"

وہ کلائی موڑ کر گھڑی دیکھتا باہر کو چل دیا تھا۔ پیچھے وہ پیر پٹختی بڑبڑائے گئی۔

"افوہ۔ صرف ایک گھنٹہ۔ یعنی ساٹھ منٹ۔ مجھے کھانا بھی لگانا ہے۔ تیار بھی ہونا ہے۔ حد ہو گئی میرے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہے کیا۔ جو پلک جھپکتے میں حکم بجا لاؤں۔ اگر ایسے ہے تو ایسے ہی سہی۔ میں بھی ایسا تیار ہوؤں گی تا کہ لاٹ صاحب کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے۔ یاد رہے گا ہمیشہ کس سے پالا پڑا تھا۔"

پھولتے ہاتھ پیر، دھڑ دھڑ کرتا دل اور خطا ہوتے اوسان لیے وہ جھنجھلائی بڑبڑائے جا رہی تھی۔



انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر ''آفیشل پیج'' کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

نزہت بخاری

وہ نازنین

عبدالواسع کوئٹہ میں وکالت کی تعلیم حاصل کررہا ہے۔ اپنے باغ کے حصول نے واسع کو وکالت کی طرف مائل کیا ہے۔ واسع کی بہن رباب پھوپھی زاد نصیر سے محبت کرتی ہے، لیکن گلشن پھپھو دونوں کی شادی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ ان کے ہاں بناوٹے سٹے کے شادیاں نہیں کی جاتی تھیں۔ سیف اور نغمہ کی شادی کو چھ برس بیت چکے ہیں لیکن ان کی کبھی ایک دوسرے سے نہیں بنی۔ پشمینہ سیف کی بہن ہے، وہ رئیس کی بچپن کی منگ تھی لیکن چھ برس پہلے ایک واقعے نے ان کے راستے ہمیشہ کے لیے جدا کردیے تھے۔ نازنین کوئٹہ شہر میں اپنے بابا کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے بابا کسی بیوہ عورت سے چوری چھپے شادی کرچکے ہیں اور اس کا رشتہ اپنے ایک رنڈوے دوست کے ساتھ طے کردیتے ہیں۔ نازنین عین نکاح کے وقت شادی سے انکار کردیتی ہے۔ دولہا والے دلہن کو زبردستی اٹھالے جاتے ہیں۔ ادھر واسع کوئٹہ سے گھر واپس جارہا ہے۔ بس میں ایک مسافر لڑکی تمام راستہ روتی ہوئی ملی، واسع کو شبہ گزرا کہ اس کی ساتھی عورت اسے اغوا کرکے لے جارہی ہے لیکن وہ اس کی کوئی مدد نہیں کرپایا۔ اگلے روز اسے اپنے کمرے میں اچانک سامنے پاکر واسع کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ معلوم ہوا وہ لڑکی اس کے چچازاد سیف اللہ کی سالی نازنین ہے اور اب یہیں رہنے والی ہے۔ نازنین کو اس کی بہن نغمہ نے مصیبت سے نکالا تھا۔

اب آگے پڑھیے۔

بارہویں اور آخری قسط



ناولٹ



''ہم معافی چاہتے ہیں۔ آپ کے مریض کی جان ہم نہیں بچا پائے۔'' ڈاکٹر نے نہایت تکلیف سے الفاظ ادا کرتے سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا

''آپ انہیں بہت دیر سے لائے تھے۔''

''نن...... نہیں...... نہیں......'' ساتھ کھڑی ایک خاتون پیچھے ہٹتے اب خوف زدہ نظروں سے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ ساتھ ایک بڑی عمر کا مرد بھی تھا جس نے یہ افسوس ناک خبر سن کر دکھ سے سر جھکا لیا تھا۔ سب کے چہروں پر ایک درد بھری بے بسی تھی۔ پچھتاوؤں اور ندامت سے بھری یہ چپ اب اس قیمتی جان کو واپس نہیں لا سکتی تھی۔ وہ جس کے چلے جانے میں کہیں نہ کہیں وہ سب ذمہ دار تھے۔

یوسف خان نے جیب سے موبائل نکال کر ایک نمبر ڈائل کیا اور موبائل کان سے لگایا۔

''اااایک...... بری خبر ہے جبار بھائی...... شبنم بیٹی اب ہم میں نہیں رہی۔''

''کیا؟''

''جسم میں مردہ بچے کی وجہ سے زہر پھیل گیا تھا۔ صص...... صبر سے کام لیں......'' وہ لب چباتے اس سے زیادہ نہیں بول پائے۔ جھٹکے سے موبائل کان سے ہٹایا۔ اس گھر میں اٹھنے والے کہرام کے محض تصور سے ہی ان کے بدن میں خوف کی جھرجھری دوڑ گئی۔ ماں، بہن، باپ بھائی کے چہرے تصور میں پھرنے لگے۔

''ایمبولینس بلوا لیں؟'' زوہیب نے ڈاکٹر کی آواز پر روتی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

''آپ باڈی کو لے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ رپورٹ تیار کر رہی ہیں۔ آپ چاہیں تو بعد میں بھی آ کر لے جا سکتے ہیں۔'' وہ ایک نرس تھی جو نظریں جھکائے بجھے دل سے انہیں تفصیل بتا رہی تھی۔ اور زوہیب کو لگا اس کے اندر ایک خالی پن کا صحرا آباد ہو رہا ہے۔ شاید ہمیشہ کے لیے۔ آنے والے بچے کی قلقاریوں کو محسوس کرتے یہ وہ کس بیابان میں آ کھڑا ہوا تھا۔ جہاں اب نہ بچے کی امید تھی اور نہ بچے کی خوشی سے معمور اپنا نور بھرا چہرا لیے اس کی شبنم۔ وہ خالی ہاتھ خالی دل لیے تھکے قدموں سے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

''واسع کی بائیک کو حادثہ پیش آیا ہے بابا جان۔'' سیف گھبرایا ہوا ساڈیرے کے بڑے کمرے میں داخل ہوا تو آنکھیں خوف سے پھٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر حواس باختگی۔ عبدالرحمٰن بھی گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے

''کب...... کہاں...... کیسا ہے واسع؟'' اگلی کوئی بھی خبر سننے کے خوف نے ان کا سارا وجود لرزا دیا تھا۔

''کچھ پتا نہیں۔ مجھے وہ خانزادہ کے پٹرول پمپ سے کال آئی ہے ابھی ابھی، وہاں علیم گل ہوتا ہے میرا دوست ہے۔ اسی نے واسع کو پہچان کر مجھے کال کی۔ واسع کو انہوں نے ہی ہاسپٹل پہنچایا ٹکر مارنے والا ٹرک ڈرائیور بھاگ نکلا۔''

''لیکن واسع کیسا ہے۔ اسے کہاں چوٹ آئی؟'' عبدالرحمٰن کا دل ڈوب رہا تھا۔ بڑھتی عمر نے اعصابی طور پر انہیں بے حد کمزور کر دیا تھا۔ فی الحال ان کے لیے کھڑا ہونا بھی مشکل تھا

''معلوم نہیں بابا! مجھے فوراً نکلنا ہے۔ آپ بس دعا کریں۔'' وہ اپنی جیپ کی چابی اٹھا کر الٹے پیروں واپس لپکا۔ ذہن اب کئی اطراف میں گردش کر رہا تھا۔ جمیلہ چاچی کے گھر اطلاع دینا تو اب بابا کا کام تھا۔ اسے ہاسپٹل پہنچنے کی فکر تھی۔ بڑی گاڑی ڈرائیور قلعہ عبداللہ کی سائیڈ پر لے گیا تھا۔ اور وہ خود کو کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ اتنی دور شہر تک ڈرائیونگ کے قابل محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ ڈیرے کے بڑے گیٹ سے جیپ نکال رہا تھا جب چوکیدار شہباز اندر سے بھاگتا ہوا قریب آیا اور کچھ بڑے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ پہ رکھی جو یقیناً اس کے بابا نے بھیجے

تھے۔ اسے واقعی رقم ساتھ رکھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ وہ باہر نکل کر جیپ کو گلی سے نکال رہا تھا جب نظر گھر کے دروازے سے باہر نکلتے رئیس پر پڑی۔ سیف کو دیکھتے ہی جس نے حسب معمول نظریں چرائی تھیں۔ ان کے خاندان کا تو آپس میں نہ میل جول تھا نہ سلام دعا۔ اور پچھلے دنوں والے قصے کے بعد تو۔

"رئیس۔ مڑے جلدی آؤ ادھر۔" اس نے دھول اڑاتی جیپ عین اس کے سر پر روکی، وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا

"واسع کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، شہر جانا ہے، میرے ہاتھ کام نہیں کر رہے۔ جیپ چلا لو گے؟" سیف نے اسے صورتحال سے آگاہ کرنے کے لیے بھی عجلت سے کام لیا۔ ضائع کرنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔

"جی جی۔ ہٹیں۔ میں چلتا ہوں ساتھ۔" رئیس ایسی پریشان کن خبر سن کر بھی بجائے ردعمل دینے کے فوری طور پر مستعد ہوا۔ سیف ڈرائیونگ سیٹ سے دوسری پر منتقل ہوا اور رئیس نے جیپ اسٹارٹ کر کے تیزی کے ساتھ گلی سے نکال کر روڈ کو جاتے راستے پر ڈالی۔

"کیا ہوا واسع لالہ کو؟" رئیس نے اب ساتھ ساتھ جاننے کی کوشش کی اور سیف نے اسے بھی اب تک کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ سیف کے موبائل پر کسی کی کال آ رہی تھی۔ رئیس نے دل ہی دل میں واسع کی خیریت اور سلامتی کی دعا کرتے توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کی۔

"کیا؟" سیف کی چیختی سی آواز بلند ہوئی۔

"نہیں...... کب...... کیا ہوا تھا اسے؟"

"یا اللہ خیر۔" اسٹیئرنگ رئیس کے ہاتھوں میں ڈانواں ڈول ہوا۔ اللہ خبر کیا ہو چکا تھا۔

"خدایا۔" موبائل لڑھک کر سیف کی گود میں گرا۔ رئیس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ایک سوالیہ نظر سیف پر ڈالی۔

"شبنم کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" سیف نے ایک گہری آہ بھری۔

"یا اللہ۔ یہ کیسی کیسی خبریں آ رہی تھیں۔ ایک شاکنگ نیوز سے تو پوری طرح نمٹ نہیں پائے تھے۔ پردیس میں معلوم نہیں اس غریب کے ساتھ کیا ہوا تھا۔" رئیس نے سر جھٹک کر نم آنکھوں کا پانی پیا۔ سیف لالہ کی الگ حالت خراب تھی۔ دونوں سے کچھ بھی بولا نہیں گیا۔

شبنم کی اطلاع یقیناً آکا جان کو بھی مل چکی تھی لیکن انہوں نے سیف کی موجودہ پریشانی کو دیکھتے بتانا مناسب نہیں سمجھا لیکن یہاں تو اب ہر کسی کو پتا چل چکا تھا۔ سیف کو خبر خلیل پھوپھا کی طرف سے ملی۔ وہ سر ہاتھوں میں دیئے بے جان سا بیٹھا تھا۔ جیپ شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ رئیس نے اپنا دھیان واسع کی جانب لگائے تیز رفتاری سے رخ ہاسپٹل کی جانب کیا۔ اس دعا کے ساتھ کہ کاش یہاں خوشی کی خبر ان کی منتظر ہو۔

☆☆☆

نیلم کو ہوش آیا تو گھر رونے دھونے اور بین کرنے کی آوازوں سے لرز رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر اکیلی چت لیٹی تھی۔ آوازیں باہر سے آ رہی تھیں، وہ اپنا چکراتا سر ہاتھوں میں تھام کر لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی، بمشکل خود کو سنبھالتے دروازے تک آئی تو منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لاؤنج بے شمار روتی ہوئی عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور۔ اس کی اماں۔۔ وہ رانیں پیٹتے دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔۔ نیلم کو بے ہوشی سے پہلے کی باتیں یاد آئیں۔ واسع کا حادثہ، اس کی چیخ اور...... اس کے بعد یہ سب۔ واسع کی وجہ سے یہاں اس کے گھر میں۔ تو کیا وہ نہیں رہا تھا۔ نیلم نے چوکھٹ کو تھاما، تب ہی کچھ عورتوں کی نظر اس پر پڑی تو بھاگ کر آئیں اور اس سے لپٹ گئیں۔

"ہائے نیلم...... تیری بہن...... ہائے ہائے بھری جوانی میں دنیا چھوڑ گئی۔"

"نیلم......" نگار بے تحاشا اپنا منہ پیٹتی چیخیں مارتی نیلم کی طرف بھاگی۔

''ہائے میری شبنم۔ وئی خدایا مجھے اٹھا لیتا۔ ہائے میری بچی۔'' وہ زبردستی نیلم کے گلے لگ چکی تھیں۔ اور نیلم کو جو سمجھ میں آیا وہ کلیجہ چیر دینے کو کافی تھا۔ وہ بے یقین تھی۔ کچھ پوچھنا چاہتی تھی، اس نے منہ کھول کر اماں کہنا چاہا لیکن بولنے کے لیے ہونٹ کھلے تو ضرور البتہ بہت زور لگانے پر بھی آواز نہیں نکل سکی۔

نیلم نے پھر پوری طاقت سے اماں کہنا چاہا لیکن اس بار بھی لب ہل کر رہ گئے۔ وہ اب مارے گھبراہٹ کے پورا زور لگا کر حلق سے آواز نکالنے میں کوشاں تھی لیکن سوائے گھٹن بھری سانسوں کے کچھ نکل نہیں پایا۔

''نیلم تیری بہن ہمیں چھوڑ گئی۔ وہ ہم میں نہیں رہی۔'' ایک عورت معلوم نہیں افسوس کر رہی تھی یا اسے بتا رہی تھی۔ پر نیلم بیک وقت تین، صدموں سے نڈھال ہوتے ایک مرتبہ پھر زمین بوس ہو چکی تھی۔ واسع کے متعلق کچھ پتا نہیں چل پایا تھا۔ یا جی چل بسی تھی اور وہ...... وہ اب شاید بول نہیں سکتی تھی۔ ایک دل دہلا دینے والی چیخ اندر کی ساری آوازوں کو ساتھ لیے اس سے روٹھ کر نجانے کن خلاؤں میں کھو گئی تھی۔

☆☆☆

واسع کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ہاسپٹل کے بیڈ پر پایا اور سامنے کھڑے سیف لالہ اور...... اور رئیس۔ وہ ان دو افراد کو ایک ساتھ اتنے قریب پا کر اپنے باہوش وحواس ہونے پر شبے میں پڑ گیا۔ اور اس کی حالت۔ اسے اپنے ساتھ بیتا واقعہ یاد آنے لگا۔ مطلب دماغ تو صحیح کام کر رہا تھا۔ ایک جنگلی جانور جیسا بے قابو ٹرک بالکل ہی اچانک بائیں ہاتھ کے روڈ سے عین اس کے سر پر پہنچتے بجائے اس کو بچانے یا بچنے کی مہلت دینے کے اس پر چڑھ دوڑا تھا۔ لیکن قسمت نے کچھ یوں واسع کا ساتھ دیا کہ ٹرک کی پہلی زوردار ٹکر سے وہ اُچھل کر سڑک کنارے کی جھاڑیوں پہ جا گرا تھا اور ارادے تو ٹرک ڈرائیور کے بھی کچھ اچھے معلوم نہ ہوتے تھے، اس نے سڑک پر سیدھا ہوتے ہی ٹرک کی باڈی کے پچھلے حصے کو بیک پر لے جاتے جھاڑیوں پر چڑھانے کی کوشش کی تاکہ رہی سہی کسر بھی پوری کر دی جائے لیکن سامنے والے پٹرول پمپ سے کچھ لوگ شور مچاتے اس طرف کو دوڑے تو ٹرک ڈرائیور اپنی جان بچانے کے لیے فوراً بھاگ نکلا، ادھر واسع کو دوسری ہلکی ٹکر نے جھاڑیوں سے نیچے لڑھکایا تو وہ سڑک سے قریب چار، پانچ فٹ نیچے سخت پتھریلی زمین پر آ رہا۔ حادثے کے اعصابی دباؤ اور جسم کے شدید درد نے ہوش سے بیگانہ کیا اور پھر اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اور اب ہوش میں آنے کے بعد وہ جان لینا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کچھ ہو چکا تھا۔

''تم اب ٹھیک ہو واسع! پریشان نہ ہو، ٹانگوں پر کچھ زخم آئے ہیں۔ شکر ہے اللہ پاک کا سر کسی قسم کی چوٹ لگنے سے بالکل محفوظ رہا۔'' سیف نے جھک کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگ رہا تھا وہ روئے بھی ہیں۔

''شکر ہے لالہ، آپ کو کچھ نہیں ہوا۔'' رئیس نے اس کے ماتھے سے بال ہٹاتے جھک کر اس کا چہرا دیکھا اور بیڈ کے کنارے پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''سیف لالہ بہت پریشان ہو گئے تھے۔ ڈرائیو کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔''

''محبت ہے ان کی۔'' وہ سیف کو دیکھ کر مسکرایا لیکن سیف کے چہرے پر گہری فکر کے سایے تھے۔ واسع کی جان تو بچ گئی تھی لیکن ادھر خاندان ایک کتنے بڑے دکھ سے دوچار ہو چکا تھا۔

''گھر سے کال آ رہی ہے۔'' سیف اللہ نے انہیں بتاتے ہوئے موبائل آن کر کے کان سے لگایا۔

''جی بابا جان۔ واسع اب ماشاء اللہ کافی بہتر ہے۔ ہوش میں بھی آ گیا ہے۔ آپ جمیلہ چاچی کو بتا دیں۔ گھر میں سب پریشان ہوں گے۔''

"ہوں۔" باپ کی بات سن کر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ "میں ڈاکٹر سے پتا کرتا ہوں۔ واسع کی حالت ویسے اچھی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر ڈسچارج کر دے گا۔ ہوں اچھا۔ امید ہے ہم پہنچ جائیں گے۔" اگلی بات سیف نے نہایت دکھی دل سے سنی۔ شبنم کا تین بجے جنازہ تھا۔ اسے اپنے گاؤں لایا جا رہا تھا۔ میت وہاں سے روانہ ہو رہی تھی۔ سیف نے واسع کی طبیعت دیکھتے کھل کر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کال آف کر کے ڈاکٹر سے ملنے چلا گیا۔

واسع کی چوٹوں کو دیکھتے وہ بھی یہی چاہ رہا تھا کہ اسے ساتھ ہی گھر لے جایا جائے۔ بشرطیکہ ڈاکٹر اجازت دے دیں۔ رئیس نے بھی سیف لالہ کی بات تو سمجھ لی لیکن فی الحال یہاں تبصرہ مناسب نہیں سمجھا۔ دل البتہ تکلیف سے بھر گیا تھا۔ معلوم نہیں شبنم باجی کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اور وہاں گاؤں میں اس وقت کیا سچوئشن تھی۔ وہ بس تکلیف بھری ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔

☆☆☆

اسکرین پر جلتا بجھتا "شہزادہ کالنگ" دیکھتے ہی ذکی کے ہاتھ سے موبائل فون چھوٹ کر گرا۔ پھٹی آنکھوں اور دہشت زدہ چہرے کے ساتھ وہ نیچے گرے موبائل کے تین حصوں کو دیکھتے منہ پہ ہاتھ رکھے اپنی ہی چیخ کا گلا گھونٹتے پیچھے کو ہٹتے دیوار سے جا لگا تھا۔

شہزادے نے اپنا کام کیا تھا یا نہیں۔ قدرت نے اپنا کام کر دیا تھا۔

جبار نے کپکپاتے لرزتے ہاتھوں سے لاکر میں چابی گھمائی۔ شبنم کی میت گھر پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے تدفین کے انتظامات کے لیے لاکر کھولا تو نظر نوٹوں کی اس گڈی پر پڑی جو واسع کا کام تمام ہونے کے بعد شہزادہ نامی قاتل کو دینی تھی۔ وہ ایک بیوہ کے گھر کا چراغ بجھانے چلے تھے۔ ان کے مرحوم بھائی کا یتیم بیٹا عبدالواسع۔ جبار کو لاکر آج سے پہلے یہ شناخت نہ کبھی ان کے ذہن میں کوئی درد پیدا کر سکی تھی نہ ہی اسے وہ یاد رکھنا چاہتے تھے۔ پر آج......

آج ان کی معصوم بچی۔ ان کی بے قصور بیٹی۔ انہوں نے واسع کو سچی قسم کے جھوٹے عذاب کی بھینٹ چڑھانا چاہا تھا اور قدرت نے جھوٹ سچ کا طمانچہ کس طاقت سے ان کے منہ پہ لا مارا تھا۔ جبار پاگلوں کی طرح لاکر کے مضبوط دروازے سے سر پٹخ کر دھاڑیں مارنے لگے۔ یہ کیا ہو گیا تھا۔ کیسے اس وقت کو واپس موڑیں۔ کیسے اپنے ضمیر کی آواز پر کان دھریں۔ کاش یہ وقت بس ایک بار پلٹ سکتا۔ انہیں اپنی شبنم کسی بھی قیمت پر واپس چاہیے تھی۔

"شبنم۔" وہ اوپر دیکھتے زور سے پکار اٹھے۔ کاش میں نے نگار کی بات سن لی ہوتی۔ کاش ہم نے صرف دولت کا ڈھیر نہ دیکھا ہوتا۔ ان کی عقل سمجھ کو بھی پرکھ لیا ہوتا۔۔ کاش......!

☆☆☆

شبنم کا سوئم ہو چکا تھا۔ واسع کچھ دیر پہلے ہی جبار چاچا کے ہاں سے گھر واپس آیا تھا۔ راہداری سے گزرتے نادانستہ نگاہ قد آدم آئینے میں خود پر پڑی تو وہیں رک گیا۔ حیرت بھری نظروں سے خود کو سر سے پیر تک دیکھتے اس نے بے ساختہ اوپر دیکھا تھا۔ ذہن میں جب جب بھی اس بھیانک حادثے کی فلم چلی اس نے رک کر ٹھہر کر بے ساختہ اپنے رب کا شکر ادا کیا تھا۔

کسی عفریت اور بلا جیسا تیز رفتار ٹرک جب بائیک کے اگلے پہیے سے ٹکرایا تو اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے فضا میں معلق ہوتے کلمہ بھی پڑھ ڈالا تھا۔ لیکن اوپر کو اٹھتے وجود کا رخ بجائے سامنے کے بائیں ہاتھ کو ہونا سوائے ایک معجزے اور اللہ کی مدد کے کچھ نہ تھا۔ اور پھر گھنی جھاڑیوں پر جا گرنا۔ وہ ایک بار پھر اپنے ہاتھوں بازوؤں، گردن اور چہرے کو دیکھتے تعجب میں پڑ گیا۔ نہ کوئی گہرا زخم نہ کوئی بڑی چوٹ، چند ایک معمولی خراشیں وہ بھی ٹانگوں اور پیٹھ پر آئی تھیں جو بظاہر کسی کو دکھائی نہ دے سکتی تھیں۔

اوپر سے عین اسی وقت شبنم کی موت کی دل دہلا دینے والی خبر کے باعث کسی کو علم تک نہ ہوسکا کہ واسع کے ساتھ کوئی حادثہ بھی پیش آیا ہے۔ وہ حادثہ جو واسع جانتا تھا کہ ہوا نہیں بلکہ کروایا گیا ہے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شہزادہ نامی مطلوب قاتل کو بحیثیت وکیل وہ خوب اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اور پھر نیلم کی کال، بائیک روکنے کی تنبیہ نے یہ تجسس بھی ختم کر دیا کہ قتل کی سازش کے پیچھے کس کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ہاں لیکن نیلم۔ واسع نے ایک درد بھری آہ بھری۔ ایک ہولناک چیخ ہمیشہ کے لیے اس کی آواز کا گلا گھونٹتے اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

اوائل اپریل کی اس معتدل خوش گوار سی صبح میں نازنین اپنے بابا کے ساتھ بس اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ آج وہ کئی ماہ بعد واپس مسلم باغ جا رہی تھی۔ شبنم کی وفات اور واسع کے حادثے کے بعد درمیان میں ٹھہرا ہوا طویل، اداس سا سرما گزرا تھا۔ برف کی سوغات ساتھ لانے والے معمول سے کہیں زیادہ ٹھٹھرے ہوئے سرما نے سب کو گھروں میں محصور ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

کوئٹہ جانے کا پروگرام تو اگرچہ وہ پہلے ہی بنا چکی تھی۔ شبنم کی وفات نے جب سارے رواں دواں سسٹم کو ایک دم جامد کر دیا تو وہ اس رکے، مزید اداس کر دینے والے ماحول سے باہر نکل آئی۔ کوئٹہ میں اس کا زیادہ وقت خالہ گل حبیبہ کے ہاں گزرا تھا۔ بابا تو خود اپنی دوسری بیوی کے گھر میں رہتے تھے۔ نازنین ہفتے بھر کے بعد بس ایک آدھ دن کے لیے ہی وہاں کا چکر لگا آتی۔ اس نئے اور پرائے گھر میں باپ کے گھر جیسی اپنائیت نہیں تھی۔ وہ بس ان کا دل رکھنے کو ہو آتی اور اپنی بیوی کی وجہ سے وہ بھی اسے زیادہ مجبور نہیں کرتے تھے۔ اللہ نے بہر حال ان کی دعا سن لی تھی۔ ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی تھی۔ وہ بھی وارث پا کر بہت خوش تھے۔

اور آج گاؤں ایک بہت اہم موقع پر اسے بلایا گیا تھا۔ اسی لیے بابا اسے چھوڑنے جا رہے تھے۔

دونوں بس میں بیٹھ چکے تھے۔ سفر آغاز ہو چکا تھا۔ کھڑکی سے باہر بہار کے خوب صورت مناظر دیکھتے اس کے چہرے پر آسودگی، لبوں پر مسکان اور آنکھوں میں ایک گدگداتا سا انتظار تھا۔ انتظار گاؤں پہنچنے کا، آنے والے حسین وقت کا، واسع کے ساتھ کا۔ اس راستے کی کشش ایک بہت خوبصورت منزل کا پتا تھی جہاں کوئی بہت شدت سے اس کا منتظر تھا۔

کبھی وہ جن پتھروں پہاڑوں میں رہنے والوں کے پتھر دلوں سے خائف تھی، اب ان کے اندر جھانک کر ان کی شفاف چشموں جیسی نیت کو پا چکی تھی۔ یہاں محض دلدار ہی نہیں ملا تھا۔ بھائی، بہنوں، ماں باپ، دوستوں اور رشتہ داروں کے ہر رشتے کی کمی پوری ہوئی تھی۔ شبنم کی وفات کو چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ آکا جان نے اس کے بابا کو کال کر کے گاؤں واپس بلایا تھا۔ آمنے سامنے بیٹھ کر ان کی ہر غلط فہمی دور کی تھی۔ بابا کا دل اس کی طرف سے صاف ہوا تو وہ اسے ساتھ لے جانے کو تیار ہو گئے۔

یہاں بھی شبنم کی موت کے بعد ہر کوئی بہت غم زدہ بہت اداس تھا۔ وہ بھی بجھا دل لیے ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئی۔ البتہ جانے سے پہلے جمیلہ چاچی نے اس کے بابا سے رشتے کی بات بھی کر لی تھی اور انہوں نے بھی جواباً ہامی بھر لی کیونکہ نغمہ اور عبدالرحمٰن واسع کے متعلق اپنی پسندیدگی کا عندیہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ کسی باقاعدہ رسم وغیرہ کا چونکہ ماحول نہیں تھا تو بڑوں کی آپس کی بات کو ہی کافی سمجھا گیا۔

اور اب تقریباً چھ ماہ کے بعد وہ دوبارہ گاؤں جا رہی تھی۔ اور وہ بھی ایک بہت خاص موقع پر۔ کیونکہ پھولوں کے اس موسم میں چار چاند لگانے کے لیے نصیر اور رباب کی شادی طے کی گئی تھی۔ اور وہ نصیر کی منہ بولی بہن اور رباب کی ہونے والی بھابی کی حیثیت سے وہاں ایک بہت خاص مہمان تھی۔ سرما گزرنے پر جمود کی کیفیت میں حقیقتاً بدلاؤ آیا

تھا۔ خصوصاً پچھلے ایک ماہ کے دوران وہاں کئی بڑی بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ مارچ کی آمد ہوئی تو سب سے پہلے اکا جان نے خاندان کا جرگہ بلا کر بدلئی کی رسم کو ختم کرنے کا باقاعدہ اعلان کیا تھا اور اسی جرگے میں چھوٹے بھائی مجیب اللہ کے ساتھ اپنے پرانے اختلافات کے خاتمے کا اعلان کرتے صلح کرلی۔

قرآن پر ہاتھ رکھ کر قتل کی کھائی گئی قسموں کا بیل اور اونٹ ذبح کر کے کفارہ ادا کیا گیا۔ اور پھر صلح ہو جانے کے بعد سلطانہ چاچی اور مجیب چاچا پشمینہ کے لیے رئیس کا رشتہ لائے جسے برسوں پہلے توڑ دیا گیا تھا۔ اور صلح ہونے پر دوبارہ بحال کر دیا گیا۔ اسفند اور زمرد کے رشتے کا معاملہ بھی شبنم کی موت کے باعث التوا میں چلا گیا تھا اسے بھی قبول کر لیا گیا۔ خاندان میں کچھ مہینہ بھر ہی ہوا کہ خوشیوں کی لہر سی آگئی تھی۔ اور سب ان خوشیوں کے دیرپا ہونے کے لیے دعا گو تھے۔

نازنین کا دل بھی خوشی کی خبریں سنتے سب سے ملنے کو بے چین ہونے لگا۔ دنوں وہ محض تصور کر کے ہی شاد رہی کہ رئیس سے منگنی بحال ہونے کے بعد پشمینہ کیسی خوش لگا کرتی ہوگی۔ اور پھر رباب۔ اسے اس کے بچپن کا پیار اس کی زندگی کی پہلی اور آخری خواہش اس کا نصیب مل رہا تھا۔ اور زمرد۔ نازنین لمحے کو رکی پھر سر جھٹک کر ہنس دی۔

رباب نے آنے سے پہلے معذرت کر کے یہ وضاحت بھی کردی کہ زمرد کی واسع میں دلچسپی سے متعلق اس نے غلط بیانی کی تھی۔ وہ اسفند کا رشتہ آنے پر بہت خوش تھی۔ واسع کے متعلق اس کے دل میں کبھی ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔ بلکہ اگر یہ سچ ہوتا تو نازنین کبھی بھی واسع کے ملنے کی خوشی کو پوری طرح محسوس نہ کر پاتی، اسے چھین لینے سے خوف آتا تھا۔

''یااللہ۔ گاؤں میں واپس لوٹ آئی یہ خوشیاں یونہی قائم و دائم رہیں آمین۔'' برقع کے اندر ہی اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر اللہ پاک سے دعا کی۔

اور گاؤں کی خوشیاں تو یقیناً لوٹ ہی آئی تھیں۔ لیکن نہیں گئے تھے تو عبدالجبار کے گھر میں پھیلے رنج و الم کے سائے اور دیر سے پھیلی سکوت بھری خاموشی۔

☆☆☆

زندگی بھر عذاب سہنے کو
دل ملا ہے اداس رہنے کو
ایک چپ کے ہزار ہا مفہوم
اور کیا رہ گیا ہے کہنے کو

نرگس یہاں کا علاقائی پھول نہ تھا، لیکن ان کے ہاں تقریباً ہر کیاری اور گملے میں خصوصاً منگوا کر لگایا گیا تھا کیونکہ شبنم کو نرگس آپی سے عشق تھا۔ وہ دیر تک اس کو ناک سے لگائے اس کی سحر پھونکتی خوشبو کو اپنے اندر اتارا کرتی۔ باغ کے انتہائی کونے میں گھاس پر بیٹھی نیلم اپنے اٹھے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے کیاری میں تازہ کھلے نرگس کے پھولوں کو دیکھ رہی تھی۔

کبھی سنا تھا نرگس قبرستانوں کا پھول ہوتا ہے۔ اور آج۔ معلوم نہیں شبنم کی قبر پر وہ پھول کھلا تھا یا نہیں۔ پر ان کے گھر کی قبرستان جیسی ویرانی میں چہار سو نرگس کی مہک تھی۔ نیلم نے کچھ دیر پہلے ہی اس کی لمبی لمبی شاخوں کو توڑ کر ایک گلدستہ بنایا تھا۔ سوچا ذکی سے کہے گی شبنم کی قبر پر رکھ آئے گا۔ اور پھر گلدستہ بنا کر وہ خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ باتیں تو رہی نہیں تھیں کہ کسی دوسرے کی کمی محسوس ہوتی، اب تو بس وہ تھی یا اس کی سوچیں۔ اور آج دل کے ساتھ ساتھ سوچوں میں بھی وہ بسا تھا جو پچھلے روز یہاں آیا تھا بڑے دنوں کے بعد ان کے گھر۔ مسکرا کر اسے دیکھا اس کی خیریت پوچھی، لیکن جواب میں اماں اسے بڑے دکھ سے بتانے لگیں کہ کیسے بہن کی موت کی خبر چیخ بن کر اس کے حلق سے نکلتے ہمیشہ کے لیے اسے خاموش کر گئی تھی۔

نیلم اور واسع نے نگار کی اس بات پر بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا، اور یہ بات صرف وہی دو جانتے تھے کہ کون سی چیخ نیلم کی گویائی چھیننے کا سبب

بنی تھی۔ نیلم نے گھبرا کر نظر چرائی اور واسع اجازت لیتے اُٹھ کھڑا ہوا۔

”کسی بھی غیر متوقع اور صدماتی سی کیفیت میں ردعمل دینا ہمیشہ تو نہیں پر بہت کم بھی ایسے کسی حادثے کی بنیاد بن جایا کرتا ہے لیکن بہت امکان ہوتا ہے کہ آگے بھی دوسرا کوئی واقعہ معذوری کے ازالے کا باعث بھی بن جائے۔ میری دعا ہے وہ دوسرا واقعہ کسی صدمے تو نہیں البتہ کسی اچانک خوشی کے نتیجے میں ضرور وقوع پذیر ہو اور ہماری نیلم دوبارہ بولنے کے قابل ہو جائے۔“ واسع نے اپنا ہاتھ نیلم کے سر پہ رکھ کر دعا دی۔

نگار نے بے ساختہ ایک آہ بھر کر آمین کہا اور نیلم بھی لمبی سی سانس کھینچتے حال میں واپس آئی۔ وہ دعا دینے والا بھی اس کے بس ایک ہی درد کا رازدار تھا، کیونکہ پہلا درد تو اس کی اپنی تنہائیوں کا ساتھی تھا اور اس کی رازدار ہمیشہ سے وہ خود تھی۔

اسی وقت پورچ میں جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ فوراً گلدستہ ہاتھ میں لے کر اُٹھی۔ ذکی شاید کہیں باہر جا رہا تھا۔ وہ اسے گلدستہ دینے کے خیال سے ہاتھ ہلاتی ہوئی بھاگی لیکن ذکی براؤن سن گلاسز آنکھوں پر لگاتے جیپ باہر نکال لے گیا۔ جب نیلم دوڑتی ہوئی وہاں تک پہنچی تو وہ جیپ لے جا چکا تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑے گلدستے کو اداسی سے دیکھتے دل ہی دل میں شبنم سے معذرت کی۔ وہ اگر آواز دے پاتی تو ضرور ذکی کو روک لیتی اور گلدستہ اس کی بہن تک پہنچ جاتا۔

کمرے سے نکلتی نگار نے یہ منظر دیکھا تو تیزی سے نیلم کے پاس آئیں۔ ان کی بے زبان بچی دل کی بات دل میں لیے رہ گئی تھی۔ ضرور ذکی کی نظر نہیں پڑی ہوگی ورنہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ بہن کی اتنی معصوم سی فرمائش ٹال دیتا۔ وہ دکھی دل سے نیلم کو دیکھے ہی گئیں۔ ہمیشہ اس کے بولنے پر انہوں نے ہی سب سے زیادہ اسے ٹوکا تھا۔ بلاوجہ اس کے زیادہ بولنے پر برا بھلا کہا۔ اس کے بے وقت سچ ہمیشہ ہی انہیں کوفت میں مبتلا کر دیا کرتے تھے۔ وہ تو ان کے گھر کی رونق تھی۔۔۔ اس کی خاموشی گھر کے خالی پن کو مزید بڑھا دیتی۔

”بھائی نے دیکھا نہیں ہوگا۔“ انہوں نے پلکیں موند کر نیلم کو تسلی دی تو اس نے ہلکا سا سر ہلا دیا، حالانکہ سچ تو یہ تھا کہ ذکی، نیلم کے ہاتھ میں گلدستہ دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے شبنم کی قبر پر جانے کو کہے گی۔ اور فی الحال وہ بالکل اس نیت اور ارادے سے گھر سے نہیں نکلا تھا۔

آج تو باہر نکلنے کی وجہ بڑی دل آویز بڑی خوش کن تھی۔

سننے میں آیا تھا کہ نازنین آج مہینوں بعد واپس لوٹی تھی۔ مہینوں اس نے جس کی آمد کا انتظار کیا تھا، بالآخر رباب اور نصیر کی شادی اسے واپس کھینچ ہی لائی۔ سنا تو یہ بھی تھا کہ رباب نصیر کی شادی کے پندرہ دنوں بعد واسع اور نازنین کی شادی بھی طے تھی۔ ذکی آج کل خاندان کے ہر گھر میں کچھ زیادہ ہی ان تھا۔ بہن کی وفات کے بعد وہ کبھی گلشن پھوپھی تو کبھی سلطانہ چاچی کبھی شمیم چاچی تو کبھی مجیب چاچا، کبھی اکا جان کا ڈیرہ تو کبھی سیف لالہ کی بیٹھک۔ گھنٹوں گھنٹوں سر جھکائے مغموم صورت بنائے سب کی ہمدردیاں بٹور رہا تھا۔

واسع کا حادثہ ویسے بھی شبنم کی موت کی وجہ سے آیا گیا ہو چکا تھا۔ نازنین اور واسع کا گھاٹی والا اسکینڈل بھی اسے تقریباً بال بال بچا لے گیا تھا۔ پھر جنہیں شک گزرا تھا وہ بھی اس کی بہن کی جوان موت کے سبب بھلا دیا گیا۔ اور اب ایک ایک کے سامنے اپنی بے چارگی کی تصویر پیش کرتے وہ بھی ایک بالکل بدلا ہوا ذکاء اللہ تھا۔ جو غریب اور کم حیثیت رشتہ داروں کے ہاں جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔ اب دیر تک دادی، پھوپھی، چاچیوں کی خبر گیری کرتا دکھائی دیتا۔ اور ان سب حرکات کی وجہ سے وہ سب کی ہمدردیاں اور محبتیں بھی خوب خوب وصول کر رہا تھا۔

عبدالجبار اور نگار بھی مغرور اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والے مشہور تھے، پر شبنم کی موت نے سب کی نظر میں انہیں قابل رحم بنادیا تھا۔ اور اگر جبار یا نگار نے نہیں تو ذکی نے اس توجہ کا خوب خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ اکا جان کے گھر جانے کا اس کا واحد مقصد نازنین کی خبر رکھنا ہوتا تھا۔ وہ خود اگرچہ اب وہاں نہیں تھی لیکن باتوں باتوں میں بہت کچھ جاننے کا موقع مل جاتا۔ خاندان کے باقی تمام گھروں میں تو محض وہ خانہ پری کے لیے جاتا کہ اس کا یہاں آنا جانا کسی کو کھٹکے نہیں۔ خصوصاً اس واسع کو۔ جس پر اب تک کے وقت میں اس کے سب ہی وار خطا گئے تھے۔ اسی لیے اب وقت تھا اس جاگیر چھیننے والے کے دل کی جاگیر لوٹنے کا۔ کیونکہ یہ تیر تو ذکی کی آنکھوں میں نشتر بن کر ابھی تک چبھ رہا تھا۔

”تم واسع کی دلہن بن جاؤ نازنین۔ مجھے کب اعتراض ہے۔ لیکن کیا ہے ناجانم۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہوگا کہ عشق کی راہ آسان نہیں ہوتی۔“ لب دبا کر شرارت سے ہنستے اس نے موڑ کاٹا۔ ”تو پھر واسع اور تمہارے ایک ہونے کی راہ بھی سہل کیسے ہوسکتی ہے۔ کچھ کانٹے تو اس راہ میں بھی ضرور اُگے ہوں گے۔ تو دامن اگر کسی خار سے الجھ جائے اے نازنین تو ”تار تار“ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن تم گھبرانا نہیں۔ واسع بہت مہان ہے۔ پیوند لگے دامن کے ساتھ بھی اپنی محبت کو قبول کرنے کا ظرف رکھتا ہے۔ پھر یہ بھی تو عشق کا امتحان ہوا ناں۔ دیکھتے ہیں کتنا سچا ہے اپنے دعوے میں۔

اور میری مانو تو اس بے چارے کو ”کچھ“ بتا کر کسی امتحان میں ڈالنا ہی مت۔ پھر میں بھی شادی کے آڑے کہاں آرہا ہوں۔ ایک چھوٹی سی ملاقات اپنے ہارے ہوئے عاشق کے نام کردو، بدلے میں ذکی ہمیشہ کے لیے تمہیں یوں اپنے دشمن کے گھر بھیج دے گا جیسے کوئی جیت جانے والا اپنی ٹرافی voluntarily (دلی رضامندی سے) کسی ہارے ہوئے کے حوالے کردے۔ ہاہاہا۔“ وہ جیپ کو آبائی قبرستان کے کنارے والے کچے روڈ سے بھگاتے ہوئے نکال لے گیا۔ وہ شبنم کی قبر پر نرگس کے پھولوں کے بجائے اسے دھول اور غبار کی چادر اوڑھاتا کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے ابھی بہت، کام کرنا تھا۔ اور نصیر کی شادی میں دن بس چار ہی باقی بچے تھے۔

☆☆☆

”یار واسع۔ اب یہ کیا نیا ڈرامہ ہے؟“ نصیر دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اس کے ڈیرے والے آفس میں عین اس کے مقابل کھڑا تھا۔ گزرے چھ ماہ میں ڈیرے کا تو نقشہ ہی تبدیل ہوچکا تھا۔ واسع نے اپنی محنت سے سب ہی کمروں اور بڑے حجرے کی سجاوٹ مکمل کرلی تھی اور ایک کمرے کو آفس کے انداز میں ترتیب دے کر اب وہ شام کو گاؤں والوں کے مسائل بھی سنا کرتا۔ پچھلے چند دنوں سے البتہ شادی کی مصروفیت نے سر کھجانے جتنی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ اتنے بے شمار کام نمٹانے تھے کیونکہ صرف رباب کی ہی نہیں اپنی شادی بھی سر پر آپہنچی تھی۔ نصیر کا الگ برا حال تھا۔ ڈیوٹی سے سیدھا گاؤں آتا اور رات گئے تک یہاں کے کام نمٹا کر اگلی صبح پھر ژوب چلا جاتا۔ کیونکہ اسے شادی کے لیے بیس دن کی چھٹی ملی تھی جو پہلے فنکشن کے دن سے شروع ہونی تھی۔ اس لیے تب تک کے دن مارے باندھے وہ آجا کر پورے کر رہا تھا۔

”کون سا نیا ڈرامہ بھئی۔ کیا ہوگیا ہے۔ بیٹھو۔“ واسع نے کام چھوڑ کر بازو سر کے پیچھے باندھے۔

”یار وہ جبار ماما نے کوٹھی نہیں لی تھی ادھر کان مہترزئی میں۔“

”ہوں ہوں۔“ واسع بغور سے سننے لگا۔

”نگار مامی نے کہا ہے کہ ولیمے سے اگلے دن سب خواتین کی وہاں دعوت رکھی ہے۔“

”نگار چاچی نے کہا؟“ واسع کے ابرو بھی

استعجابیہ جڑ گئے۔

"ہاں، وہ کہہ رہی تھیں نیلم کی خواہش ہے کہ دولہا دلہن کی پہلی دعوت ان کی طرف سے ہو۔"

"تو تم کیوں چڑ رہے ہو۔"

"یار ہم نے ولیمے کی اگلی صبح سوات کے لیے نکلنا ہے۔ میں نے سوچا تھا یہ دعوتیں وغیرہ واپس آکر ہوجائیں گی۔ چھٹی بھی تو اتنی سی ہے۔"

"اچھا ایک آدھ دعوت سے کچھ نہیں ہوتا۔ نیلم کا دل بھی نہیں توڑ سکتے۔ تم جانتے تو ہو۔" واسع بات مکمل نہیں کرپایا۔ جب سے اس ہنستی کھلکھلاتی معصوم سی لڑکی کی گویائی گئی تھی، دل پر اس بات کے خیال سے بڑا دردناک دھکا لگتا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے لیکن یار یہ دعوت وغیرہ گھر پر بھی کی جاسکتی تھی۔ اتنی دور وہ بھی صرف خواتین۔" نصیر کی بے چینی ابھی تک رخصت نہیں ہوئی تھی۔

"بلاوجہ الجھ رہے ہو، کچھ نہیں ہوتا، جانے دو۔"

"کل ذکی، اماں کے ساتھ بیٹھا تھا تو اسی دعوت کے موضوع پر ہی بات ہورہی تھی۔ اماں کہہ رہی تھیں کہ شبنم کی وجہ سے وہ لوگ اگر کسی تقریب وغیرہ میں حصہ نہیں بھی لیں تو ہمیں کوئی گلہ یا شکایت نہیں ہوگی۔ اس لیے بلاوجہ دعوت وغیرہ کے تکلف میں نہ پڑیں۔ لیکن ذکی برابر قائل کرنے میں لگا رہا۔ کہہ رہا تھا نیلم خوش ہوگی وغیرہ، " نصیر نے ماتھا سکوڑا۔ "یار یہ ذکی جو نیک پارسا بننے کا ڈھونگ کررہا ہے نا کچھ عرصے سے۔ مجھ سے اب بالکل برداشت نہیں ہوتا۔"

"ہاہاہا۔" واسع اب اس کا مدعا سمجھا۔ "یار کیا پتا، اللہ نے سچ مچ ہی کایا پلٹ دی ہو۔"

"مجھے ناں۔ ابھی بھی یہی شک ہے کہ تمہارے حادثے میں اسی کا ہاتھ تھا، لیکن یہ خبیث ہمیشہ بچ جاتا ہے۔" نصیر اب دانت کچکچا رہا تھا۔

"تمہیں صرف شک ہے برادر۔" واسع کی خوبصورت ذہین آنکھوں میں معنی خیز سی چمک تھی، نصیر جھٹکا کھا کر پیچھے ہوا۔

"مطلب؟"

"کچھ شواہد ایسے ملے تھے۔" واسع گہرا سانس لیتے ایک دم سنجیدہ ہوا۔

"تو۔ ارررے۔" نصیر اچھل کر اپنی جگہ سے اٹھا اور واسع کے قریب آبیٹھا۔ "کیسے شواہد؟"

"چھوڑو یار۔" واسع نے سر جھٹکا۔ "شبنم کے حادثے نے سب الٹ پلٹ کررکھ دیا۔ عین اسی دن اتنا بڑا حادثہ ہونا، ان کے لیے وہ دھچکا کم تو نہیں تھا۔ کچھ تو سبق لیا ہوگا اس ذکی نے۔ اب ایسے حالات میں، میں کیا سزا تجویز کرتا۔ دل ڈر جاتا ہے نا۔"

"دل بھی تم جیسوں کا ڈرتا ہے واسع۔" نصیر نے نتھنے پھلائے۔ "پر یہ ذکی، کتے کی دم ہے۔ اس سے ابھی بھی ہوشیار رہنا۔"

"اللہ پر بھروسا ہے۔" واسع نے بات ہی ختم کردی

☆☆☆

"کیوں بھئی کہاں جارہے ہو؟" نازیہ اپنی چٹیا کو ہاتھ پر لہراتی اور جبین کمر پر ہاتھ رکھے شوخ مبہم ہنسی لبوں پر سجائے واسع کو گھور رہی تھیں۔ جبکہ واسع بیچ راہداری ہاتھوں میں سلائی مشین کا نیا ڈبا اٹھائے ان دونوں کی حرکات کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا مطلب۔ تم دونوں کے کمرے میں جارہا ہوں۔ یہ سامان رکھنا ہے۔"

"رباب کے جہیز والے کمرے میں جارہے ہونا؟" نازیہ نے ہنس کر جبین کو دیکھا۔

"ارے ہاں باجی۔ اماں نے بہت سا سامان میرے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ اب کہا ہے یہاں لے آؤں۔"

"ہاں لیکن ایسے تو نہیں جانے دیں گے؟" وہ دونوں ڈٹی ہوئی تھیں۔

"ایسے کیسے؟" واسع الجھ گیا۔ پتا نہیں ان

دونوں کو کیا ہو گیا تھا۔" ارے بھئی میرے کندھے لٹک گئے ہیں۔ راستہ دو۔ ورنہ یہیں رکھنے لگا ہوں۔" اس نے نیچے رکھنے کا اشارہ دیا۔

"ہاں ٹھیک ہے پھر سارا سامان یہیں لا کر رکھتے جاؤ۔ ویسے بھی وہ بے چاری اندر کام کر رہی ہے۔ تمہارے اچانک چلے آنے پر کیا سوچے گی۔"

"وہ......؟" واسع چونکا۔ "وہ یہاں ہے۔ ہمارے گھر؟"

"واہ نام لیے بغیر ہی پہچان گئے۔" نازیہ کھلکھلا کر ہنسی۔

"ہاں بھئی۔ وہی ہے اندر۔ ابھی آئی ہے۔ اندر جہیز سیٹ کروانے میں ہماری مدد کر رہی ہے۔"

"ہوں تو کیا کہہ رہی تھیں تم دونوں "کیسے" نہیں جانے دیں گی؟" واسع بھی فوراً اصل مدعے پر آیا۔ ان لالچی بہنوں کو جو بھی چاہیے تھا وہ دینے کو تیار تھا۔ خبر ہی ایسی ملی تھی۔

"دیکھ رہی ہو جبین۔ یہ واسع تو ابھی سے ہاتھ سے گیا۔" نازیہ نے آنکھیں نچائیں۔

"کچھ میرے حال پر بھی ترس کھاؤ۔" اس نے آنکھ سے بھاری سلائی مشین کی طرف توجہ دلائی تو دونوں نے ہنستے ہوئے راستہ چھوڑا۔

"شادی کا جوڑا الگ لیں گے تم سے۔ اور اس ملاقات کا الگ۔" جبین نے پیچھے سے ہانک لگائی اور وہ سر ہلاتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دل اس روکھی سڑیل کو دیکھنے کے خیال سے دھڑکا ضرور لیکن چہرے سے اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور ایک دم سنجیدگی اوڑھے پاؤں سے ادھ کھلے دروازے کو پورا کھول کر اندر داخل ہوا۔

وہ جہیز کے نئے بیڈ کے کنارے بیٹھی ہینگرز اور رنگ برنگے کپڑوں میں الجھی ہوئی تھی۔ واسع کو دیکھا تو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس نے تو سرسری نظر کے بعد ادھر دیکھا ہی نہیں اور سلائی مشین رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ دیکھنے لگا۔ سارا کمرا سامان سے پر تھا۔ اس نے پیک کی ہوئی واشنگ مشین کے اوپر خالی جگہ پاتے سلائی مشین کو وہیں رکھنے کا ارادہ کیا۔ اور آگے بڑھ کر مشین اس کے اوپر رکھ دی۔ پھر اسے دیوار سے ٹکا کر ایڈجسٹ کیا اور پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ انداز سے صاف ناراضی جھلکتی تھی ورنہ وہ اور سنجیدہ رہتا۔

"سس...... سنیں......" وہ دروازے کے پردے پر ہاتھ رکھے باہر نکلنے ہی والا تھا جب نازنین کی آواز پر مسکرا کر رکا۔ لیکن ایسے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کی مسکراہٹ نازنین کو دکھائی دی تھی۔

"ہوں۔" مختصر ترین جواب۔

"خفا ہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"نہیں، بہت خوش ہوں۔" وہ ہلکا غصہ لیے واپس مڑا۔ "نہ کوئی جانے کی اطلاع، نہ واپس آنے کی خبر، نہ اس بیچ کوئی رابطہ۔"

"سوری لیکن جاتے وقت تو کیسے حالات تھے نا۔ شبنم والے حادثے کے بعد۔" اس نے آہستہ سے وضاحت دینا شروع کی۔ "لیکن اب آ گئی ہوں نا۔"

"رباب کے لیے آئی ہو، یا اپنے اس نئے بھائی کے لیے۔ کون سا میری خاطر۔" وہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"آپ کے لیے بھی آؤں گی۔" وہ بالکل ہی بے ساختہ کہہ بیٹھی۔ واسع کو زور کی ہنسی آئی لیکن بڑی مشکل سے ضبط کی، لیکن ادھر نازنین کا رنگ اڑ چکا تھا۔ بھلا یہ بھی کرنے والی بات تھی۔ خود کو دل ہی دل میں سخت ملامت کی۔

"اچھا کب؟" واسع نے بڑے موڈ میں پوچھا لیکن وہ شرما کر منہ پھیر گئی۔

"ٹھیک ہے پھر میں بھی تب ہی مانوں گا۔" وہ پھر مڑنے لگا۔

"نہیں، نہیں۔" وہ فوراً تھوڑا سا آگے ہوئی۔ "وہ مجھے...... کچھ دینا ہے آپ کو۔"

"اچھا۔ تو ابھی نہیں لائیں؟" وہ اب دلچسپی

سے پوچھ رہا تھا۔
"ابھی تو نہیں لائی۔ آ...... آپ...... چھت پر آئیں گے رات کو؟"
"ہووں؟" واسع نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر بالکل بے یقینی سے دیکھا۔ "تم چھت پر بلا رہی ہو مجھے، چوری چھپے؟"
"بس مت آئیں۔ میں پشمینہ کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔" وہ منہ پھلا کر ناراض ہو گئی۔
"کتنے بجے آنا ہے؟" وہ ہلکا ہلکا مسکرا رہا تھا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔
"اوکے۔ فنکشن ختم ہو جائے پھر میں چھت پر چلا جاؤں گا۔ تمہارا جب دل چاہے آ جانا۔" وہ بتا کر باہر نکل گیا اور وہ بھی ہنس دی۔

☆☆☆

"ہیلو۔ ہیلو۔" نغمہ بکھرے بالوں کے ساتھ یہاں وہاں بھاگتی نہ تو اب تک خود تیار ہو پائی تھی نہ بچوں کو کر سکی تھی۔ موبائل بجا تو بھاگتے دوڑتے ہی کان سے لگا لیا۔
"سلام بھابی۔ میں رئیس۔"
"ہاں ہاں رئیس! وعلیکم السلام۔" وہ ہیئر برش تلاشتی پھر رہی تھی۔ پتا نہیں کہاں گیا تھا۔
"وہ...... آپ لوگ سب تیار ہو گئے؟" رئیس کے لیے مدعے پر آنا مشکل تھا لیکن نغمہ اس کے لہجے سے سمجھ گئی۔ مبہم سا مسکرا کر موبائل فون پشمینہ کی طرف بڑھا دیا۔
"تم ہی نمٹو، کون سا میرے لیے کال کی ہے۔" وہ عجلت میں پشمینہ کو موبائل تھما کر آگے بڑھ گئی اور اس نے مسکراتے ہوئے کان سے لگا لیا۔
ابھی پچھلے مہینے ہی ان دونوں کا رشتہ بحال ہوا تھا، دونوں اب نغمہ بھابی کے نمبر سے کبھی کبھار بات کر لیا کرتے تھے۔
"ہیلو۔" اس نے شرمائی دھیمی سی آواز میں آغاز لیتے ایک سائیڈ کا رخ کیا۔
"تیار ہو گئیں سست لڑکی؟"
"میں تو سب سے پہلے ہوئی تھی سچی۔" وہ سست کہنے پر خفا ہوئی۔
"تو اوپر چھت سے آؤ ذرا۔ کچھ دینا ہے۔"
"ہائے اللہ۔ چھت سے۔ اتنی دور۔" وہ بدکی۔ دونوں چھتوں کے درمیان جمیلہ چاچی کا گھر تھا اور مہندی کا فنکشن تو وہیں ہو رہا تھا، وہ تو بس درمیان کے دروازے سے رباب کے پاس پہنچنے ہی والی تھی۔
"کیا دور۔" رئیس کے ابرو کھنچ گئے۔ "صحرا پار کرنے کو کہہ رہا ہوں کیا۔ جلدی آؤ۔"
"کون کون ہے گھر میں؟" پشمینہ نے بظاہر لہجہ سرسری رکھا۔
"اماں ہیں صرف۔ اسفند اور بابا واسع لالہ کے ڈیرے پر ہیں۔ زیبا بھی رباب کے ہاں چلی۔" کہتے کہتے ایک دم مشکوک ہو کر رکا۔ "کیا مطلب کون کون ہے۔ اکیلا سمجھ رہی تھیں مجھے۔" وہ جیسے اب سمجھا۔ لیکن پشمینہ نے جواب منہ میں ہی رکھ لیا۔
"آ رہی ہوں۔" اس نے موبائل آف کر کے نغمہ بھابی کو اپنے جانے کا بتایا اور چپکے سے اوپر آ گئی۔
رباب وغیرہ کے گھر فنکشن کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ بچوں اور عورتوں کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ ان کی چھت سے آگے بڑھتے چھوٹی دیوار پھلانگ کر مجیب چاچا کی چھت پر آ گئی۔ اور پھر ان کی سیڑھیاں اترتے بے ساختہ کچھ یاد آیا۔
آج وہ سات برس بعد اس گھر کی سیڑھیاں دوبارہ اتر رہی تھی۔ آج پیروں میں پازیب تو نہ تھی لیکن فنکشن کی باقی تیاری بھرپور تھی۔ اس رات وہ سرخ اور سبز فراک میں ملبوس تھی اور آج سلور کناری لگے ہلکے گلابی کپڑوں میں۔
آہستہ روی سے ایک ایک قدم اترتے آخری سیڑھی کے نزدیک پہنچی تو رئیس سفید کاٹن کے شلوار قمیص اور براؤن واسکٹ پہنے سیڑھیوں کے قریب اس کا منتظر نظر آیا۔ وہ آخری اسٹیپ اتر کر مسکراتے

ہوئے اس کے مقابل آئی۔
"کچھ یاد آیا مینو؟"
"ہوں۔ میں بھی وہی سوچ رہی تھی۔" وہ اپنا اعتماد بحال کرنا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دیکھنا مشکل تھا۔
"اُن پانچ مہینوں کو تو سات سال کی نظر کھا گئی۔" رئیس کا ٹوٹا بکھرا دل جڑ کر بھی پرانی تلخ یادوں سے چھٹکارا پانے میں ناکام رہتا تھا۔
"کیوں یاد کرتے ہو رئیس۔ آج کو دیکھو۔ کیا ہم نے ایسے دن کا تصور بھی کیا تھا۔" اس نے پہلی بار سر اٹھایا۔
"خواب ٹوٹنے جیسا ڈر لگا رہتا ہے۔" وہ بے بسی سے مسکرا دیا۔
"اب بھی؟" پشمینہ اس ایک ماہ کے دوران آج پہلی مرتبہ اس کے روبرو تھی۔
"ہاں مینو۔ اب بھی کیونکہ اس رات اور آج کی رات میں تو کوئی فرق نہیں۔ تم تب بھی میری منگیتر تھیں۔ آج بھی ہو۔ لیکن جو تب ہوا تھا ہیں......"
"بس کرو رئیس!" پشمینہ کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا۔ "اتنا وہم ٹھیک نہیں۔ آگے سب اچھا ہوگا ان شاء اللہ۔ اور اب میں چلتی ہوں، ادھر فنکشن شروع ہوگیا ہے۔"
"اور تم آئی کیوں تھیں؟" رئیس نے ہونٹ دبا کر اپنی ہنسی روکی تو پشمینہ کچھ چونک گئی۔
"کیا ہوا، ہنس کیوں رہے ہو؟"
"ہر وقت غائب دماغ رہتی ہو یا میرے سامنے۔" وہ اب کھل کر ہنس رہا تھا۔ پشمینہ ہونقوں کی طرح دیکھ رہی تھی۔ رئیس نے اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب سے ایک ڈبیا نکالی۔
"میں نے کال پر کہا تھا جلدی آؤ، تمہیں کچھ دینا ہے۔ بھلکڑ۔" اس نے ڈبیا سامنے کی تو پشمینہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ واقعی وہ اپنے آنے کی وجہ تو بھول ہی گئی تھی۔ وہ اسے کوئی گفٹ دینا چاہتا تھا۔ پشمینہ نے اس کے سامنے ہی ڈبیا کھول لی۔ اندر چاندی کی دو پازیب رکھی تھیں۔ پشمینہ نے مسکرا کر معنی خیزی سے دیکھا۔ وہ اس شام کی یاد کو مکمل کرنا چاہتا تھا۔
"بیٹھو۔" رئیس نے سیڑھی کے اسٹیپ کی طرف اشارہ کیا تو وہ بھی سمجھتے ہوئے بیٹھ گئی اور دونوں پازیبیں رئیس سے لے کر اسی وقت پہن لیں۔ وہ اپنا تحفہ اسے پہنے ہوئے بھی دیکھنا چاہتا تھا۔
"شکریہ رئیس۔ بہت خوب صورت ہیں۔" وہ پاؤں ہلا کر ہلکی ہلکی چھن چھن سے محظوظ ہو رہی تھی۔
"اب چلتی ہوں۔"
"اماں سے نہیں ملوگی؟"
"چاچی سے۔" وہ گھبرا گئی۔ "کیا کہوں گی؟"
"بس دیکھ لو موجود ہیں کہ نہیں۔" رئیس نے شرارتاً جتایا تو وہ جھینپ گئی۔
"یونہی پوچھا تھا۔ تم تو شک کرنے لگے۔" وہ منہ پھیر کر اوپر چڑھنے لگی۔ اور رئیس چھن چھن کی اوپر جاتی آواز کو وہیں کھڑا یونہی بلاوجہ سنتا رہا۔ دل میں ہونے کا یقین اتر رہا تھا اور آج وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

"وئی توبہ۔ اذانیں ہونے لگیں لیکن ابھی تک کسی نے صحن میں کرسیاں سیٹ نہیں کیں۔" گلشن بڑی دیر بعد کسی کام سے باہر نکلی۔
"خدایا۔ بلب پہ بلب لگائے جا رہے ہیں۔ آنکھیں چندھیا گئیں اب تو۔ مہمانوں کے بیٹھنے کی تو کسی کو فکر ہی نہیں۔" وہ منہ میں بڑبڑاتی کرسیاں الٹ پلٹ کرنے لگیں۔
"رہنے دیں پھوپھو! ہمارا چھت کا کام مکمل ہوگیا ہے۔" اسفند اسی وقت ہاتھوں اور بازوؤں سے گرد جھاڑتا چھت سے نیچے اترا۔
"ائے بسم اللہ، تم تھے اوپر۔" گلشن ہاتھ روک کر خوش گواری سے مڑیں۔ اسفند تو اب ان کا ہونے والا داماد تھا۔ زبان اپنے آپ میٹھی ہوگئی۔
"جی، نصیر لالہ نے بلایا تھا۔ اور لڑکے بھی

ساتھ تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے سب چلے گئے۔ میں بس چیک کرنے کے لیے رک گیا تھا۔"

"جیتے رہو، بس اب تم بھی آرام کرو۔ یہ کام لڑکیاں دیکھ لیں گی۔" انہوں نے پیار سے بھتیجے کا کندھا سہلایا۔

"ارے نہیں پھوپھو! اتنا سا تو کام ہے، میں کرلوں گا۔ لڑکیوں کو تیار ہونے دیں۔ آج تو خواتین کا فنکشن ہے ناں۔ ہمارا تو اُدھر کوئی کام نہیں۔ میں کرلیتا ہوں۔"

"نہ مڑے۔ اب اچھا لگے گا۔ اندر آکر بیٹھو۔" گلشن کا بس نہیں چل رہا تھا۔ اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا پسینہ پونچھ لیتیں۔

"پھوپھو! تکلف نہ کریں۔ اپنا گھر ہے۔ پھر شادی بیاہ کے موقع پر کہاں تھکاوٹ ہوتی ہے۔ باقی لڑکے بھی ادھر واسع لالہ کے ساتھ کام کروانے میں لگے ہیں۔" اسفند نے خوش خلقی سے تفصیلاً بتا کر پھوپھو کے من کا بوجھ ہلکا کیا۔ بلاوجہ فارمل ہورہی تھیں۔

"اچھا پھر میں کسی کو تمہاری مدد کے لیے بھیجتی ہوں۔ مجھے خیر بانو کو پھولوں کے ہار بنانے کا کہنا ہے۔" انہیں جیسے اچانک کام یاد آیا۔

"میں خود ہی کرلوں گا۔ تھوڑا سا کام ہے۔ آپ بس ٹھنڈا پانی بھجوادیں ایک گلاس۔"

"ہاں ابھی بھیجتی ہوں۔" وہ بھی جلدی میں تھیں۔ اندر کو بڑھ گئیں۔ اور اسفند نے کرسیاں اتار اتار کر ترتیب سے لگانا شروع کردیں۔ کام واقعی تھوڑی دیر کا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے نمٹ بھی گیا لیکن اسی وقت لائٹ بھی چلی گئی۔

"اوہ۔ یہ بھی ہونا تھا۔" اسفند نے ہاتھ روک کر جیب سے موبائل نکالا۔ لوڈشیڈنگ جاری تھی ان دنوں۔ مطلب لائٹ نے اب ایک گھنٹے بعد آنا تھا۔ اور مہمان بھی کچھ اسی حساب سے جمع ہونے تھے۔ اب تو آٹھ بجے ہی یہاں سے مہندی لے کر جایا جاسکتا تھا۔ اس نے شکر پڑھا کہ کرسیاں تقریباً سیٹ ہوچکی تھیں۔ اب اس کا یہاں کام ختم ہوگیا تھا۔ اسے بھی اب اپنے گھر کی طرف جانا تھا۔

لڑکوں نے واسع لالہ کے ڈیرے پہ رونق لگا رکھی تھی۔ وہ موبائل جیب میں رکھنے لگا جب اندھیرے میں چوڑیوں کی آواز پیدا ہوئی۔ اسفند نے موبائل واپس نکال کر ٹارچ آن کی اور اندرونی دروازے کی طرف ڈالی تو زمرد پانی کا گلاس لیے وہاں سے نکل رہی تھی۔ ٹارچ کی روشنی پڑنے پر چہرا بے ساختہ سائیڈ پر کیا تو اسفند نے مسکرا کر ٹارچ آف کردی۔ اس پچھلے لان میں اس وقت سوائے اس کے کوئی نہیں تھا۔ اس نے اندھیرے میں زمرد کو قریب آنے دیا۔

"پانی۔" وہ کسی کمرے کی کھڑکی سے آتی ہلکی روشنی میں مسکرا کر اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔

"ظالم لوگ۔ مزدور کی گھنٹوں کی محنت کا صلہ۔ بس ایک گلاس پانی؟" وہ آہستہ آواز میں بولا۔ اس بدھولڑکی کو اب کچھ دیر یہیں روک کے رکھنا تھا۔

"اماں نے کہا تم نے پانی مانگا ہے۔" زمرد نے ناراض نظروں سے گھورا۔

"بھئی بندہ اگلے کی محنت دیکھنے ہی چلا آتا ہے۔ تعریف کے دو بول بھی محنت کا صلہ ہوا کرتے ہیں۔" اسفند نے اس کے دیر سے غائب رہنے کا شکوہ کیا۔

"اب اتنے سارے لڑکے تھے تمہارے ساتھ۔ اس وقت کیا تعریف کرتی۔"

"تو اب کردو۔" وہ اسے بغور دیکھے جارہا تھا۔ ہلکی روشنی میں کچھ جامنی یا بلو رنگ کا اندازہ ہوا۔ لائٹ میک اپ میں چہرا بھی چمک رہا تھا۔

"اتنا اندھیرا ہے ابھی۔ پہلے محنت دیکھ تو لوں۔" وہ نروس لگ رہی تھی، اسفند کے لہجے اس کے جملوں سے۔

"مجھے تو صاف دکھائی دے رہی ہو۔" وہ آج واقعی کچھ الگ ہی لہجے میں بات کررہا تھا۔ ایسا پراعتماد اسفند اس نے اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

"یہ سوٹ پہچانتے ہو اسفند۔" وہ اس کے لہجے سے دھیان ہٹانے کو اپنا چمکتا جامنی اور پیازی دوپٹہ سامنے لہرانے لگی۔ اسفند نے سرنفی میں ہلایا۔

"زیبا باجی اور سلطانہ مامی لائی تھیں۔ منگنی کے دن۔ میں نے فنکشن کے لیے سلوالیا۔"

"خوش ہو زمرد؟" وہ پیازی جامنی دوپٹے میں کھلے کھلے سے میک اپ کے ساتھ اس نیم تاریک جگہ میں بھی چمک رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے زیادہ خوش ہوں اسفند۔" وہ سنجیدہ ہوئی۔ "تمہیں صرف "میری" نہیں، میرے پورے گھر کی محبت مطمئن کرسکتی تھی۔ تم پہلے مجھے کبھی اتنے بااعتماد اور خوش وخرم دکھائی نہیں دیئے جتنے کہ اب۔"

"یہ سچ ہے زمرد۔" اسفند نے ایک گہرا سانس لیا۔ "اور یہ اس لیے کیونکہ مجھے لگتا تھا میری بہن نے صرف اپنے دل کی خوشی کو ترجیح دی اور باقی سب ہی کے دل توڑنے کا باعث بن گئی۔ اور یہ تو انتہا درجے کی خود غرضی ہوتی ہے نا۔"

"لیکن ایسا نہیں تھا۔ بس قسمت خراب تھی اس کی۔ اور اب تو وہ آرہی ہیں ناں۔ اب سب ٹھیک ہوجائے گا ان شاء اللہ۔" زمرد کو اچانک اس خیال نے خوش کردیا کہ نگینہ اور احمد تو اگلے دن گاؤں واپس آرہے تھے۔ ان کی سزا تو پہلے ہی معاف ہوچکی تھی۔ اب وہ کسی بھی وقت گاؤں واپس آسکتے تھے لیکن واسع اور نصیر نے انہیں مہینے بھر سے جان بوجھ کر روکا ہوا تھا۔ دونوں یہی چاہتے تھے کہ ان کی آمد کا آغاز شادی کی دعوت سے ہو۔ تاکہ خوشی کے موقع پر پرانی رنجشوں کو یاد تک نہ کیا جاسکے۔ اور ایک بار وہ نصیر کی شادی پر گاؤں آگئے تو پھر انہیں واپس نہیں جانے دیا جائے گا۔

"ہوں۔" اسفند نے اس کے جوش وخروش کا ایسا مختصر سپاٹ جواب دیا تو زمرد نے حیران ہوکر دیکھا۔

"کیا ہوا۔ یہ تو خوشی کی خبر ہے اسفند!"

"ہاں ہے۔ لیکن پتا نہیں کیوں، مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی ہے۔"

"تم تو بلاوجہ گھبرا جاتے ہو۔ بابا بتارہے تھے داؤد بابا کے گھر تو احمد لالہ اور نگینہ باجی کے آنے کی ایسے تیاریاں ہورہی ہیں جیسے گھر میں کوئی شادی ہو۔ سب بہت خوش ہیں۔ تم بھی۔"

"مجھے سچ میں بہت ڈر لگ رہا ہے، جیسے کوئی انہونی......"

"بس اسفند!" زمرد نے گھبرا کر ہاتھ آگے کیا لیکن اس کے منہ سے کچھ فاصلے پر روک لیا۔ "اچھا اچھا سوچا کرو، وہم مت کیا کرو۔"

"اچھا اچھا بھی سوچوں گا۔ پہلے ایک اچھی لڑکی تو میرے گھر آجائے۔" وہ شاید اس کا دل رکھنے کو مسکرایا تھا۔

"نصیر لالہ کہہ رہے تھے۔" وہ بے ساختہ بولی لیکن پھر بیچ میں اچانک ہی رک گئی۔ اسفند نے حیران ہوکر دیکھا۔

"ہاں۔ بولو نا کیا کہہ رہے تھے نصیر لالہ؟"

"کچھ نہیں۔" وہ بری طرح جھینپ گئی۔

صاف لگا اب تو بتانے کا بالکل بھی کوئی ارادہ نہیں۔

"بتاؤ نا زمرد! کیا بات ہے۔ کیا کہا انہوں نے؟" وہ کچھ پریشان سا ہوگیا۔

"کچھ نہیں، چھوڑو بھی۔"

"پلیز زمرد! پریشان مت کرو، میرا دل پہلے ہی گھبرا رہا ہے۔"

"اُف اللہ۔" زمرد نے ہاتھ پیشانی پہ مارا۔ "کتنا ڈرتے ہو تم پاگل، میرا چہرا دیکھ کر بھی نہیں سمجھ رہے کہ بات پریشانی والی نہیں ہے۔" وہ اب ہنس رہی تھی۔

"مجھے نہیں پتا، بتاؤ کیا کہا لالہ نے؟" وہ ایک دم سنجیدہ تھا۔ زمرد نے سخت کڑی نظروں سے گھورا۔

"وہ اماں سے کہہ رہے تھے کہ رباب گھر آجائے تو زمرد کو بھی جلدی بیاہ دیں گے۔" وہ اب روٹھی روٹھی سی نیچے دیکھ رہی تھی۔

"اوہ۔" وہ ایک دم ہلکا پھلکا سا ہو کر ہنس دیا تو زمرد اس لیے جھجک رہی تھی، اور وہ پتا نہیں کیا سمجھ رہا تھا۔

"اچھا تو پھر کب؟" وہ شرارتی ہوا۔

"اب یہ مجھے کیا پتا؟" وہ خفا ہونے لگی۔

"لیکن مجھے تو پتا ہے۔" وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا تو زمرد نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں تعجب سے اوپر اٹھائیں۔

"میری اماں کہتی ہیں نگینہ آجائے تو بس دو ماہ کے اندر ہی میری اور رئیس۔"

"اتنے جلدی...... دو ماہ...... بس......"

زمرد کی آنکھیں مزید پھیلیں تو اسفند نے اپنا قہقہہ روکا۔

"امتحان سر پر آجائیں نا تو نالائق اسٹوڈنٹ کا بالکل ایسا ری ایکشن ہوتا ہے۔"

"ہاں نا مڑے۔" زمرد نے بچوں کی طرح منہ پھلایا۔ "اتنا وقت ڈر ڈر کہ گزارا ہے کہ اب خوشی کی خبر پر خوشی کا ری ایکشن دینا بھی نہیں آتا۔"

"تو مطلب یہ خوشی تھی تمہاری؟" وہ ہنس کر تائید چاہ رہا تھا۔ زمرد نے شرمندہ ہو کر سر اثبات میں ہلایا۔

"بدھو ہوں ناں؟"

"نہیں سچی ہو اور بہت اچھی ہو۔" اسفند نے مسکرا کر اس کے سر پر انگلی بجائی۔

"اب جاؤ۔ اس حلیے میں شہزادی کے ساتھ کھڑا غلام لگ رہا ہوں۔"

"غلام ایسے ہی رہا کرے۔ ورنہ نظر لگ سکتی ہے۔" وہ چلتے چلتے کہہ گئی۔

"کس کی؟" وہ محظوظ ہوا۔

"وہی جو غلاموں کو بہت توجہ سے دیکھتی ہیں۔" وہ مسکرائے گئی۔

"بگڑی شہزادیاں۔" اسفند نے جملہ پورا کیا اور وہ کھلکھلا کر ہنستے اندر داخل ہو گئی۔

☆☆☆

جو بھی پیرایۂ اظہار نظر آتا ہے
سامنے تُو ہو تو بے کار نظر آتا ہے

"شاعری بھی کرتے ہیں؟" وہ جو سامنا ہونے کے خیال سے بے تحاشا نروس تھی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ چھت پر جا کر کیا بولے گی، کیسے کہے گی۔ واسع کے خوب صورت اظہار پر شرم سے ہنس دی۔ واسع نے فرمائش کی تھی کہ وہ فنکشن کی تیاری میں ہی چھت پر ملنے آئے، اور وہ تب سے اسی حلیے میں بیٹھی سب کے سو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ فنکشن کے دوران واسع نے بس ہلکی سی جھلک ہی دیکھی تھی۔ اورنج رنگ کے کھلے شوخ کپڑوں کے ساتھ گھنے ابروؤں اور کاجل بھری آنکھوں کے ساتھ وہ کیا ساحرہ سی لگ رہی تھی۔ پیچھے لمبا پراندہ اور چہرے پر ڈھیلی ڈھالی لٹیں۔ اس نے اسی ایک جھلک کے بعد فوراً ہی پشمینہ کے ہاتھ کہلوا بھیجا کہ وہ بنا چینج کیے ہی اس سے ملنے آئے۔

"خود تو نہیں کرتا، ہاں شاعری کا ذوق رکھتا ہوں۔" واسع چھوٹی دیوار پر بیٹھ گیا۔ رخ اپنی چھت کی جانب تھا۔ قریب ہی پیک کیا ہوا وہ ڈبا رکھا تھا جو نازنین اس کے لیے لائی تھی اور اس نے آتے ہی دیوار پر رکھ دیا تھا۔

"بیٹھ جاؤ تم بھی۔" واسع نے ایک گھٹنا فولڈ کر کے ذرا سا رخ اس کی طرف پھیرا۔

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" نظریں جھکائے واسع کو کچھ گھبرائی ہوئی سی لگی۔

"ڈر رہی ہو؟"

"نہیں۔" وہ اوپر دیکھ کر ہنس پڑی۔ "آج ڈر نہیں لگ رہا۔"

"لیکن اگر کوئی آ گیا تو؟" انداز صاف تنگ کرنے والا تھا۔

"آ بھی گیا تو اس کے ہاتھ میں بندوق نہیں ہو گی۔" واسع کی "کوئی" سے مراد چونکہ سیف لالہ ہی تھے اس لیے وہ بھی بے ساختہ بولی تھی۔ واسع نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"صحیح ہے۔ ویسے ہم پر تو ہر ہتھیار آزمایا گیا۔"
وہ کہتے کہتے بے اختیار ایک آہ بھر گیا۔ نازنین کی مسکراہٹ بھی یک لخت سمٹ گئی۔ واسع کی بدلتی کیفیت کے دوران ہی وہ بھی پیچھے چلی گئی تھی۔ کچھ تکلیف دہ مناظر اسے خوابوں میں بھی سراسیمہ کرتے تھے۔ نازنین کو اپنے پہاڑ سے کود پڑنے کا خوف اتنا نہیں ستاتا تھا جتنا کہ اس روز گھاٹی میں اتنے ڈھیر سارے مردوں کے اچانک وہاں آجانے اور ان کے جملوں کا ستاتا تھا اور اس کا حسرت بھرا دل کاش کہہ کر رہ جاتا کہ اس دن رقعہ پا کر وہ اتنی عجلت میں وہاں نہ چلی گئی ہوتی۔
"کیا لوگوں نے واقعی ہم پر بولنا چھوڑ دیا ہوگا؟" اس نے ایک آس پر نظریں اٹھا کر سوال کیا۔
"ہمارے سچ پر یقین تو کیا ہوگا نا؟"
"ہوں۔" واسع نے لب بھینچ کر نرمی سے پلکیں موندیں۔ "جھوٹی قسم چھپتی نہیں ہے۔ کلام پاک کو جھوٹی گواہی کے لیے استعمال کر لینا کھیل یا مذاق نہیں ہوتا۔ اس کا انتقام قدرت خود لیتی ہے اور یہ ہمارا یقین ہے۔"
"ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوا واسع؟"
نازنین ان لمحوں میں پوری وہاں چلی گئی تھی جہاں جانے سے دل بوجھل پن کے غبار سے یوں ڈھک جاتا کہ باقی کچھ بھی دکھائی دینا بند ہو جاتا۔ واسع نے بغور اس کے تاثرات دیکھے پھر ایک آہ کھینچی۔ کچھ دیر سوچا پھر کہنا شروع کیا۔
"جانتی ہو کیوں ہوا؟"
"کیوں؟" نازنین کی اٹھی پلکوں میں تحیر تھا۔
"کوئی وجہ بھی ہو سکتی ہے؟"
"وجہ تو ہے ناز۔ اور بنا وجہ کے تو کچھ بھی نہیں ہوتا، تم بھی وجہ جاننے کے لیے کھلی آنکھوں سے ان بدلتے ہوئے حالات کو دیکھو ابھی تم نے کہا آج بندوق کا ڈر نہیں۔ تو اس کی وجہ بھی تم ہی ہو۔ انقلاب بغیر قربانیوں کے نہیں آتے، تمہارا یہاں آنا نہ یونہی تھا نہ بے وجہ۔ کسی بھی بگاڑ میں سدھار کے لیے چیزیں اپنی جگہ بدلتی ہیں۔ گلے بند ھے فرسودہ نظام میں چند بڑی تبدیلیوں کی راہ میں ہمارے دامن پر جو چھینٹے پڑے اسے سدھار کی راہ میں ایک چھوٹی سی قربانی سمجھو گی تو ماضی کی وہ یاد تکلیف نہیں آسودگی بن کر چہرے پر کھلے گی، دل میں اترے گی۔"
"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ حالات میں اچھی تبدیلیاں تو آپ کی اور نصیر لالہ کی وجہ سے آئیں۔ یہ سب کچھ تو آپ دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔"
"ہم بھی کچھ نہ کر پاتے اگر رئیس پشمینہ کے لیے برسوں گزر جانے پر بھی اتنی محبت نہ رکھے ہوتا، اگر مجھے احمد اور نگینہ کوئٹہ میں نہ ملتے، اگر زکی مجھ سے اتنی نفرت نہ کرتا، اگر میرے ساتھ نصیر جیسے مددگار کا ساتھ نہ ہوتا، اور اگر تم یہاں مہمان نہ آتیں۔ اور یہی سب "اگر" مل کر ہمارے صدیوں سے ٹھہرے کائی زدہ ساکن پانی جیسی روایات میں شفاف چشموں کے بہاؤ کا باعث بنے۔ اور....." وہ ذرا دیر کو رکا۔
نازنین اسے بغور دیکھ بھی رہی تھی اور مکمل توجہ سے اس کی خوب صورت باتیں سن بھی رہی تھی۔ واسع کے یکبارگی متوجہ ہونے پر جھینپ کر نظر ہٹائی، واسع بھی ہلکا سا مسکرایا پھر سنجیدہ ہو گیا۔
"اور یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ تمہارا یہاں ہونا ان سارے معاملات سے مربوط کیوں ہے۔"
واسع نے گلا کھنکار کر دوبارہ کہنا شروع کیا۔
"جانتی ہو نازنین۔ احمد اور نگینہ کا سچ اگر عام حالات میں اکا جان یا اپنے خاندان کے کسی اور بندے کے سامنے رکھا جاتا اور ان کی بھول پر معاف کر دینے کی بات کی جاتی تو آگے سے صرف ان دونوں کو گالیوں سے نوازا جاتا۔ قائل کرنا تو دور کی بات ہے، الٹا دو چار لعنتیں بھیج کر وہ ہمیں بھی دفع کر دیتے۔ کیونکہ ان کا آدھی رات کو ایک دوسرے سے ملنے کی کوشش کرنا ہی اس بھول کی اصل بنیاد تھا۔ انہیں یہ انتہا درجے کا رسک اٹھانا ہی نہیں چاہیے تھا۔

لیکن ایک تو اس موقع پر رئیس اور پشمینہ والے واقعے پر بدگئی کے معاملے کا اٹھنا اور عین اس موقع پر ہم دونوں کو بے قصور نشانہ بنا کر پھنسائے جانے کی کوشش قدرت کی ایک مدد تھی۔ ان نہ نظر آنے والی زنجیروں میں بندھے ہمارے گاؤں کے اُن قیدیوں کی۔ جو نہ تو اب تک کے وقت میں ان زنجیروں کو توڑ پائے تھے اور نہ ہی آگے کوئی امکان تھا۔"

"آپ نے سچ کہا واسع۔ اور اب سے پہلے میں نے ایک بار بھی اس زاویے سے نہیں سوچا تھا۔ مہینوں میں بے چین و بے آرام رہی ہوں۔ باوجود اس کے کہ جرگے میں ہمیں سچا بھی ثابت کر دیا گیا۔ میں کوئٹہ جا کر بھی ان ہی فضول کی سوچوں میں گم رہتی تھی۔"

"فون پر رابطے میں بھی رہتیں تو یہ سب میں تمہیں پہلے بتا دیتا۔" وہ مسکرا کر شکوہ کر بیٹھا اور نازنین بھی ہنس پڑی۔

"میرا سیل فون پانی میں گر گیا تھا۔ نہ اسے ٹھیک کروایا نہ نیا لیا۔ بس خالہ کے موبائل فون سے نغمہ باجی وغیرہ سے بات ہو جاتی تھی۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ اور یہ....." واسع نے پہلی بار گفٹ کی طرف توجہ کی۔ "کس لیے؟"

"آپ کے لیے لیا تھا کوئٹہ سے۔ دیکھیں۔" وہ شرما رہی تھی۔ واسع نے پیکنگ کھولی۔ گھڑی، پین اور کف لنکس کا بہت خوبصورت مکمل سیٹ تھا۔

"واہ۔ تھری اِن ون۔ پین وکالت کے لیے، گھڑی باغ کی خوشی میں اور کف لنکس ہمارے رشتہ....."

"اب شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے ایسا کب سوچا تھا۔" وہ بری طرح خجل ہوئی تو واسع ہنسا۔

"تم نے نہیں سوچا ویسے گہرائی تو ہے نا۔ پین کا تعلق وکالت سے بنتا ہے اور گھڑی کا باغ سے کیونکہ ایک طویل مدت کے بعد اسے واپس حاصل کیا۔ اور یہ۔" اس نے بلیک کرسٹل لگے سلور کف لنکس کو ہتھیلی پہ رکھا اور نازنین کو نرم مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

"آپس میں جوڑے رکھنے کے لیے۔"

"آپ کو پسند آیا گفٹ؟"

"بہت زیادہ۔ تمہاری پسند واقعی لاجواب ہے۔" واسع نے کہتے ساتھ پین کو پیکنگ سے نکال کر کھولا اور نازنین کی انگلیوں میں تھما کر اپنی ہتھیلی سامنے کی۔

"یہاں اپنا موبائل نمبر لکھو۔" وہ اسے گہری نظر سے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"لیکن میرے پاس موبائل....." وہ حیران ہوئی کہ ابھی تو اسے بتایا تھا۔

"موبائل نہیں ہے۔ نمبر تو ہے نا۔ مطلب سم؟"

"جی، وہ تو ہے۔"

"تو پھر لکھو۔" اس نے ہتھیلی مزید آگے کی اور نازنین نے بھی بنا مزید بحث میں پڑے اپنا نمبر لکھ دیا۔

"ہوں۔ تھینکس۔" وہ پین واپس لے کر دیوار سے اترا اور "ایک منٹ" کہہ کر اپنے چھت والے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اور کچھ ہی دیر میں واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں بھی ایک گفٹ پیک تھا۔

"تمہارے لیے۔"

"اچھا۔ یہ کس لیے؟" حیران ہوئی اور مسکرا کر لے لیا۔

"کچھ بھی سوچ لو۔ میری طرح۔" اس نے کندھے اچکائے۔ "میں تو بس کافی عرصے سے کچھ گفٹ کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ محبت میں تحفہ "چیز" نہیں نشانی ہوا کرتا ہے۔ اور جب کوئی بنا کہے کسی کے لیے کچھ لیتا ہے تو اپنی اہمیت پوچھنی نہیں پڑتی، خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات میں "اس" کے لیے کہہ رہا ہوں۔" اس نے کہتے ساتھ ہی نازنین کا گفٹ ہاتھ میں لیا تو وہ ہنس کر اپنا گفٹ کھولنے لگی۔

"موبائل فون۔" نازنین کی آنکھیں ایک بہت خوب صورت مہنگا موبائل سیٹ دیکھ کر حیرت آمیز خوشی سے پھیل گئیں۔ "یہ تو بہت مہنگا ہوگا۔ آپ

نے اتنا تکلف۔“
”اپنے لیے کیا ہے بی بی۔“ اس نے ماتھا پیٹا اور نازنین کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ وہ اس کے رابطہ نہ کرنے سے خوب خائف تھا اور ابھی تک تپا بیٹھا تھا۔
”مہینوں صبر کر لیا، اور اب پندرہ دن بھی گزارے نہیں جاتے۔“ وہ ہنستا چہرا لیے لاپروائی سے کہتے اپنے خوب صورت موبائل کو الٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی تھی اور اس کے چہرے کو پورے دھیان سے دیکھتے واسع نے ڈھیروں ڈھیر شرارتی جواب بس ایک پندرہ دن کے لیے جبراً اپنے اندر دبا لیے۔ نازنین نے اس کی خاموشی پر سوالیہ ابرو اٹھائے تو اس نے ہنس کر سر نفی میں ہلایا۔

ترا ہی ذکر کریں بس تجھی کو یاد کریں
یہ فرصتیں بھی کبھی فکر روزگار تو دے

☆☆☆

احمد، نگینہ کو لیے دوپہر کے وقت مسلم باغ پہنچا تو سب سے پہلے اپنے ہی گھر آیا تھا۔ اس کے بابا، اماں بھائی بھابیاں شدت سے ان کی آمد کے منتظر تھے۔ قسموں کا کفارہ ادا کر دینے کے بعد خیالات میں الگ ہی بدلاؤ آیا تھا۔ نہ کسی کے لیے نفرت باقی رہی تھی نہ کدورت نہ انتقام کا کوئی خیال۔
نگینہ ان کے لیے احمد کی بیوی اور اس گھر کی بہو تھی۔ داؤد بابا نے شفقت سے سر پہ ہاتھ رکھا تو اماں نے اپنے بازو، بہو اور پوتی کو سینے سے لگانے کے لیے وا کر دیے۔ نگینہ تو پہلے بھی ان کے لیے مالک کی بیٹی جیسی نہ تھی۔ مجیب کے ساتھ داؤد کا گہری دوستی کا رشتہ تھا۔ معاملہ بدلنی کے رشتوں کا نہ آجاتا تو احمد کا رشتہ مجیب کے لیے باقی ہر رشتے پر فوقیت رکھتا۔ اور اب، اب جبکہ یہ ہو چکا تھا تو گلے شکوے اور نفرتیں بھلا کر آگے بڑھنا تھا۔ انہوں نے کب سوچا تھا کہ اس زندگی میں کبھی اپنے احمد کو دوبارہ دیکھ بھی پائیں گے۔
داؤد بابا نے ہی ان کو بتایا کہ شام کی دعوت ان کی مجیب بھائی کے ہاں ہے۔ صلح ہو جانے کے بعد ان کا مجیب خان سے ملنا جلنا دوبارہ شروع ہو چکا تھا۔ اکثر وہ خود ہی مجیب خان کے ڈیرے پر جا بیٹھتے۔ گھر کی خواتین بھی دو تین مرتبہ سلطانہ بھابی کی خیریت پوچھنے ان کے ہاں جا چکی تھیں۔
مغرب کی اذان سے کچھ دیر پہلے نگینہ اور ثمین کو ساتھ لیے احمد اپنی سسرال آیا تو یہاں بھی ان کا استقبال توقع سے کہیں بڑھ کر ہوا۔ حالانکہ نگینہ کا دل باپ اور بھائیوں سے سامنا کرنے کے خیال سے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ نہ اس میں رئیس سے نظریں ملانے کا یارا تھا نہ اسفند سے۔ اور اس کے بابا۔ وہ روتے ہوئے ان کے قدموں میں گری تھی۔
”مجھے معاف کر دیں بابا۔ مجھ جیسی بدنصیب اولاد اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دے۔ میں آپ کی امیدوں پہ پوری نہیں اتری۔ سعادت مند نہیں کہلائی، میں اگر پردیس میں تڑپ تڑپ کر مر بھی جاتی تب بھی میری بھول کا ازالہ ممکن نہیں تھا۔ میں آپ کی نظروں میں کبھی اٹھ نہیں پاؤں گی۔“
”بس کرو نگینہ۔“ زیبا نے نزدیک آ کر اسے زبردستی اٹھایا۔ وہ بری طرح سسک رہی تھی۔ مجیب خان نے بیٹی کا لرزتا وجود اپنے کندھے سے لگایا۔
”معاف کر دینا اگر اس قبیلے کی روایات میں شامل ہوتا تو تم اتنی بے یقین نہ ہوتیں، ہمارے رسم و رواج کو نہ دیکھو، اس اوپر والے کے قانون کو دیکھو، جب وہ معاف کر دینے کی راہ ہم پر آخری سانس تک بند نہیں کرتا تو ہم کون ہوتے ہیں، اس قدر کڑے قوانین بنانے والے۔ میں نے تمہیں معاف کیا نگینہ!“
”اور میں آخری سانس تک اس معافی کا بھرم رکھوں گی بابا۔ میں اپنی ہر کوتاہی کا ازالہ کروں گی۔“ روتے ہوئے ان کا سینہ بھگو رہی تھی۔
”بس کرو بچے۔ جاؤ اپنی ماں سے مل لو، اس کی حسرت بھی کہاں پوری ہوئی ہے۔“ وہ اسے تھپک کر مسکرا رہے تھے۔ زیبا اسے اندر اماں کے پاس لے

آئی، جن سے وہ آتے ہی ایک بار مل چکی تھی۔ وہ اب سہارے سے اٹھ کر بیٹھی تھیں اور گود میں نمین کو لیے ایک ٹک بس اسے دیکھے ہی جارہی تھیں۔

"یہ تو بالکل تم پر گئی ہے نگو۔" وہ مسکرا کر نگینہ کو دیکھنے لگیں۔

نگینہ اب حیرت سے زیبا اور اس کے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی پچھی اور کٹوری میں روٹی سالن ڈال کر ایک ایک نوالہ شیئر کرنے والیوں میں برسوں کی تفاوت کا یہ رنگ۔ کیا یہ وہی زیبا تھی، آج شادی شدہ، قدرے بھاری جسامت لیے، ایک بچہ گود میں اٹھائے یوں اس کے مقابل بیٹھی تھی جیسے کوئی اور ہی خاتون ہو، بالکل اجنبی۔

نگینہ نے ہنس کر اسے گلے سے لگایا تو پھر چھوڑا نہیں، رو رو کر زیبا کی خوشبو کو محسوس کرتے وہ خود اپنے آپ کو اپنے اس گھر میں موجود ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔

"بس کرو مڑے۔ احمد کو بھی کسی نے بیٹھنے کو بولا ہے۔ یا تب سے وہ وہیں کھڑا ہے؟" سلطانہ ماں تھیں ایسی باریکیوں کا خیال بھی ان ہی کو آسکتا تھا۔

"جی اماں! رئیس اور اسفند کے ساتھ ہے۔ ادھر ہی آرہے ہیں۔" زیبا نے باہر جھانکا۔

"لالہ آپ نے تیار ہونا ہے سہرابندی کے لیے؟" اسفند نے اپنا رویہ احمد کے ساتھ یوں معمول کا رکھا جیسے اول روز سے آپس کا ملنا جلنا عام ہو۔

"ہاں میں تو تیار ہوں۔ نگینہ اپنا تیاری کا سامان شاید ساتھ لائی ہے۔"

"ابھی تو اس کو رونے سے فرصت نہیں۔" اسفند ہلکا سا مسکرایا۔ "آئیں آپ بابا کے کمرے میں بیٹھیں۔ وہاں باقی سب بھی ہیں۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ یہاں زیبا باجی کا شوہر بھی بابا جان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اسفند انہیں یہاں بٹھا کر واپس باہر آیا تو نظر سامنے ستون سے کندھا ٹکائے رئیس پر پڑی، معلوم نہیں کیوں پچھلے کچھ وقت سے وہ بالکل چپ چپ سا تھا۔

"کیا بات ہے۔ کن سوچوں میں ہو؟" اسفند اس کے مقابل آکھڑا ہوا تو اس نے ذرا سا سر گھما کر دیکھا۔

"بس یونہی، ملی جلی سی۔"

"جیسے؟" اسفند نے ابرو جوڑے۔

"ابھی سب شادی میں شریک ہوں گے۔ پتا نہیں باقی رشتے داروں کا رویہ کیسا ہوگا باجی اور احمد بھائی کے ساتھ۔ کہیں کسی نے کچھ بول دیا تو ساری خوشی۔"

"کسی" سے کیا مراد۔ اور...... جملہ اسفند کے منہ میں رہ گیا۔ ملا جلا زنانہ شور درمیان کے دروازے سے ایک دم اچانک بلند ہوا۔ واسع لالہ کے گھر والے درمیانی دروازے سے نازیہ، جبین، جمیلہ چاچی اور پیچھے گلشن پھوپھو۔

"میری مراد "ایسوں" سے تھی۔" رئیس نے مبہم ہنسی ہونٹوں میں دبائے ہولے سے بڑبڑ کی تو اسفند نے نچلا لب دانتوں میں دبائے زور سے اس کے کندھے پہ دھپ رسید کی۔ رئیس کا اشارہ گلشن پھوپھی کی طرف تھا۔

"ایسے ویسے سب سدھر گئے ہیں۔" وہ بھی سمجھ گیا اس لیے فوراً وضاحت دی۔

گلشن پھوپھی جب سے اس کی ہونے والی ساس بنی تھیں، رویہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ دونوں نے دوبارہ آنے والوں کو دیکھا۔ گلشن پھوپھی کے پیچھے شمیم چاچی اور نغمہ بھابی بھی تھیں۔

"اور "ایسوں" کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اب حساب چکانے کی باری اسفند کی تھی۔ اس بار رئیس جھینپ گیا۔ کیونکہ شمیم چاچی اس کی ہونے والی ساس تھیں۔ اور سیف لالہ کے حوالے سے یہ گھرانہ بھی نگینہ کے معاملے میں کافی حساس رہا تھا۔

"آمد تو اچھے آثار کا پتا دے رہی ہے۔" دونوں نے دیکھا تھا کہ سب ہی خواتین بڑے

پرجوش انداز میں بطور خاص نگینہ سے ملنے اور اسے بارات میں ساتھ لے جانے کی خاطر وہاں آئی تھیں۔ اندر سے اب قہقہوں اور ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ اسفند اور رئیس نے اپنے اپنے دل سے وہموں اور خدشات کی دھند کو ہلکا ہلکا چھٹتا محسوس کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ صحیح معنوں میں نصیر لالہ کی شادی میں وہ اب تک خود کو دل سے شامل نہیں کر پائے تھے۔ نگینہ کے آجانے اور اسے دیکھ لینے تک جو ایک بھاری پن سا سوار تھا اب حقیقتاً زائل ہوتا محسوس ہوا اور اب دونوں کا دل نصیر لالہ کی بارات میں پورے جوش اور جذبے سے شامل ہونے کو مچلنے لگا۔

''آؤ ذرا، ان سب نے یہاں دھرنا دیا ہوا ہے، ہماری ضرورت کہیں وہاں نہ ہو۔'' اسفند شرارت سے مسکرا کر زبردستی اسے درمیانی دروازے کی طرف کھینچ کر لے گیا کیونکہ مائیں تو یہاں آگئی تھیں۔ بیٹیاں وہاں رباب کے پاس تھیں۔ بارات بھی آچکی تھی۔ درمیانی دروازے سے پچھلے صحن کا نظارہ کرتے دونوں نے مردانے میں جانے کا ارادہ کیا۔

☆☆☆

ساتھ تیرا ہے تو ہر راہ گزر روشن ہے
اے مرے چاند یہ ہستی کا سفر روشن ہے

وہ اس کی لڑکپن کی محبت تھی۔ دن تاریخ یا وقت تو ٹھیک سے یاد نہیں۔ کہ لمحوں کی قید سے آزاد یہ عشق بظاہر نرم سی اپنائیت کا تاثر دیتی پر درحقیقت مکمل اپنی جانب کھینچتی سی دو آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہوا تھا۔ وہ دیکھتی تو خاموشی سے تھی پر کر کچھ ایسا جاتی کہ ہر بار ہی اسے چونکا جاتی۔

وہ وقت جبکہ وہ خود بھی کچی پکی عمر کے مابین یار دوستوں کے ساتھ ہمہ وقت بھاگا دوڑا پھرتا تھا۔ دو آنکھیں اچانک اسے رک جانے پر مجبور کر دیا کرتیں۔ اُن دنوں انگور صرف جبار ماما کے باغ میں تھے، باقی سب ہی باغوں میں سیب خوبانی اور آڑو کے درخت تھے۔ وہ لڑکے چوری چھپے پتھر کی دیوار پھلانگ کر انگوروں کے گچھے توڑ لایا کرتے۔ مالی کی نظر سے بچنے کے لیے جلدی جلدی گچھوں کو باغ کے باہر پھینکا جاتا پھر خود بھی اچھل کر باہر آجاتے، اور باہر آکر وہ دیکھتا کہ اس کے انگوروں کے گچھے وہ اپنے دوپٹے میں سنبھال چکی ہوتی۔

''تم بھی لو۔ اتنی محنت جو کرتی ہو۔'' وہ آدھا گچھا اس کی طرف بڑھاتا۔

''پھل کے لیے کہاں آتی ہوں، مالی بابا کو دیکھتی رہتی ہوں، کسی دن پکڑے گئے تو برے پھنسو گے۔'' وہ اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتے اسے تنبیہ کرتی۔

''اچھا۔ اور تمہارا اپنا بھائی۔ وہ پکڑا جائے تو خیر ہے؟'' نصیر ہنس کر پوچھتا تو رباب منہ بناتی۔

''وہ تیز ہے خود کو بچالیتا ہے لیکن تمہاری لمبی ٹانگوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ یاد ہے پچھلے سال مار کھا چکے ہو۔''

''تمہیں یاد ہے؟'' وہ خجل سا ہو کر سر کھجاتا اور رباب ہنس کر اپنے باغ کی طرف بڑھ جاتی۔

اور آج...... دودھ کا گلاس ہاتھ میں لیے سامنے کھڑی گھبرائی گھبرائی سی رباب کو دیکھ کر اسے بے اختیار انگور بچاتی وہ چودہ پندرہ سال کی رباب یاد آگئی، وہ مسکراتے ہوئے قریب آیا اور اس کے گلاس تھامے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔

''اس طرح کیوں کھڑی ہو؟''

''وہ زیبا باجی یہ گلاس دے گئیں تو......'' وہ شرم کے زیر اثر مکمل بول بھی نہیں پائی تھی

''اس دوپہر جب تم نے پہلی بار میرا انگوروں کا گچھا اپنے پلو میں لیا تھا رباب۔ تم تب بھی سرخ کپڑوں میں تھیں۔''

''تمہیں یہ بھی یاد ہے؟'' وہ بیڈ کے کنارے پر جھجک کر بیٹھتے، بنا اس کی طرف دیکھے بات کر رہی تھی۔

''تمہیں کچھ یاد نہیں؟'' وہ اسے دلہن کے روپ میں اب مکمل توجہ سے دیکھ رہا تھا۔

''تم خفا تھے نصیر! مجھے تو بس یہی یاد ہے۔'' وہ سر جھکائے کچھ سنجیدہ کچھ نادم سی اب تک اسی ایک بات کی وجہ سے پریشان تھی۔ درمیان کے چند مہینوں میں ایک تو شبنم کی وجہ سے بہت عرصہ آپس میں بات کرنے کا ذہن نہیں بنا اور کچھ وہ خود ہی ہمت نہیں کرتی تھی۔ اتنی مشکل سے تو نصیر نے نازنین کا کہا مان کر شادی کے لیے ہامی بھری تھی۔ رباب نہیں چاہتی تھی ان کی آپس کی باتوں میں پھر سے تلخ موضوع چھڑ جائیں اور بنا بنایا معاملہ بگڑ جائے۔

''ہاں خفا تو بہت تھا۔'' وہ اسے اس نئے روپ میں بغور دیکھتے گویا ہوا تو رباب کا دل پہلے ہی جملے پر دھک سے رہ گیا۔ پریشان ہو کر نصیر کی صورت دیکھی۔

''لیکن میرا یہ باغی دل ہے ناں۔ یہ تم سے ملا ہوا ہے۔ مان جانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اور آج یہ اتنا خاص بہانہ کیا کم ہے کہ منانے والی اس روپ میں مقابل ہے۔''

''لیکن یہ سچ ہے نصیر۔ تمہیں پانے کے لیے میں جائز حد سے آگے بڑھ گئی تھی، اور وہ تجربہ بہت تکلیف دہ تھا۔ میں صرف پشیمان نہیں ہوں اس بات کی وجہ سے اب تک تکلیف میں ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر اس کے سامنے اس کے قدموں میں آبیٹھی۔ دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے تو آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ نصیر کو پالینے کی خوشی بھی اس درد کو کم کرنے میں کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی جو وہ مہینوں سے سہہ رہی تھی۔ اور اسے اپنے کیے سے نظر چُرا کر اپنی زندگی کو شروع نہیں کرنا تھا۔ اس جرم کو قبول کر کے نصیر کی معافی طلب کر کے آگے بڑھنا تھا۔ نصیر نے گھٹنے پر رکھے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر نرمی سے تھپکا۔

''تمہیں جانتا نہ ہوتا رباب! تو شاید اپنا ظرف کشادہ نہ کر پاتا لیکن میں تم سے بھی واقف ہوں، تمہاری محبت سے بھی۔۔ اور جانتا ہوں کچھ کوتاہیاں مجھ سے بھی سرزد ہوئی ہیں جنہوں نے تمہیں جلد بازی میں غلطیاں کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن میں نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کوئی فیصلہ عجلت میں نہیں کروں گا۔''

''آج اگر تم میری بیوی بن کر میرے پاس موجود ہو تو اس لیے کیونکہ میں اس بات پر اپنا دل صاف کر کے آگے بڑھا ہوں۔ اور تمہاری پریشانی بھی سمجھ رہا ہوں، اس لیے وعدہ کرتا ہوں کہ یہ بات کبھی بھی ہمارے درمیان نہیں آئے گی اور نہ تم دہراؤ گی۔''

''اُٹھو۔'' اسے اٹھنے میں مدد دیتے نصیر نے اپنے قریب بٹھایا۔

''ان لمحوں کی خوبصورتی کو محسوس کرو رباب۔ میرے لیے تو یقین کرنا بھی مشکل ہے۔ کیسی کیسی پہاڑ جیسی رکاوٹیں اس پروردگار نے خود بخود دور کر دیں۔ میں اور تم جنہیں اُس وقت سوچنے بیٹھتے تھے تو سوائے مایوسی کے کچھ ہاتھ نہ آتا تھا۔ اور پھر جو کچھ پچھلے دنوں ہوا۔'' وہ کہتے کہتے رکا پھر سر جھٹک کر ہنس دیا ''چلو وہ سب یاد نہیں کرتے۔''

''تم نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا نصیر۔'' وہ سر جھکائے بیڈ شیٹ کے ابھرے پھول کو ناخن سے کھرچ رہی تھی۔

''ارے نہیں نہیں۔ میں تو واسع اور نازنین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' نصیر نے جلدی سے وضاحت دی۔

''وہ نہیں۔'' رباب دھیرے سے منمنائی۔

''میں کچھ اور کہہ رہی ہوں۔''

''کچھ اور......'' وہ چونکا۔ ''کیا؟''

''مہینوں گزر گئے، اب تم مجھے اُن ناموں سے بھی نہیں بلاتے، تمہارا دل نہیں چاہتا اب۔''

''کیونکہ اب تو پوری زندگی پڑی ہے نا۔'' وہ اس کے کان کے قریب آیا۔ ''ان ناموں اور ان جیسے بے شمار دوسرے پیارے پیارے ناموں سے بلانے کے لیے۔ تھوڑی مہلت تو دو خانم، نصیر خان کا بھی پہلا بیاہ ہے، اتنی گھبراہٹ تو جائز ہے اب۔''

”پہلا بیاہ؟“

رباب نے پہلے خفگی سے گھورا پھر مکا تان لیا۔

”توبہ جنگلی، شائستے، شیرینے، جانے۔ پہلا اور آخری بیاہ۔“ نصیر نے کان پکڑ کر فوراً صلح کی پھر ہاتھ بھی جوڑ دیئے۔ پیار کے نام بھی خود بخود منہ سے جھڑنے لگے۔ رباب نے ہنس کر اس کے ہاتھ چھڑوائے۔

”ماخان پہ مخ چپیڑ را کی، ماترمخ لاس نہ نسی۔“ (میرا خان مجھ پر ہاتھ اُٹھا دے لیکن میرے آگے جوڑے بھی نہیں)۔

”ہوں۔ قائم بھی رہنا اپنے اس دعوے پر۔ تم بیویاں بڑی بلیک میلر ہوتی ہو۔“

”تو تم مجھ پہ ہاتھ اٹھانا چاہتے ہو؟“ رباب نے خفگی سے اسے گھورا اور نصیر نے مسکرا کر آرام دہ حالت میں بیٹھتے شانوں سے تھام کر رباب کا رخ اپنی جانب پھیرا۔

”سوچنا بھی مت لیونئے۔ شوہر کے ہاتھ اس کے مضبوط بازو اپنی بیوی کے لیے تحفظ کا حصار ہوتے ہیں، ”حق“ جس رشتے کا سب سے خوب صورت نام ہے، اس کا ایسا استعمال کوئی کم ظرف ہی کرے گا۔“

”ہاں اور میرا نصیر نہ کم ظرف ہے نہ بے حس۔“ رباب نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے تو پلکیں پھر سے بھیگنے لگیں۔ ”میں تمہارے جتنی اچھی تو نہیں نصیر لیکن تمہارے اپنی زندگی میں ہونے پر فخر تو کرسکتی ہوں، پھر دیکھنا ایک دن تمہارے جیسی بھی بن جاؤں گی۔“

”تم بہت اچھی ہو رباب، بس تھوڑی سی نادان ہو، جذباتی ہو، ضبط اور حوصلہ جلد کھو دیتی ہو اور۔“

”اب بس بھی کرو۔“ رباب تو خامیوں کی لسٹ لمبی ہوتے دیکھ کر روہانسی ہونے لگی۔ نصیر نے لطف لیتے زور سے قہقہہ لگایا اور وہ بھی جھینپ کر اس کے کندھے سے آلگی۔

☆☆☆

ولیمے کا فنکشن دوپہر کو بمشکل ہی اپنے اختتام کو پہنچا تھا کہ ذکی اپنی جیپ کی چابی اٹھا کر کان مہترزئی والی کوٹھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ اگلے روز دوپہر کو وہاں ان کی طرف سے خواتین کی دعوت تھی۔ اسے وہاں اس حوالے سے کچھ ضروری انتظامات کرنے تھے۔

یہاں آکر اب صفائیوں وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد اور چوکیدار خلیق احمد کو اگلے دن سے متعلق چند ضروری ہدایات دینے کے بعد وہ بڑے ہال سے ملحقہ کچن کے دروازے میں شگوفہ بی بی کے مقابل کھڑا تھا۔ جیب سے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر شگوفہ بی بی کے سامنے لہرائے۔

”یہ پانچ کام ہونے سے پہلے، اور باقی پانچ کل مہمانوں کے چلے جانے کے بعد۔“

”خان میں پوری کوشش......“

”اونہوں۔“ ذکی نے نوٹ اپنی طرف کیے۔ ”کوشش سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے اب تم میری ہدایات کو غور سے سنو، اور ان پر عین اسی طرح عمل کرتی جاؤ تو کل کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔“

”جی خان! جیسا آپ کہیں۔“ اس کی نظر ذکی کے ہاتھ میں دبے نوٹوں پر تھی۔

”صبح دس ساڑھے دس بجے کے قریب وہ سب تین گاڑیوں میں یہاں پہنچیں گے۔ ڈرائیورز ان کو چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے۔ مہمانوں کے لیے یہ بڑا ہال، سامنے والے تین کمرے، اٹیچ باتھ، یہی کچن، برآمدہ اور لان کھلے رہیں گے۔ پچھلا سارا پورشن میں ابھی لاک کر کے جاؤں گا۔ کل سب کے یہاں پہنچ جانے کے بعد میں پچھلے گیٹ سے اندر آؤں گا اور چپکے سے چھت والے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ کسی کو میرے یہاں آنے کی خبر نہیں ہوگی سوائے تمہارے۔ یہ موبائل فون اپنے پاس رکھو، اپنے میاں کو بھی معلوم نہ ہونے دینا اس کے بارے میں۔ بلکہ کل صبح تک اسے یہیں کچن میں چھپا جانا۔ کل صبح کے بعد آن کر کے اپنے پاس رکھنا۔“ ذکی

نے ایک چھوٹا سادہ سا موبائل اس کے ہاتھ پر رکھا۔
''پہلے میں کال کر کے تمہیں اپنے آنے کی اطلاع دوں گا۔ پھر تم نیلم بی بی کے پاس جا کر اسے باورچی خانے کسی کام سے بلانا اور وہیں مصروف رکھنا۔ وہ میزبان ہے اس لیے لازمی ادھر ہی رہے گی۔ جیسے ہی وہ کچن میں بزی ہو۔ تم چپکے سے نازنین کے پاس جانا۔ اور ہاں مہمانوں کے آتے ہی ان سب کا تعارف لے لینا تو نازنین کا پتا چل جائے گا۔ اور میں احتیاطاً اس کی تصویر بھی دکھا دیتا ہوں۔ خیر تو تم اسے اس طرح بلانا کہ سوائے اس کے کوئی متوجہ نہ ہو۔ تم اسے فوراً ہال کمرے سے باہر لے آنا اور کہنا کہ نیلم بی بی نے آپ کو چھت پر بلایا ہے۔ اور اسے سائیڈ والی گلی سے پچھلے حصے میں لے جا کر چھت پر لے آنا۔ اور بس ایک بار وہ کمرے میں داخل ہو جائے آگے میں سنبھال لوں گا۔ تم فوراً نیچے جا کر باہر لان کے ساتھ والے باتھ روم کا دروازہ بند کر کے اس کے باہر کھڑی ہو جانا۔ کوئی بھی وہاں نازنین کا پوچھتا ہوا آ جائے تو کہنا کہ وہ اندر باتھ روم میں ہیں اور تمہیں باہر رکنے کو کہا ہے۔ یوں اس کو تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جائے گی۔ خواتین مطمئن ہو جائیں گی۔ بس پھر اس باتھ روم کے باہر تب تک رکی رہنا جب تک میری کال نہیں آتی۔ جونہی میں کال کروں تم پیچھے اپنے کوارٹر میں غائب ہو جانا اور مہمانوں کے رخصت ہونے تک کسی کو دکھائی مت دینا۔ نہ تمہارا نازنین سے دوبارہ سامنا ہوگا نہ وہ تم سے کچھ پوچھ سکے گی۔ اور اندر کے کاموں کے لیے ہم گھر سے ہی کام والیوں کو ساتھ بھیج رہے ہیں۔ وہ خود سنبھال لیں گی۔''

''صاحب! وہ شور تو نہیں مچادے گی واپس آ کر۔''

''ارے شور کیوں مچائے گی۔ وہ تو میری منگیتر ہے، ہماری عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ میں تو اسے سرپرائز...... مطلب......'' وہ سوچنے کے لیے رکا۔ ''بھئی اسے اچانک حیران کرنا چاہتا ہوں وہ تو بہت خوش ہوگی میری شرارت پر۔''

''تو خان! پھر اتنے پیسے اور...... مجھے چھپانا۔''

شگوفہ بی بی نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا کہ جو وہ سمجھ رہی تھی، دراصل ہونے تو وہی جا رہا تھا لیکن ذکی اپنی کمزوری اس پہ ظاہر کر کے کل کو اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

''وہ سب تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں۔ جتنا کہا جائے، اتنا کرو۔'' ذکی نے جان بوجھ کر لہجہ سخت کیا اور گیلری میں سے نصیر کی شادی کی تصویریں نکالنے لگا۔ زنانہ حصے کی تصویریں اس نے نیلم کے موبائل سے نکالی تھیں۔ ان ہی میں سے نازنین کی ایک تصویر شگوفہ کے سامنے کی۔

''یہ نازنین ہے، دھیان سے دیکھ لو۔''

''جی خان ٹھیک ہے۔ پر خان! وہ رمضان شریف آ رہا ہے ناں۔ دو مہینے کا راشن بھی ڈلوا دیتے۔ اتنے بچے ہیں۔ پوری نہیں اترتی۔''

''ہاں ہاں وہ بھی ہو جائے گا۔'' ذکی نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کنٹرول کی۔ شگوفہ بی بی کا انتخاب کر کے اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ یہ واقعی نوٹوں سے چلنے والی مشین تھی۔ روپے دے کر کچھ بھی کروانا آسان تھا۔

''بس اب مکمل احتیاط برتنی ہے ہر معاملے میں۔''

''خان! اب میں بالکل سمجھ گئی۔ سب ویسے ہی ہوگا جیسا آپ چاہ رہے ہیں۔''

''ہوں۔ ہوشیار رہنا، ان سب کے پہنچتے ہی میں بس آدھے گھنٹے میں آ جاؤں گا۔''

''جی خان۔'' اس نے تابعداری سے سر ہلایا اور ذکی اسے نوٹ تھما کر باہر نکل آیا۔

☆☆☆

نغمہ اس سے دو روز سے خفا تھی کیونکہ اس نے دادی اور نازنین کے سامنے اسے جھاڑ دیا تھا۔ اب وہ منہ پھلائے گھوم رہی تھی، سیف نے کمرے سے نکلتے روک لیا۔

"ابھی تک غصہ ہو؟" وہ اسے مسکراتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نغمہ نے خفا ہو کر منہ پھیر لیا۔
"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"
"ہاں ویسے فرق تو کوئی نہیں پڑتا۔" وہ کچھ شرارتی سے موڈ میں تھا "جانتی ہو کیوں؟"
"کیوں؟" نغمہ نے اس کے جملے پر ٹھٹک کر دیکھا تو وہ پہلے مسکرایا پھر ایک دم سنجیدہ ہوا۔
"کیونکہ میں چاہے تم سے جتنا بھی جھگڑا کرلوں، کتنا بھی برا بھلا کہہ دوں، حتیٰ کہ ہاتھ بھی اٹھا دوں تو مجھے یقین ہوتا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤ گی۔"
"اس لیے اتنا جھگڑا کرتے ہو۔" وہ مزید دکھی ہوئی۔
"ہاں میں مانتا ہوں، میں نے تمہاری محبت کی اس طرح قدر نہیں کی، لیکن تمہارے معاملے میں میری لاپروائی دراصل تمہاری محبت کا دیا اعتماد ہے۔ آج میں کسی اور کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا تو زندگی اس کا دل جیت لینے کی جدوجہد اور احساس کمتری میں بیت رہی ہوتی، اور چاہے جانے کا فخر شاید پوری عمر گزار لینے پر بھی میرے ہاتھ نہ آتا۔ اور وہ زیادہ تکلیف دہ لائف ہوتی۔"
"تم خوش ہو میرے ساتھ سے؟" نغمہ کی پلکیں خوشی سے بھیگنے لگیں۔
"اب رہنے [illegible] ہوں نغمہ! اور تمہیں یہ خوشی وقت کے ساتھ خود ہی دکھائی دے گی۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"
"تمہیں ایک خوش خبری سنانی تھی۔" وہ تھوڑی دیر کو جھجکی۔
"ہوں۔ اچھا؟" دو قدم پیچھے ہٹ کر ابرو سکوڑتے وہ بغور اسے دیکھنے لگا تو اس نے جھینپ کر سر ہاں میں ہلایا۔
"دعا مانگنا سیف! اللہ پاک اس مرتبہ بیٹا عطا کرے۔"
"دعا بھی ضرور مانگیں گے لیکن جو [illegible] عطا کرے گا، وہ اس کی تقسیم ہوگی اور ہمارے بھلے کے لیے ہوگی۔ خود کو ان مہینوں میں بلاوجہ پریشان مت رکھنا۔"
"تم میرے ساتھ ہو تو پریشانی کیسی۔" وہ تھوڑا سا آگے آئی تو سیف نے پیار سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
"ابھی ابھی تو واپس آیا ہوں۔ اب ہمیشہ ساتھ رہنا ہے۔"
"ان شاء اللہ۔" دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ کر بیک زبان مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

"سب نیچے تیار ہو رہے ہیں۔ اس ٹائم کیوں بلایا۔" نازنین ہوا سے ہلکے ہلکے اڑتے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کرتی ناراض نظروں سے واسع کو دیکھ رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب خواتین جبار چاچا کی دوسری کوٹھی کے لیے نکل رہی تھیں۔ واسع نے کال کرکے اسے چھت پر بلایا تھا اور وہ دن کی روشنی میں چھت پر آنے سے کچھ خفا خفا دکھائی دے رہی تھی۔ جبکہ واسع ان سب سے بے نیاز اسے خاموش نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔
"بہت جلدی تیار ہو گئیں؟" واسع نے اپنے گھنے براؤن بالوں میں انگلیاں ڈال کر انہیں پیچھے کیا، ماحول ہلکی آندھی جیسا ہو رہا تھا۔
"جی آپ کی وجہ سے جلدی تیار ہو گئی۔ باقی سب ابھی تیار ہو رہے ہیں۔"
"لیکن کالا ڈریس کیوں؟" وہ اس کی تیاری کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لے رہا تھا، نازنین نروس ہو گئی۔
"کیا اچھا نہیں لگ رہا کالا ڈریس؟"
"اچھا نہیں۔ بہت زبردست۔ کسی عاشق کے "خوابوں کی نازنین (محبوبہ)" لگ رہی ہو۔" واسع نے مسکراتے ہوئے کہنیاں دیوار پر ٹکائیں۔ وہ خود سفید کاٹن کے شلوار قمیص کے ساتھ کالی واسکٹ پہنے شاید عدالت جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔
"بلایا کیوں؟" وہ اس کے مسلسل دیکھے

کی وجہ سے شرما رہی تھی، گلابی چہرا لیے بنا اس کی جانب دیکھے پوچھا۔

''بس یونہی، تمہیں دیکھنے کے لیے۔'' وہ آج نہ سمجھ میں آنے والے موڈ میں تھا۔ نازنین جواباً چپ ہی رہی۔

خواب میں ساتھ تھے ہم، چاند میری مٹھی میں
تم جو چاہو اسے تعبیر بنا سکتے ہو

واسع نے کچھ دیر کی خاموشی کے وقفے کے بعد آہستہ روی سے کہا تو نازنین نے یونہی سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور واسع نے پلکیں موند کر سر اثبات میں ہلایا۔

''رات واقعی خواب میں دیکھا تھا۔ سوچا سچ بھی کر لیتے ہیں۔''

''اچھا، کیا دیکھا؟'' نازنین کو اشتیاق ہوا لیکن واسع کے ماتھے پر ایک گہری لکیر سی ابھر کر معدوم ہوئی۔

''یونہی بس ملا جُلا سا''۔ وہ جیسے گریز کر رہا تھا۔

''پریشان ہیں آپ؟'' وہ متعجب ہوئی۔

''ایسا کیا تھا خواب میں؟''

''کچھ خاص نہیں۔ بس صبح صبح دماغ پر ذرا زیادہ اثر ہوتا ہے خواب کا۔ اپنا خیال رکھنا۔'' رسان سے مسکرایا لیکن نازنین جواباً نہیں مسکرا سکی۔

''میرا جانے کو بالکل دل نہیں واسع۔ لیکن یہاں گھر پر کوئی خاتون بھی نہیں ہے آج۔ ورنہ میں رُک جاتی۔''

''تمہارا دل کیوں نہیں چاہ رہا؟''

''معلوم نہیں۔ بس آج دل کر رہا تھا سب چلے جائیں اور میں اکیلے میں بیٹھ کر آپ سے ڈھیر ساری باتیں کروں، چاہے فون پر ہی سہی۔'' نازنین نے معصومیت سے اپنے دل کی بات کہہ دی اور واسع بس مسکرا کر دیکھتا ہی رہا۔

''کوئی بات نہیں۔ جی بھر کہ باتیں کریں گے۔ اب تو بس گیارہ دن باقی رہ گئے۔ دعا کیا کرو نازنین! کہ اللہ پاک اس ساتھ کی عمر طویل کرے جس کا ایک ایک پل تمہاری سنگت میں گزرے گا۔ اس آنے والے وقت میں صرف محبت ہوگی۔ پھر کوئی رکاوٹ کوئی مجبوری نہیں۔ گیارہ دن بعد میرا جہان، میری دنیا تم سے مکمل ہوگی نازنین!''

''جی ان شاء اللہ۔'' اس نے نظر اٹھا کر واسع کو دیکھتے اس کی خواہش اور اپنی دعا کو مسکرا کر مکمل کیا۔

''اچھا تو کیا باتیں کرنی تھیں؟'' واسع کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔

''اتنی بہت ساری باتیں ہیں، ابھی کیسے بتا سکتی ہوں۔'' وہ شرما کر ہنسی ''ابھی کوئی بلا لے گا۔''

''واپسی کب ہے؟''

''دوپہر کے کھانے کے بعد۔''

''جلدی آنا، میں انتظار کروں گا۔''

''میں تو چاہتی ہوں آپ ہمارے ساتھ چلیں۔'' وہ پہلی مرتبہ کھل کر ہنسی اور واسع کا دل اس کی ہنسی نے شاد کر دیا۔

''مجھے تو لگتا ہے تم ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ ہوتی ہو۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے''۔ وہ نیچے دیکھتے اقرار کر رہی تھی۔

''یہی سننا چاہ رہا تھا۔ خوش رہو۔'' اس نے مسکرا کر ہاتھ ہلاتے قدم پیچھے ہٹائے اور نازنین کا دل کسی نامعلوم خدشے کے تحت دھڑکا۔

''واسع!'' وہ بے ساختہ پکار بیٹھی۔

''جی۔'' وہ بھی رک گیا۔

''آپ آفس جا رہے ہیں؟''

''ہوں۔ آفس ہی جا رہا ہوں، خیریت؟''

''اس دن مجھے وہم ہوا تھا۔ وہ آپ کسی سے بات کرتے ہوئے گھر سے نکلے تھے۔ بائیک چلاتے وقت موبائل پہ بات مت کیا کریں۔ اس روز بھی اللہ پاک نے مدد فرمائی، احتیاط کیا کریں۔''

''تو...... آج بھی کوئی وہم؟''

''نہیں نہیں، اللہ نہ کرے۔'' اس نے بے ساختہ ہاتھ دل پہ رکھا۔ ''وہم نہیں، بس ایک وعدہ لینا

ہے۔“

”ہاں، ضرور۔“ وہ واپس دیوار کے قریب آیا۔

”کیسا وعدہ؟“

”وعدہ کریں، اپنی نہیں، آئندہ میری خاطر اپنی جان کی حفاظت کریں گے۔ مجھے یقین ہے اس وعدے کے بعد آپ لاپروائی نہیں برتیں گے۔“ وہ اعتماد سے مسکرائی تو واسع بھی ہنسا۔

”یہی وعدہ مجھے بھی لینا چاہیے۔ تاکہ تم بھی کبھی اپنے معاملے میں غفلت نہ برتو۔“

”منظور ہے۔“ اس نے بچوں کی طرح سر ہلایا اور دونوں ہی کھل کر ہنس پڑے کیونکہ — کچھ دیر سے ان دونوں کی باتیں یونہی بچکانہ سی تھیں۔

”اوکے۔ اللہ حافظ۔ جلد ملیں گے، دوبارہ۔“

”جی۔ اور یہ ان شاء اللہ ہمیشہ بس مجھے کہنا ہوگا؟“

”ہاہاہا ان شاء اللہ۔“ وہ ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کر سیڑھیاں اتر گیا۔ اور نازنین کچھ دیر بعد تک — یوں کھڑی رہی جیسے اس اثر سے نکلنے، نیچے اترنے اور کسی دوسرے ماحول میں جانے کو قطعی تیار نہ ہو۔ لیکن بہر حال جانا تو تھا۔

☆☆☆

سبز اور پیلے کھلے شوخ کپڑوں، زیور اور میک اپ کے ساتھ نئی نویلی دلہن کے روپ میں رباب کے حسین روپ کو نصیر نے دل و نظر میں اتارتے مسکرا کر معنی خیزی سے دیکھا اور وہ گھبرا کر اماں اور زمرد کو دیکھنے لگی لیکن وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے میں مگن تھیں اس لیے رباب نے شرما کر دوبارہ نصیر کو دیکھا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو۔“ بظاہر موبائل کان سے لگاتے اس کے قریب سرگوشی کرکے آگے نکل گیا۔

یہاں سب تیار تھے جانے کے لیے۔ اس نے جبار ماما کا نمبر ملایا لیکن بزی جا رہا تھا۔ دوسرا نمبر اس کے پاس ذکی کا تھا لیکن عرصہ ہوا نصیر نے اسے مخاطب کرنا چھوڑ دیا تھا۔ واسع کے حادثے نے اس کا بہت دل برا کیا تھا۔ اب اس کا ذکی سے بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے جبار ماما کو بتانے کے لیے خود ہی ان کے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ درمیان میں دو ہی تو گلیاں تھیں۔

ڈیرے کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہونے کے لیے اس نے قدم اندر رکھے ہی تھے کہ کانوں میں ذکی کی آواز پڑی۔ گیٹ سے داہنے ہاتھ کی اونچی باڑھ کے پیچھے اس کا سر نظر آیا اور کان سے لگا موبائل فون۔ وہ گیٹ کی طرف پیٹھ کیے کسی سے بات کر رہا تھا۔ نصیر اس کی پروا نہ کرتے گیٹ کے اندر آ چکا تھا۔

”یہ لوگ دس کے بجائے ابھی نو بجے نکل رہے ہیں۔ تم فوراً چھت پر جا کر میرے لیے سیڑھی اور کمرا کھول آؤ۔ توفیق کو بھی پتا نہ چلنے دینا۔ میری جیپ اندر نہیں آئے گی۔ پچھلے گیٹ کے باہر رہے گی۔“ ذکی کی آواز میں پُراسراریت اور دھیما پن تھا۔ نصیر کے کان چھت والی بات سن کر فوراً ہی کھڑے ہوئے تھے، تب ہی بروقت ذہن استعمال کرتے وہ وہیں نیچے بیٹھ کر بلاوجہ اپنی چپل کا بکل کھولنے لگا۔ کیونکہ ذکی بات کرنے کے دوران کبھی بھی پیچھے مڑ کر دیکھ سکتا تھا۔ لیکن باڑھ بیچ میں ہونے کی وجہ سے اب وہ نصیر کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

”میں ان سب کے نکلتے ہی بس آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔ ہاں صحیح۔“ ذکی آواز اس جملے کے بعد آنا بند ہوگئی۔ نصیر نے کھڑے ہو کر محتاط انداز میں اس طرف دیکھا لیکن اب ذکی وہاں نہیں تھا۔ نصیر بھی بجائے مزید آگے جانے کے وہیں سے واپس پلٹ آیا۔ ڈرائیور نادر کار میں بیٹھ چکا تھا۔ ساتھ اس کے بابا کھڑے تھے۔ زمرد، رباب اور اماں گھر سے نکل رہی تھیں۔

”تم رہنے دو نادر! انہیں میں چھوڑنے جاؤں گا۔“ نصیر نے جیب سے دھوپ کا چشمہ نکال کر آنکھوں پہ لگایا۔

”لیکن خان! آپ......“ نادر کچھ بوکھلایا جبکہ خلیل احمد مسکرا دیے۔
”بھئی جانے دو نادر! دولہا سے ایسی حرکات کی وجہ نہیں پوچھی جاتی۔“ وہ شرارت کر رہے تھے اور نادر بے چارا بھی کھسیا کر باہر نکل گیا۔ جبکہ نصیر جبراً چہرے پر مسکراہٹ لایا ــــ ورنہ دماغ ذکی کے جملوں کے بعد بھٹی کی طرح سلگ رہا تھا۔ معلوم نہیں کم بخت کے اب نئے عزائم کیا تھے۔ خدا غارت کرے اس شیطان کو۔ نصیر بے بسی سے بس دل ہی دل میں یہی کہہ کر رہ گیا۔

☆☆☆

”نیلم بچے! آؤ کنیز۔ دیر ہو رہی ہے۔“ نگار تیار ہو کر باہر برآمدے میں نکلیں تو نیلم نے اشارے سے چند منٹ انتظار کرنے کا کہا۔ سامنے ہی فرش پر خمارہ بی بی یاسمین اور گلاب کے ہار پرو رہی تھی۔ اسے رباب کے لیے تازہ پھولوں کے ہار لے کر نکلنا تھا۔ نگار عجلت میں واپس پلٹ گئیں۔ نیلم تین ہار اپنے بازو پر لٹکائے باقی ہار تیار ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”اے نیلم بی بی، خمارہ۔ ادھر غسل خانے کی طرف کوئی نہ جائے۔ پانی والا موٹر بھی آن نہیں کرنا ابھی، اس میں مسئلہ ہے۔ پیچھے آدمی ٹھیک کرنے آ رہا ہے۔“ نورہ بی بی نے ہاتھ ہلا کر اونچی آواز میں ہدایات دیں اور نیلم نے جواباً ہاتھ ہلا دیا۔ وہ تو تیار ہو چکی تھیں۔ غسل خانے کی طرف اب کیا کام ہو سکتا تھا۔ خمارہ بی بی نے مزید تین ہار اس کی طرف بڑھائے۔ اندر سے پھر نگار آواز دے کر بلانے لگی تھیں۔ خمارہ بی بی کام ختم کر کے پچھی اٹھائے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ نیلم نے ہار چارپائی کے پائے پر ٹکا کر چادر اوڑھی اور ہار اٹھا کر قدم اندر کی طرف بڑھا دیے۔

☆☆☆

کوٹھی کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ نصیر گاڑی اندر تک لے آیا۔ مسلم باغ سے ابھی باقی گاڑیاں روانہ بھی نہیں ہوئی تھیں اور وہ سب سے پہلے اپنی کار نکال لایا تھا۔ چوکیدار ان سب کو اندر تک لے آیا۔ پنکھے وغیرہ آن کر کے وہ باہر چلا گیا۔ خواتین کو اندر چھوڑ کر نصیر واپس گاڑی میں بیٹھ گیا۔ نکلتے وقت اس کی جبار ماما اور سیف لالہ سے بات ہوئی تھی۔ جبار ماما نے کہا کہ جو گاڑیاں تیار ہیں وہ نکل جائیں۔ کوٹھی کھلی ہے۔ نصیر کچھ اسی خیال سے سب کے ساتھ نکلنے کے بجائے پہلے ادھر آ گیا ــــ اسے ذکی کے ارادے بھی تو جاننے تھے۔ چوکیدار کو دکھانے کے لیے وہ لمبا چکر کاٹ کر گاڑی بظاہر نکال لے گیا تھا لیکن گھوم کر وہ کوٹھی کے پچھلے ویران گیٹ پر آ کھڑا ہوا تھا۔
ذکی کی ہدایات کے مطابق اس گیٹ کو کھول دیا گیا تھا۔ البتہ آدمی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس لیے نصیر گاڑی سے نکل کر پیدل چلتا ہوا اندر آ گیا۔ یہاں چھت کو جانے والی سیڑھیاں بھی سامنے دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ فوراً ہی سیڑھیوں کی طرف لپکا اور تیز قدموں سے اوپر آیا تو کمرے سے باہر نکلتی عورت اسے اچانک سامنے دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی۔
”کک......کون......؟“ وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی لیکن نصیر اس کی پروا نہ کرتے کمرے میں داخل ہو گیا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے ابل پڑیں کہ کمرے کے بیچوں بیچ ایک ڈبل بیڈ کو دلہن کی سیج کی طرح سجایا گیا تھا۔
”یہ......کس لیے؟“ وہ دروازے سے چپکی کھڑی عورت کی طرف بڑھا۔
”کک......کسی کے لیے نہیں۔ یہ کمرا تو ایسے ہی رہتا ہے۔“ وہ بمشکل منمنائی۔
”ایسے ہی رہتا ہے۔“ نصیر نے دوبارہ بیڈ کی طرف دیکھا جس پر تازہ پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو ہم آئے تھے۔“ اس نے فی الفور جھوٹ گھڑا اور آگے بڑھ کر عورت کی گردن کو اپنے ہاتھ میں دبوچا۔
”کس کے کہنے پر کیا یہ سب۔ کون آنے والا تھا یہاں؟“ نصیر نے ــــ جیب سے پستول نکال کر

اس عورت پر تانا جو وہ نکلتے وقت اپنے ساتھ لایا تھا۔
"صص...... صاحب۔" عورت کی پستول دیکھ کر سٹی گم ہوگئی۔
"سچ بتادو گی تو چھوڑ دوں گا۔ ورنہ......"
نصیر نے پستول اس کے سر پر تانی۔
"بب...... بتاتی ہوں۔ وہ ذکی خانا آنے والے ہیں۔ اپنی منگیتر کے ساتھ۔"
"کون منگیتر...... کیا نام ہے؟" نصیر کا دماغ مزید گرم ہوا۔
"نازنین!" عورت نے فوراً دوسرا نام اُگلا اور نصیر کا دماغ پھٹنے کے قریب ہوگیا۔
"سب کچھ بکو۔ شروع سے۔" اس نے دباؤ بڑھایا اور شگوفہ بی بی فرفر بولنے لگی۔

☆☆☆

واسع عدالت کے احاطے میں بائیک کھڑی کرکے ابھی وہیں ٹھہرا ہوا تھا جب موبائل پر نصیر کی کال آتی دیکھی۔ سبز بٹن دبا کر موبائل خاموشی سے کان کے قریب کیا۔
"ہیلو واسع! مجھے سن رہے ہو۔" وہ چھت کی سیڑھیاں تیزی سے اتر کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔
"ہاں نصیر!"
"جانتے ہو ذکی نے کیا کیا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا اس کم بخت سے ہوشیار رہو۔ آج کا سارا لیڈیز پروگرام اسی کے شیطانی دماغ کی پیداوار تھا۔ صبح میں نے فون پر اس کی کچھ مشکوک باتیں سنیں تو ڈرائیور کے بجائے گھر والوں کو خود چھوڑنے یہاں آگیا۔ اور یہاں آکر معلوم ہے کیا ہوا۔" وہ گاڑی میں بیٹھ کر واسع کو یہاں کی ساری تفصیل بتانے لگا۔
"اب سوچو ذرا اس خبیث کی نیت، اس کے ارادے ہمیشہ کتنے خطرناک رہتے ہیں اور تم اسے کبھی سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ دیکھنا واسع! اس بار میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ آج تو اسے میں جان سے ماردوں گا۔"

"نصیر! تم گھر والوں کو لے کر فوراً واپس آؤ۔" سیف لالہ کو آدھے راستے سے کال کرکے بلالیا تھا۔ یہاں کچھ مسئلہ ہوگیا ہے۔"

☆☆☆

نیلم جس وقت کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی اسے پیچھے صحن میں ایک دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔ نیلم چونک کر مڑی۔ اردگرد دیکھا لیکن کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تو پھر...... نظر اچانک غسل خانے پر پڑی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مطلب ابھی ابھی کوئی اندر گیا تھا اور اسی دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی تھی۔
"اوہ۔" نیلم کا دل شدت سے دھڑکا۔ نورہ بی بی کی بات یاد آئی اور وہ تیزی سے بھاگ کر غسل خانے کے دروازے کے نزدیک آئی۔ دل میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ شاید دروازہ ہوا کے زور سے بند ہوا ہوگا۔ اور اگر ایسا تھا تو دھکا دینے پر کھل جانا چاہیے۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کو اپنی طرف کھینچا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اب وہ آواز تو نکال نہیں سکتی تھی۔ زور زور سے دروازہ بجانے لگی لیکن بجائے دروازہ کھلنے کے اندر سے ایک دل دہلا دینے والی آواز سنائی دی اور وہ چیخ سن کر نیلم کے منہ سے ایک زوردار "نہیں" کی آواز مہینوں کی طویل خاموشی کو توڑتی ہوئی کچھ یوں باہر نکلی کہ گھر کے درودیوار تک ہل گئے۔

☆☆☆

"ذکی اب ہم میں نہیں رہا نصیر! اس کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔"
"وہاٹ؟" نصیر کے ہاتھ میں کار کی چابی کانپ گئی۔
"اس کو بجلی کا کرنٹ لگا ہے۔ پانی کی موٹر میں گڑبڑ ہوگئی تھی۔"
"مائی گاڈ۔" نصیر نے اسٹیئرنگ پہ ماتھا گرایا۔
واسع بہت دیر سے اسی لیے آفس کی پارکنگ میں پتھر بنا کھڑا تھا۔ اسے گھر سے مجیب چاچا کی کال آئی تھی۔

اسے اب واپس جانا تھا لیکن جسم و جان شل ہو چکے تھے۔ ذکی تو زندہ نہیں رہا تھا، لیکن یہ وہ کیا کرنے جا رہا تھا۔

نازنین کی معصوم صورت اور ذکی کے مذموم ارادے تصور کر کے اس کے جسم میں جھرجھری آ رہی تھی۔ تھکے اعصاب کے ساتھ وہ بائیک پر بیٹھا۔

وہ پچھلی رات کا خواب۔ واسع نے سختی سے لب بھینچے۔ کالا ناگ پھن پھیلائے نازنین کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور وہ کالے کپڑوں میں آگے آگے خوف زدہ سی دوڑ رہی تھی۔ اس کی پھیلی آنکھوں میں انتہا کا خوف تھا اور تب ہی۔ ایک نادیدہ ہاتھ نے زور سے اینٹ پھینکی اور کالے پھن کا کچومر بنا دیا۔

☆☆☆

شبنم کے پہلو میں بنی تازہ کچی قبر کو دور قبرستان کے احاطے سے باہر کار کی کھڑکی سے نیلم نے دیکھا اور چہرا ہاتھوں میں دے دیا۔ دنیا سمجھتی تھی شبنم کے حادثے نے اس کی آواز چھینی تھی اور ذکی کے حادثے کی وجہ سے واپس آگئی۔ لیکن وہ بدنصیب نہ بے زبانی میں کبھی اپنا سچ کسی پہ ظاہر کر سکی تھی اور نہ اب گویائی واپس آجانے کے بعد کسی کو بتا سکتی تھی کہ کچھ سچ انسان کے رازدار دوست ہوتے ہیں۔ واسع کی محبت اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی۔ اور آگے بھی رہنی تھی کیونکہ پچھلے روز ایک سادہ سی تقریب میں اس کا محبوب نازنین کا جیون ساتھی بن چکا تھا۔

''چلیں بابا۔'' اس نے بھیگی آنکھوں کو دوپٹے سے صاف کرتے ڈرائیور سے کہا اور گاڑی قبرستان سے دور جانے لگی۔

☆☆☆

''آؤ نازنین! تمہیں کچھ دکھانا ہے، میری نظر سے۔'' واسع نے چھت کی سب سے اوپری سیڑھی پر پہنچ کر ہاتھ بڑھایا۔ پیچھے آتی نازنین نے مسکرا کر اپنا ہاتھ واسع کے ہاتھ میں دیا۔ شادی کی تیسری صبح جبکہ ——— مصروفیت سرد پڑ چکی تھی، وہ صبح سویرے اسے ساتھ لیے اپنی چھت پر آیا۔

کھلے نیلے رنگ کے کپڑوں میں گلابی میک اپ اور کھلے بالوں کے گرد ڈھیلا سا نیلا ریشمی آنچل لیے وہ اس صبح سے بھی کہیں زیادہ حسین نظر آتی تھی۔ چھت پر آتے ہی بال ہلکے ہلکے ہوا سے اڑنے لگے۔

واسع اس کا ہاتھ تھامے اس چار دیواری کے قریب لے آیا جہاں سے مسلم باغ کے کھلے میدان، دریائے ژوب اور ان کے باغات دکھائی دیتے تھے۔

''آپ کے گاؤں کا اتنا مکمل نظارا اس جگہ کے سوا شاید کہیں سے دکھائی نہیں دیتا۔ ہے نا؟'' نازنین کو بھی حیرت ہوئی کہ نغمہ باجی کی چھت سے تقریباً ہر جانب سے بند تھی۔

''ہاں یہ واقعی ایک مکمل نظارا ہے، میں نے یہاں آکر اپنے گاؤں کا سکون اس کی خوب صورتی دیکھتے اپنا ہر دکھ درد کم ہوتا محسوس کیا ہے۔'' واسع ہلکی مسکراہٹ لیے آج بھی بہت محبت سے اپنے گاؤں کو دیکھ رہا تھا۔

''لیکن یہاں سے آپ کا باغ بھی دکھائی دیتا ہے جو پچھلے کئی برس آپ کی دسترس سے بہت دور تھا۔ تکلیف تو ہوتی ہوگی واسع۔ اور حاصل کرنے کی خواہش بھی؟'' نازنین نے سوالیہ اس کی طرف دیکھتے جاننا چاہا۔

''تکلیف تو نہیں، ہاں حاصل کرنے کی خواہش ضرور تھی، نہ صرف باغ حاصل کرنے بلکہ کچھ بننے، ان لوگوں کے لیے کچھ کرنے، اپنی محبت کو پالینے کی دعائیں بھی یہیں کھڑے ہو کر مانگی ہیں، لیکن جانتی ہو ناز! وہ پروردگار عطا کب کرتا ہے؟'' واسع نے چار دیواری سے پشت ٹکا کر اپنا رخ اس کی جانب کیا۔ نازنین کے دونوں ہاتھ ابھی تک اس نے اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے۔ نازنین نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میرے بابا کہتے تھے دل کی مراد تب پوری ہوتی ہے جب وہ اس اوپر والے پر بھروسا کر کے مانگی جاتی ہے، اور انسان کا اپنے رب پر یہ بھروسا تب دکھائی دیتا ہے جب چھین لینے کی راہ بالکل

سامنے ایک ہاتھ کی دوری پر ہو لیکن وہ اپنے ہاتھ کو روک لے، کیونکہ اللہ پر توکل کرنے والوں کو اس راہ میں کہیں اس کی خوشنودی، کہیں رشتوں کا لحاظ کہیں اخلاقیات تو کہیں اذیت کی حدبندیاں وہیں رک جانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اور پھر یہ مسافت صرف اسی کے بھروسے طے پاتی ہے جس سے مانگا تھا۔

سچ تو یہ ہے ناز کہ انسان کی امیدوں اس کی خواہشوں کا اختتام اس کی آخری سانس تک ممکن نہیں۔ میرے لیے بھی یہ مقام، یہ باغ یہ محبت میری منزل نہیں، کیونکہ جب تک سانسیں باقی ہیں، ہر بڑھتے قدم کے ساتھ ترجیحات مقاصد، خواہشیں شکلیں بدلتی رہیں گی۔۔ اس لیے جذبات کو حواس کو ہر قدم پر اس حد میں لانا پڑتا ہے کہ وہ پروردگار جو میری خواہش میری طلب سے واقف ہے وہ مجھے کیا دکھانا چاہ رہا ہے، اور میں کیا دیکھ رہا ہوں۔"

"جی۔ بالکل۔" نازنین نے سر ہلا کر تائید کی اور ذہن میں ایک سر پھرے، جلد باز کا انجام جھرجھری بن کر اترا۔ "تکلیف کو مصیبت ہر کوئی سمجھتا ہے لیکن اسے "سزا" سمجھنے کا حوصلہ یہاں بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے۔"

"لیکن نازنین میرے لیے صرف "انعام" ہے، اس میں کوئی دورائے نہیں۔" واسع نے مسکرا کر اسے اپنے قریب کیا۔

"میں بھی یہیں کا ایک انگ، یہیں کا ایک حصہ تھی واسع اور مجھے یہیں پر آنا تھا، ہاں لیکن ہر راہ ہر کسی کے لیے آسان نہیں ہوتی۔ مجھے ایک لمبے راستے سے اپنی منزل تک پہنچنا تھا اس میں میرے سمجھنے کے لیے بہت سارے سبق تھے۔ کچھ سمجھ میں آئے ہوں گے کچھ دھیرے دھیرے سمجھ میں آتے جائیں گے۔" نازنین نے آخر میں مسکراتی نظروں سے واسع کو دیکھا۔ "کیونکہ اب آپ میرے ساتھ ہیں۔ میرا چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کا زاویہ یقیناً بدلے گا۔"

"اچھا۔" واسع نے اسے دلچسپی سے سنا۔ "تو چیزوں کو دیکھنے سمجھنے کا زاویہ پہلے کیسا تھا؟"

"بنا سوچے ریس۔" نازنین نے ـــــ بے ساختہ کہا اور واسع کا جاندار قہقہہ اٹھا۔ "اچھا۔"

"ہاں تو اور۔" نازنین نے منہ پھلایا۔ "بابا نے شادی فکس کی تو مسلم باغ پہلی دوڑ، ذکی نے رقعہ بھیجا تو درے کی طرف دوڑ، سیف لالہ نے برا بھلا کہا تو پہاڑ کی طرف۔" اب وہ یاد کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی انجوائے کر کے ہنستی جا رہی تھی۔

"اب تو کہیں نہیں بھاگو گی؟" واسع نے اسے اپنے قریب کرتے اس کا چہرا اوپر اٹھایا۔

"آپ سے کبھی نہیں بھاگی۔" وہ شرما رہی تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ مجھے پہلے دن سے شک ہو گیا تھا کہ یہی میرے پیر کاٹے گا۔" نازنین نے مصنوعی خفگی سے مکا اس کے سینے پر مارا۔ واسع اس کی شوخیوں پر ہنستا چلا گیا۔

☆

رخسانہ نگار عدنان

رشتے کی جو بات ہے

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بد دعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تاکہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد تین بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر





دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔

کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔

میرو خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میرو اسے منالے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔

موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔

آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔

دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔

آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔

میرو دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میرو شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔

وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میرو کے گریبان میں چہرہ چھپالیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔

دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔

آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔

کشف آنی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔

سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔

حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔

کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔

میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پر تکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔
کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔
زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اُسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔
ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
سونیا، زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔
آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔
کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آکر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔
ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں۔ میں ان کا کچھ نہیں۔
میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تیئیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔
کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔
کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔
کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آجاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔
حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آجائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔
موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آجائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آجاتی ہے۔
موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دیبی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آجاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔
آزر ماں اور بیوی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر

متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کرلیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہوجاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکرآنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر کپ توڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کررہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر ششدر رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر و جیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مرجائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہوجاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کردی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آزر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروالیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آنی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پوچھتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہوجاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آتی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔ کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

تیئسویں قسط

منصور کے چہرے کے تاثرات بدل سے گئے۔

بدترین حالات میں بھی اسے زینب سے اس بات کی امید نہیں تھی۔

''کیوں چلا جاؤں میں یہاں سے؟'' وہ تلخی سے بولا۔

''کیونکہ مجھے اور میری بیٹی کو پسند نہیں کہ تم یہاں رہو۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

''تمہاری بیٹی......او۔'' اس کا انداز صاف جتانے والا تھا۔

"نشانہ باندھنے کے لیے کسی اور کا کندھا کیوں استعمال کر رہی ہو، صاف کہو تمہارے اور حیدر کے درمیان جو کچھ چل رہا ہے اتنے سالوں سے، میرے آنے کے بعد اس میں رکاوٹ آ گئی ہے۔" وہ گھٹیا پن کی آخری حد کو چھو کر بولا تھا۔

اور زینب کا استری کرتا ہاتھ وہیں ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔

استری کے نیچے جلتے کپڑے کی بو نے اسے چونکایا۔

اس نے استری تیزی سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے پلگ زور سے کھینچ کر نکال دیا۔

"کاش منصور! تم واپس نہیں آتے۔ کم از کم میں تمہارا اتنا گرا ہوا روپ تو نہ دیکھ پاتی، تمہاری بے وفائی، تمہاری دھوکا بازی کے باوجود میں نے تمہیں دل میں کسی بڑے اونچے مقام پر بٹھا رکھا تھا کسی اوتار کی طرح آج وہ بت بھی گر کر پاش پاش ہو گیا۔" وہ مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہہ رہی تھی۔

منصور نے اسے چونک کر دیکھا۔

"تم اب یہاں رہو یا چلے جاؤ۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔" کہہ کر غصے میں باہر جانے لگی۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔" وہ اس کی کلائی سختی سے ہاتھ میں جکڑ کر بولا۔

"کم از کم وہ نہیں جو تم سمجھ کر یہاں آئے تھے۔"

وہ نظروں میں ڈھیر ساری نفرت سمو کر بولی اور اپنا ہاتھ زور سے چھڑا کر تیزی سے باہر جانے لگی۔

باہر کھڑی کشف اسے باہر آتا دیکھ کر بے جان قدموں سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

مزید کچھ سننا اسے دشوار تھا۔

"تم کیا سمجھتی ہو، میں یہاں صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔" وہ پیچھے سے زہر بھرے لہجے میں بولا۔

زینب ٹھٹک کر رہ گئی۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ تم جیسا خود غرض اور بے حس انسان اتنے سالوں بعد محبت کی ایک جھوٹی کہانی دہرانے کے لیے تو فقط آ نہیں سکتا۔ ضرور تمہارے آنے کے پیچھے کوئی بڑا مقصد ہو گا۔ بول دو۔" وہ رک رک کر اس کی طرف دیکھ کر سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی تھی۔

"میں یہ گھر بیچنے کے لیے آیا ہوں۔ مجھے ضرورت ہے پیسوں کی۔" بالآخر وہ اپنے دل کا مدعا زبان پر لے آیا۔ زینب کسی پتھر کی طرح کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

رمشا ہولے ہولے سونیا کے بالوں میں تیل کا مساج کرتے ہوئے اسے سکون پہنچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ردا! میری جان! بس کرو، تھک جاؤ گی۔" وہ آنکھیں بند کیے کسی دھیان میں گم کہتی اس کی انگلیاں تھام کر انہیں چومتے ہوئے بولی۔

رمشا کا مشکل سے سنبھلا دل پھر سے بلک بلک رونے لگا۔ اس کی آواز گلے میں پھندے کی طرح گھٹ کر رہ گئی۔

"میں رمشا ہوں ماما! ردا نہیں ہوں۔" وہ چاہنے کے باوجود ماں کو کہہ نہ سکی۔

اور اب تو یہ اکثر ہی ہونے لگا تھا، سونیا اسے ردا ہی پکارتی اور اسے یہ خیال بھی مشکل سے ہی آتا تھا کہ وہ ردا نہیں رمشا ہے۔

"باؤلی ہو گئی ہے سونیا تو بالکل ہی۔" سامنے بیٹھی طاہرہ غم سے بڑبڑا کر بولیں ان کی بوڑھی آنکھوں میں

آنسو تھمتے نہیں تھے۔
"السلام علیکم خالہ جان! سونیا کیسی ہو؟" زینب بہت دنوں بعد اسکول سے آنے کے بعد وقت نکال کر کشف کے ساتھ ملنے چلی آئی تھی۔
طاہرہ سلام کا جواب دیتے ہوئے کڑے تیوروں سے دونوں کا جائزہ لینے لگیں۔
"کیسی طبیعت ہے سونیا اب تمہاری؟" وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ رمشا اب ماں کے بالوں میں برش کر رہی تھی۔
سونیا نے جواب میں یونہی سر ہلا دیا۔
زینب کچھ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی اور کشف کو اشارہ کرنے لگی کہ وہ بھی سونیا کا حال پوچھے۔
"کیسی ہیں پھپھو آپ؟" اس کے آہستگی سے پوچھنے پر سونیا نے ذرا سا چہرہ گھمایا اور عجیب سی نظروں سے کشف کو دیکھتی رہ گئی۔
کشف اس کی نظروں سے کچھ خائف ہو کر انگلیاں چٹخاتی ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ سونیا نے ایک دم سے دونوں بانہیں پھیلا دیں۔
"ردا! تم آ گئیں میری بیٹی! میرے پاس آؤ میرے سینے سے لگ جاؤ آؤ ناں!" سونیا بانہیں پھیلائے اسے پکار رہی تھی۔
کشف کنفیوز سی ماں کو دیکھنے لگی جس نے اسے سونیا کے پاس جانے کا اشارہ کیا تھا۔
وہ جھجک کر سونیا کے قریب ہوئی۔
جس نے جھپٹ کر اسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔
"ہوش کرو سونیا! یہ پاگل پن کی اداکاری چھوڑ دو، اب ہماری ردا نہیں ہے اس دنیا میں کہیں اور یہ لڑکی۔" طاہرہ پاٹ دار آواز میں گرجی تھیں۔
"یہ لڑکی ہی تو نظر لگا کر گئی تھی میری ردا کی خوشیوں کو، اس کی بدشگونی ہوئی تھی۔ جب رات میں اس نے ہنگامہ کیا میرے آزر پر کیچڑ اچھالا، اس کی کالی نظریں تھیں جو میرے بیٹے کی۔ میری لاڈلی کی خوشیوں کو نگل گئی۔ دور کرو اس منحوس کو ہٹاؤ اپنے پاس سے۔" طاہرہ تیز آواز میں بول رہی تھیں۔
"کیا کہا آپ نے ابھی، کیا کیچڑ اچھالا تھا اس نے آزر بھائی پر۔ کیا ہوا تھا؟" زینب تو ایک دم سے اچھل ہی گئی تھی۔ طاہرہ کے سامنے آ کر بولی۔
"اتنی ننھی نہ بنو تم، جس مقصد کے لیے اپنی لڑکی کو یہاں چھوڑ گئی تھیں اپنے سیر سپاٹے کے لیے اور اس نے جو یہاں گل کھلائے جیسے تمہیں کچھ بتایا نہیں ہوگا اس نے۔" طاہرہ اسی حقارت سے ہاتھ نچا کر بولیں۔
"بس کر دیں اماں! خدا کے لیے بس کر دیں۔ میری بیٹی قبر میں اتر گئی آپ کے جانے کی عمر تھی، بلاوا اس کا آ گیا۔ ہمارے دل پھٹ گئے مگر آپ کے غرور، آپ کی نفرت کو چین نہیں آیا اور کیا چاہتی ہیں آپ ہم سب مر جائیں، زہر کھا لیں تو آپ کو چین ملے گا۔" سونیا نے اپنی پوری شادی شدہ زندگی میں ایسے لہجے میں طاہرہ سے بات نہیں کی تھی۔
وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی جب آزر اندر داخل ہو رہا تھا۔
"اگر آپ کو یہاں رہنا ہے تو صرف اپنے کمرے تک رہیں، میرے گھر میں مزید بربادی پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ سونیا تھی، طاہرہ کو اپنی آنکھوں اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔
اور دروازے کے پاس کھڑا آزر بھی بے یقین کھڑا تھا۔

"ہوش میں تو ہو، کس لہجے میں بات کررہی ہو اماں سے؟"
کوئی اور موقع ہوتا تو شاید یہ گرجنا کافی نہ ہوتا آزر کے لیے۔
"اس لہجے میں جس میں مجھے بہت پہلے بات کرنی چاہیے تھی، آپ کی ماں سے۔ اب انہیں سمجھالیں، میں ان کی مزید مداخلت اپنے گھر کے، اپنے بچوں کے معاملوں میں برداشت نہیں کروں گی۔"
سونیا تیز تیز بولتی رمشا کو دھکیلتی اندر چلی گئی۔
طاہرہ تو ابھی بھی ساکت تھیں۔
اور آزر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ سونیا بول کر گئی ہے۔
"چلو کشف!" زینب نے آہستگی سے کہا اور کشف کو چلنے کا اشارہ کیا کشف خاموشی سے ماں کے ساتھ باہر نکل گئی۔
رمشا شرمندہ سی ان کو جاتا دیکھنے لگی۔
"زینب آنی پلیز، تھوڑی دیر تو رکیں ماما سے تو مل لیں۔" دروازے کے پاس پہنچ کر وہ کچھ شرمندہ سی بولی۔
"نہیں بیٹا! اب رکنا اور آئندہ کبھی آنا مناسب نہیں۔ اپنی ماما کو میری طرف سے پوچھ لینا۔" زینب نے رکے بغیر کہا۔
دونوں جلدی سے باہر نکل گئیں۔ رمشا وہیں شرمندہ سی کھڑی رہی، وہ واپس آئی تو آزر ماں کے پاس بیٹھا شاید انہیں تسلی دے رہا تھا، وہ کچھ بے زاری سی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

منصور کے دل میں پچھتاوا بڑھتا ہی جارہا تھا۔
"کاش یوں جذباتی پن میں اس نے زینب کو گھر بھیجنے کا نہ کہا ہوتا۔" وہ خود کو لعن طعن کرتا تھا۔
"منصور! میں تم سے بات کررہی ہوں۔" زریں اسے یونہی ہاتھ میں چائے کا کپ لیے بیٹھے دیکھ کر کچھ جھنجلا کر بولی تھی۔
"کیا بات کررہی ہو؟" وہ کچھ بے زاری سے بولا۔
"ایما اس لڑکے بلال کو پسند کرتی ہے۔" وہ اپنا طیش دبا کر قدرے نرم لہجے میں بولی ورنہ منصور کی یہ بے دھیانی اس کا جی بھر کر جی جلارہی تھی رات دن۔
"کون بلال؟" وہ واقعی مکمل بے دھیان تھا۔
زریں کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لے۔
"ثمینہ کا بیٹا جنہوں نے ایما کی جان بچائی تھی۔" وہ پھر ضبط کے گھونٹ بھرتی بمشکل نرمی سے بولی۔
"کیا دنیا کے سارے لڑکے مرگئے ہیں، وہی لڑکا بچا ہے ایما کے لیے۔" ایک دم وہ غصے سے بول اٹھا۔
زریں ششدر سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔
"شادی کسی ایک سے کرنی ہوتی ہے۔ دنیا کے سارے لڑکوں سے نہیں اور میں نے تمہیں بتایا ہے کہ ایما اسے پسند کرتی ہے۔" وہ آخری جملے پر زور دے کر بولی۔
"یہ ممکن نہیں ہے، ایما کو بتادو۔" وہ ایک دم سے قطعی انداز میں بولا تھا۔
"کیوں ممکن نہیں ہے۔" زریں بھی فیصلہ کرکے بحث کرنے کو دمی۔
"وہ لڑکا کسی بھی طرح ایما کے لائق نہیں ہے۔" منصور کو یہی مناسب عذر سوجھ سکا۔

"کیا خرابی ہے اس میں؟" زریں تنک کر بولی۔
"ایسی کوئی اچھائی بھی نہیں، اس کا باپ ایک نمبر کا دھوکے باز اور موقع پرست انسان ہے۔" وہ جھلا کر بولا۔
"وہ کون نہیں ہوتا، تم نہیں تھے کیا موقع پرست؟" زریں ٹھنڈے لہجے میں اسے جتا کر بولی۔
"تم ہر معاملے میں مجھے کیوں گھسیٹ لاتی ہو اور موقع پرست میں نہیں تم اور تمہارا باپ تھا جس نے مجھے اپنا کر اپنا مطلب نکالا۔" وہ بھی دو بدو بولتا گیا۔
"تم پر اور تمہاری خود غرضی پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ تم جو مرے ہوؤں کو بھی نہیں بخشتے۔" زریں کے لہجے میں غصہ اور کوفت تھی۔
"اور ایما نے شادی لڑکے سے کرنی ہے۔ اس کے باپ سے نہیں تم اگر اپنے طور پر ان لوگوں سے بات کر سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ پھر ہم دونوں یہ پرپوزل لے کر ان کے گھر جا رہے ہیں دو چار دنوں میں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تھی۔
"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں؟" منصور تپ گیا۔
"میرا تو ٹھیک ہے۔ البتہ تمہیں کوئی پرابلم ضرور ہے۔" وہ تحکم سے بولی۔ "اور اس میں دماغ خراب ہونے کی کیا بات ہے، ہمیں ایما کی شادی تو کرنا ہے اس کی پسند سے ہو جائے تو کیا برا ہے۔"
"ابھی میری بھانجی کا کفن میلا نہیں ہوا اور تمہیں بیٹی کی شادی کی سوجھ رہی ہے۔" وہ تنک کر بولا۔
"معاف کرنا مہینے سے اوپر ہو گیا اس لڑکی کو مرے ہوئے۔ اب کیا ہم پر یا ہمارے بچوں پر بھی ساری خوشیاں حرام ہو گئیں اور کتنا سوگ منائیں۔" وہ غصے میں بولی۔
"اور میں تم سے پہلے بھی بول چکی ہوں ہمارے رہنے کے لیے کہیں اور انتظام کرو۔ میرا اب اس سوگوار ماحول میں دم گھٹتا ہے ہمیں کہیں اور موو کرنا ہے۔"
"ابھی یہ پاسبل نہیں۔" وہ رکھائی سے بولا۔
"تمہارے لیے تو سب کچھ ہی ناممکن ہے۔ تم تو شاید یہاں رکنے کی نیت سے آئے ہو۔ مجھے چند دنوں میں ایما کی شادی کر کے واپس جانا ہے بہتر ہے اس معاملے میں میرے ساتھ کوآپریٹ کرو ورنہ تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"
وہ سرد لہجے میں اسے دھمکا کر اٹھ کر چلی گئی۔ منصور کچھ سوچتا رہ گیا۔

☆☆☆

"کیا؟ اتنی بڑی بات تم نے مجھ سے کیوں چھپائی؟" زینب شاکڈ رہ گئی۔
کشف کا سر جھک گیا۔
"تم نے مجھے آتے ہی کیوں نہیں بتایا یہ سب۔ میں اس سونیا کو اور اس آزر کو دیکھ لیتی جا کر انہوں نے سمجھا کیا تھا تمہیں۔" زینب کا غصہ لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
اس پر تو جیسے صدمے کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا کہ جس گھر کو محفوظ سمجھ کر وہ اپنی بیٹی کو وہاں چھوڑ کر گئی، وہی اس کے لیے کمین گاہ بن گیا!
"سونیا آنٹی جتنا کر سکتی تھیں انہوں نے کیا اور میں اسی رات وہاں سے نکل آئی تھی میں نے رشتوں کا بڑا بھیانک روپ دیکھا تھا آنی! اس رات مجھے لگا اس بھری دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔" اس کی آواز گھٹی ہوئی تھی۔

ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مگر وہ رو نہیں رہی تھی۔

''اور بھری دنیا بھی صرف بھیڑیوں اور وحشیوں کی آماجگاہ، مجھے کوئی بھی جگہ، کوئی بھی گھر اپنے لیے محفوظ نہیں لگ رہا تھا۔ سوائے اس گھر کے جسے میں ہمیشہ کھنڈر، پسماندہ اور اپنے لیے قابل نفرت سمجھتی رہی تھی۔ یہ گھر مجھے ماں کی طرح بانہوں میں لینے کو تیار تھا اور میں ثمینہ آنٹی کا غلیظ روپ دیکھنے کے بعد یہاں آ گئی تھی اپنے اس گھر، اس پناہ گاہ میں جہاں میرے لیے کوئی خوف کوئی ڈر نہیں تھا۔'' وہ رک رک کر بتا رہی تھی۔

''تب ہی کشف نے اتنے دنوں میں کبھی زینب سے یہاں سے کہیں اور منتقل ہونے کو نہیں کہا بلکہ اسے تو کشف بہت مختلف لگی تھی تو تبدیلی کی وجہ یہ تھی۔''

اب زینب کو سمجھ میں آ رہا تھا۔

''میں سونیا کو کبھی معاف نہیں کروں گی اس کے لیے۔'' وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی تھی۔

''ان کا کوئی قصور نہیں تھا آنی! آزر انکل پہلے دن سے مجھے برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انسان وہی کچھ دکھاتا ہے جتنا اس کا ظرف ہوتا ہے، اتنے بڑے گھر، بزنس کے مالک آزر انکل کا ظرف اور دل بہت تنگ اور گھٹا ہوا تھا۔'' وہ کسی سمجھ دار سیانے کی طرح بات کر رہی تھی۔

''اور اب دیکھ لیں ان کے ساتھ کیا ہوا آنی! ردا کی وفات پر ہی میں نے ان سب کو معاف کر دیا تھا، جس جس نے میرے ساتھ برا کیا تھا۔ آپ بھی معاف کر دیں، جب رشتوں کی اصلیت پرکھ لی جائے پھر فرق نہیں پڑتا کہ ان سے بدلہ لیا جائے یا نہیں، شاید وقت ان کے لیے اصل بدلے کا انتظام کر رہا ہوتا ہے۔''

زینب حیرانی سے اس بدلی ہوئی کشف کو دیکھے جا رہی تھی۔

''کشف! یہ تم کہہ رہی ہو؟'' وہ حیرانی چھپا نہیں سکی۔

''میں نہیں کہہ سکتی کیا؟'' وہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

''بابا ایسے کیوں ہیں آنی!'' اس نے نوے درجے کے زاویے پر آ کر ایک دم سے موضوع بدلا تھا جس پر زینب ابھی خود سے بات کرنے کے لیے بھی تیار نہیں تھی۔

''وہ ایسے ہی ہیں میری جان! وقت بدل گیا، حالات بدل گئے مگر میر منصور آج بھی ویسا ہی ہے۔''

وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''کیسے؟ میں سمجھی نہیں۔'' کشف اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی تھی۔

''بعض لوگوں پر وقت حالات کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوتے، میر منصور جیسے پہلے خود غرض تھا صرف اپنے لیے سوچنے والا، وہ آج بھی ایسا ہی ہے صرف منصور کیا اس کی بہن، ان کی اماں......'' کشف چونکی۔

وہ رک گئی۔ ایک دم سے کانوں کو ہاتھ لگا کر رہ گئی۔

''اللہ مجھے معاف کرے جانے والوں کے بارے میں کچھ غلط نہیں کہنا چاہیے چھوڑ دو۔'' زینب جیسے کچھ کہتے کہتے سنبھل گئی تھی۔

''مجھے تو بتائیں ناں آنی! مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں۔'' وہ اصرار سے بولی۔

''میری پیاری بیٹی! میں اگر کچھ چھپانا بھی چاہوں گی تو بھی وقت سب کچھ آشکار کر دیتا ہے کبھی نہ کبھی۔'' وہ مسکرائی۔

''مجھے وقت کے انکشاف کا انتظار نہیں کرنا۔ مجھے آپ بتائیں۔''

''کیا بتاؤں؟'' وہ کچھ بے بسی سے بولی۔

''میرا تو خود دل بہت عجیب سا ہو رہا ہے اتنی اچھی جگہ رشتہ ہوتے ہوتے سب ختم ہو گیا۔ میں تو سمجھی تھی میری بیٹی کے اچھے دن آ گئے ہیں لیکن اللہ کو جانے کیا منظور ہے۔'' زینب کسی اور طرف نکل گئی۔

کشف اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی۔

''سنو کشف! ایک بات مجھے سچ سچ بتاؤ بالکل۔'' وہ اچانک بولی تھی۔ کشف خوف زدہ سی ہو گئی۔

''تم کسی کو پسند کرتی ہو؟'' اسے یوں لگا جیسے زینب نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو۔

''آنی...... نہیں، میں تو۔'' وہ گڑبڑا گئی۔

''یہی موقع ہے مجھے آنی کو سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے شاید وہ تھوڑا ناراض ہوں لیکن پھر مان جائیں گی۔'' وہ دل میں سوچنے لگی۔

''بیٹا! دیکھو میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں گی اگر تم کسی کو پسند کرتی ہو، کشف! میں چاہ رہی ہوں میں جلد سے جلد تمہاری رخصتی کر دوں پتا نہیں کیوں لگ رہا ہے جیسے میرے پاس وقت کم ہے۔'' وہ بولتے بولتے ایک دم سے رک گئی۔

''خدا کے لیے آنی! اس طرح تو نہ کہیں ورنہ میں کبھی بھی کہیں بھی رخصت ہو کر نہیں جاؤں گی۔'' وہ اس کے دونوں ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے بولی۔

''یہ موحد کے ساتھ منصور مجھے کہہ رہا تھا کہ اس نے تمہیں اس کے ساتھ دیکھا تھا۔'' وہ دل کی بات زبان پر لے آئی۔

''آنی......!'' اس نے سب بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

''کیا بات ہے زینب تم دونوں ابھی تک جاگ رہی ہو خیریت ہے نا سب۔'' صالحہ شاید ان کی باتوں کی آواز سے اٹھ کر آ گئی تھیں۔

''جی خالہ سب خیریت ہے۔ آپ کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' زینب پلنگ پر ان کے لیے جگہ بناتے ہوئے بولی۔

''طبیعت اللہ کا فضل ہے لیکن اس بڑھاپے میں نیند آتی کہاں ہے۔ کافی دیر سے جاگ رہی تھی پھر سوچا تم سے پوچھوں چل کر، کشف بیٹی بھی یہیں بیٹھی ہے۔ سونیا کا کیا حال ہے۔ اب کچھ بہتر ہوئی۔''
وہ بات کرتے کرتے دوسری طرف نکل گئیں۔

''بہتر ہے خالہ جان! آپ بتائیں ڈاکٹر نے کیا کہا۔'' زینب صفائی سے موضوع بدل کر بولی۔

''آنی! مجھے نیند آ رہی ہے صبح مجھے یونیورسٹی بھی جانا ہے شاید ایگزام کی ڈیٹ آ گئی ہو۔ مجھے جلدی اٹھا دیجیے گا۔''

کشف کو پتا تھا اب مزید بات نہیں ہو سکتی اس لیے اٹھ گئی۔

''پتا نہیں آنی کا ری ایکشن کیا ہو گا جب انہیں اس نکاح کا پتا چلے گا اور میں نے بھی بے وقوفی کی جب وہ کسی کو پسند کرنے کا پوچھ رہی تھیں مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔''
وہ کمرے میں آ کر جھلاتی ہوئی ٹہلنے لگی۔

''پتا نہیں یہ معاملہ کس طرح حل ہو گا بابا کا رویہ کتنا سرد ہوا اور اجنبی سا ہے شاید ہم اتنے سالوں بعد ملے ہیں اس لیے یا سارے باپ ایسے ہی بی ہیو کرتے ہیں۔ وہ کچھ افسردہ سی منصور کو سوچنے لگی۔

☆☆☆

''یا ہم تمہارے اپارٹمنٹ میں آ جاتے ہیں یا ہمارے لیے کسی الگ اپارٹمنٹ کا انتظام کر دو۔'' زریں کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

موحد سپاٹ چہرہ لیے ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جواب الماری میں کچھ نکال رہی تھی۔

''یہ رقم ہے چھ ماہ کا ایڈوانس اگر تم کسی پوش ایریا میں ہمارے لیے کوئی اپارٹمنٹ دیکھو تو۔'' اس نے ایک پھولا ہوا لفافہ اس کے آگے رکھا۔

''آپ کو واپس نہیں جانا کیا؟'' وہ حسب عادت روکھے پن سے بولا۔

''ایما کی شادی کے بعد میں واپس چلی جاؤں گی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

وہ چونک کر رہ گیا۔

''ایما کی شادی کہاں؟'' اس کی حیرانی بجا تھی۔

''ان چھ ماہ میں کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔'' وہ کچھ مبہم سے انداز میں بولی۔ موحد لمحہ بھر کو الجھ کر رہ گیا۔

''کیا زریں اس سے کچھ چھپا رہی ہے۔'' اس نے بغور ماں کو دیکھا۔

''پھر بھی جو آپ اتنے یقین سے کہہ رہی ہیں تو کچھ ہوگا۔'' وہ مصر ہو کر بولا۔

''جو بھی ہوگا جلد یا بدیر سب کو پتا چل جائے گا۔'' اس کا انداز بدستور الجھانے والا تھا۔

''گویا کچھ طے کیا جا چکا ہے، جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔'' وہ کچھ طنز سے بولا۔

''اگر چہ چھپانے کو کچھ ہے تو نہیں۔ لیکن تم نے ایسی دلچسپی کبھی ظاہر بھی نہیں کی تو جو بھی طے ہوگا۔ میں سب سے پہلے تمہیں ہی بتاؤں گی۔''

زریں کے ان دو جملوں میں بہت کچھ تھا جتانے کو۔

موحد خاموش ہو گیا۔

''ایمان کہاں ہے؟'' وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔

''رمشا کے ساتھ ہی رہتی ہے دن بھر۔ ابھی بھی وہیں ہوگی۔'' زریں لاپروائی سے بولی۔

وہ جواباً خاموش کھڑا رہا۔

''اور تمہارا وہ منہ بولا باپ اسے اس زینب کے گرد منڈلانے سے فرصت نہیں۔ ہمیں یہاں ڈال کر بھول گیا ہے وہ، میں بھی اسے بھلا دینا چاہتی ہوں۔'' وہ نخوت سے کہہ رہی تھی۔

''تو مجھے کیوں بتا رہی ہیں بھلا دیں یا یاد رکھیں۔'' وہ جیسے بدلہ اتارنے والے انداز میں بولا۔ موحد اٹھ کر جانے لگا۔

''یہ پیسے لے جاؤ، اسی ہفتے اگر انتظام ہو سکے تو بہتر ہے۔''

وہ لفافہ اسے دینے آئی۔

''انتظام ہو جائے گا تو بتا دوں گا۔ ابھی یہ رکھیں۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر لفافہ نظر انداز کرتا تیزی سے باہر نکل گیا۔

''کہیں نہ کہیں تو تمہارے دل میں بھی ماں کی محبت ہے تو سہی موحد! تم جتنا بھی چھپاؤ۔'' وہ لفافہ دوبارہ الماری میں رکھتے ہوئے مسکرائی۔

☆☆☆

ردا بہت خوب صورت کپڑوں میں یونیورسٹی کی فیئر ویل میں اپنی دوستوں کی جھرمٹ میں کسی چاند کی طرح

جگمگا رہی تھی۔
رمشا آنکھوں میں آنسو لیے ٹکٹکی باندھے دیکھتی جا رہی تھی۔
ایمان نے ہاتھ بڑھا کر اس کے آگے پھیلی البم بند کر دی۔
"کم آن رمشا یار! اس طرح تو تم کبھی بھی نارمل نہیں ہو سکو گی۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔
اس نے البم الماری کے سب سے اوپر اسٹور والے کیبنٹ میں صوفے کے اوپر چڑھ کر رکھ دی۔
"میں نارمل ہونا بھی نہیں چاہتی، میری بہن کی موت نارمل نہیں تھی اور یہ خیال مجھے کبھی نارمل نہیں ہونے دے گا۔"

وہ افسردہ سی اٹھ کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہو گئی۔
باہر سیاہ آسمان تھا اور اس پر چمکتے ستارے جو جلے چاند کے گرد ہالہ کیے ہوئے تھے۔
اسے لگا اس چاند میں کہیں ردا کی مسکراتی شبیہہ ہے۔
اس کے آنسو کچھ اور بھی روانی سے بہنے لگے۔
"چلو باہر چلتے ہیں۔" ایمان اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی کھینچتی ہوئی ساتھ لے گئی دونوں لان میں آ گئیں۔
"یار! یہ غم تو شاید اب کبھی بھی تمہارے دل سے نہ نکلے مگر تمہیں اپنی ماما کو، پاپا کو، گھر کو دیکھنا ہے۔ رمشا اب سب کچھ تمہاری توجہ چاہ رہا ہے پلیز خود کو کمپوز کرو۔"
وہ اسے لان چیئر پر بٹھا کر دھیرے سے سمجھانے لگی۔
"ذرہ ذرہ بکھرے وجود کو کمپوز کرنا آسان ہے کیا۔" وہ ابھی بھی اس کیفیت میں تھی۔
"اتنا مشکل بھی نہیں۔ تمہیں پتا ہے، پورے تین ماہ میں ٹراما میں رہی تھی۔ میں خود سے کھا پی سکتی تھی نہ کچھ سمجھ سکتی تھی۔ ایک زندہ لاش تھی میں، میری ماما خود ہسٹریک پیشنٹ ہیں۔ انہیں استھما کا پرابلم بھی ہے لیکن میری حالت دیکھ کر وہ اپنی ساری بیماریاں بھول گئیں۔"
ایمان کہیں کھوئے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔
"پھر ماما نے مجھے کسی بچے کی طرح ٹریٹ کیا، میں جوان کے لیے بڑے دکھوں کی وجہ تھی، رمشا میں نے اپنے ماں باپ کو کبھی کوئی خوشی نہیں دی جب میں آہستہ آہستہ ٹراما سے باہر آ رہی تھی تو مجھے اس شرمندگی اس ندامت نے گھیرنا شروع کر دیا۔"
رمشا بظاہر بے دھیان سی تھی۔
"یار تب مجھے احساس ہوا کہ ماں باپ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں اگر میرے ماں باپ نہیں ہوتے تو شاید میں کسی شیلٹر ہوم میں کسی وہیل چیئر پر دنیا سے بے خبر کسی معذور کی طرح باقی کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ تم سن رہی ہو ناں۔"
رمشا نے یونہی سر ہلا دیا۔
"تم نہیں سن رہیں۔ نہیں سمجھ رہیں۔" ایمان نے تاسف سے سر ہلایا۔
"تم ٹراما میں کیوں چلی گئی تھیں؟" رمشا نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اچانک سے پوچھا تھا یعنی وہ سب کچھ سن چکی تھی۔
ایمان نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا اگر رمشا نے یہ سوال پوچھ لیا تو وہ کیا جواب دے گی۔
"کبھی کبھی ایسا لگتا ہے لکڑی کا کوئی خوب صورت شوکیس، کوئی دروازہ کوئی کھڑکی صحیح سلامت بہت دل کو بھا رہی ہوتی ہے لیکن اصل میں اسے اندر ہی اندر گھن کھا رہا ہوتا ہے دیمک زدہ ہو چکی ہوتی ہے۔"

وہ رک رک کر جیسے توجیہہ دینے کی کوشش کرنے لگی۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' رمشا کندھے اچکا کر رہ گئی۔

''ہماری فیملی میں ماما، پاپا، بھائی بظاہر ایک فیملی ہیں مگر اندر سے ہم بالکل الگ ہیں جسٹ لائیک اے بروکن فیملی یونو۔ اس توڑ پھوڑ نے مجھے اندر تک توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا۔ میں سب کچھ اپنے ہاتھوں سے توڑ دوں، جلا دوں، سب ختم کر دوں میں نے ایسا کرنے کی کوشش کی بھی اور نتیجہ بہت خوفناک تھا۔'' وہ بولتے بولتے چپ کر گئی۔

اور اس سے ذرا فاصلے پر کھڑا موحد ساکت کھڑا سن رہا تھا۔

رمشا نے ذرا سی گردن موڑ کر چاند کی مدھم روشنی میں کھڑے اس دراز قد سائے کو دیکھا جس کی نظریں ایمان پر جمی تھیں۔

☆☆☆

''اب ہمیں واپس چلے جانا چاہیے مام!''

سلیمان نے پورے دو ماہ بعد یہ بات کی تھی جب شائستہ اس کی حالت سے تقریباً مایوس ہو چکی تھیں۔

انہوں نے چونک کر اپنے آگے پھیلے مختلف ڈیزائن کے زیورات کے پھیلاوے کو یونہی ہاتھ سے سمیٹ کر لکڑی کے اس بھاری باکس میں ڈال دیا جو وہ ردا کے لیے لے کر آئی تھیں۔

سلیمان کی نظریں آنکھوں کو خیرہ کرتی اس جیولری پر جمی تھیں جسے شائستہ نے جلدی سے سمیٹ دیا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔'' شائستہ نے بظاہر کوئی اختلاف نہیں کیا۔ ''یہاں بیٹھو میرے پاس۔'' وہ محبت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھاتے ہوئے بولیں۔

وہ بہت کم گو ہو گیا تھا بہت کم بولتا اور بہت زیادہ سوچنے لگا تھا۔

''ہر چیز کا ہر جاندار کا جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی فنا کا وقت دن لمحہ لکھ دیا جاتا ہے۔ وہ معصوم بھی بس اتنی سی عمر لکھوا کر آئی تھی۔'' شائستہ نے تمہید باندھی۔

''پلیز ماما! میں مزید اس پہ بات کرنے کے لیے خود کو تیار نہیں پاتا۔ آپ یہ باتیں نہ کریں۔'' وہ جیسے تکلیف سے کراہ کر بولا۔

''بات جب بھی شروع ہو گی سلیمان اس کی تمہید یہی ہو گی یہیں سے بات شروع کرنا پڑے گی۔'' وہ سنجیدگی سے اسے سمجھا کر بولیں۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ قدرے ناگواری سے بولا۔

''کون سی بات؟''

شائستہ چند لمحے خاموش رہ کر شاید اس کے ردعمل کا اندازہ لگا رہی تھیں۔

''ہم یہاں جس مقصد کے لیے آئے تھے۔''

''ردا کے ساتھ وہ بھی فوت ہو گیا۔'' وہ ماں کی بات کاٹ کر تیزی سے بول اٹھا۔

''اللہ نہ کرے تم جب تک ہو اللہ تمہیں دو جہان کی خوشیاں عطا کرے۔ مجھے بہرحال ایک ماں کی حیثیت سے اپنا فرض پورا کرنا ہے۔''

شائستہ خاص دین دار لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

''میں آپ کو اس فرض سے آزاد کرتا ہوں۔'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولا اور اٹھ کر جانے لگا۔

شائستہ کو پتا تھا یہ بات اب نہ ہوئی تو پھر شاید سالوں پر چلی جائے گی اور یہ وہ کبھی نہیں چاہتی تھیں۔

''مگر میں اس دن اپنے اس فرض کی پابند ہوگئی تھی جس دن تم پیدا ہوئے تھے۔ تم مجھے آزاد کردیا نہ کرو۔ مجھے یہ فرض نبھانا ضرور ہے۔'' وہ قطعی لہجے میں کہتی اس کے سامنے کھڑی تھیں۔
''پلیز ماما! میں جس ٹوٹ پھوٹ کا، جس کرب کا شکار ہوں آپ نہیں سمجھ سکتیں۔'' وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تکلیف کا اظہار کر بیٹھا۔
''تمہیں اس کرب سے نکالنا چاہتی ہوں۔ ہم یہاں سے تمہاری شادی کر کے ہی جائیں گے۔ ان کا لہجہ حتمی تھا سلیمان بھونچکا سا رہ گیا۔

☆☆☆

''کیسی ہو کشف۔'' وہ بیگ میں چیزیں رکھتے ہوئے چونک کر مڑی۔
سامنے کھڑے بلال کو دیکھ کر اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔
وہ یونہی سر ہلا کر آگے جانے لگی۔
وہ تیزی سے اس کے پیچھے آیا تھا۔ اس کا بازو تیزی سے موڑ کر اپنی طرف گھما ڈالا۔ ''کیا گناہ ہوگیا مجھ سے؟ کیا سمجھتی ہو تم خود کو؟''
وہ طیش میں سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ پوچھ رہا تھا۔
کشف کے چہرے پر ناگواری تھی۔ اس نے جھٹکے سے اپنا بازو اس کی گرفت سے کھینچا۔
''پہلے بات کرنے کی تمیز سیکھ لو۔'' وہ اسی بےزاری سے بولی۔
''اب مجھے تم سے بات بھی تمیز سے کرنی ہوگی۔''
''بلال! تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' وہ جھلا کر رہ گئی۔
''تم ہو میرا مسئلہ، کتنی بار بتاؤں۔'' وہ غرایا۔
''تم غلط ٹریک پر ہو میں بھی تمہیں کتنی بار بتاؤں۔ اس راستے میں مت آؤ جو تمہیں کہیں نہیں لے کر جاتا۔'' وہ جیسے وضاحت دیتے ہوئے جان چھڑانے والے انداز میں بولی۔
''مجھے کہیں نہیں جانا کشف! صرف تمہارے ساتھ رہنا ہے۔'' وہ سخت کرب بھرے لہجے میں بولا تھا۔
''امپاسبل!'' وہ قطعی انداز میں بولی۔
''بلال بھول جاؤ مجھے اور اپنے لیے نیا راستہ نیا ساتھ چن لو۔''
''جیسے تم نے چن لیا۔'' وہ طنز سے بولا۔
''ہاں جیسے میں نے چن لیا۔'' وہ بھی جواباً زور دے کر بولی۔
بلال کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔
''تم اتنی سنگدل تو کبھی بھی نہیں تھیں کشف! ہمارا بچپن کا ساتھ ہے دنیا میں سب سے زیادہ تم مجھے سمجھتی تھیں۔ میں تمہیں پھر اب کیا ہوگیا ایسا کہ تم راستے ہی الگ کر رہی ہو۔'' وہ بہت دکھی لگ رہا تھا۔
''پلیز! یہ سوال مجھ سے نہیں خود سے پوچھو۔ ہم دونوں کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ پتا ہے بلال! میں نے تمہیں صاف انکار کرنے سے پہلے کئی بار سوچا تمہارے بارے میں بھی اور بچپن کی اس سنگت کے بارے میں بھی پھر میں نے سوچ کے ترازو میں اس سنگت اور عزت کو تولا تو عزت کا پلڑا بھاری تھا۔ میں عزت پر محبت کو قربان کر سکتی ہوں بلکہ ہر جذبے کو۔ انڈرسٹینڈ! آئندہ میری راہ نہیں روکنا...... خدا حافظ۔''
وہ کہہ کر تیزی سے جانے لگی۔
''ہم دوست ہیں کشف! تم جو بھی ہو ہماری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہیے اتنا حق تو مجھے دوگی ناں؟'' وہ

بھاگتا ہوا اس کے پیچھے آیا تھا۔

''کیا فائدہ ایسی دوستی کا جو کل کو تمہاری پارٹنر یا۔ میرے لیے وہ ایک گالی بن جائے جیسے آنی کے لیے اور تمہارے بابا کی دوستی کو داغدار کیا گیا۔ نہیں بلال! ہم لوگ یہ دوستی والی عیاشی بھی افورڈ نہیں کر سکتے تم ہمیشہ میری دعاؤں میں رہو گے۔''

وہ کہہ کر رکی نہیں تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔ وہ گم صم کھڑا اسے جاتا دیکھتا رہا۔

اس کا فون مسلسل بجے جا رہا تھا۔

اسے پتا تھا ایمان کی کال ہو گی۔

''کس لیے ملنا ہے؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی فون سنتے ہوئے اس کے لہجے میں تلخی سی آ گئی۔

''فرصت تو ہے مجھے مگر۔'' وہ ملنے سے کترا رہا تھا۔

اسے ایمان کی معصومیت نے متاثر کیا تھا مگر ثمینہ کی ضد اس کے اقرار کے رستے میں دیوار بن کر آ کھڑی ہوئی تھی۔

''اگر آپ فری ہیں تو میں آ جاتی ہوں آپ کی طرف مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بھیج دیں۔'' وہ اس کی فرصت کا سن کر کھل اٹھی۔

''میں گھر پر نہیں ہوں۔'' وہ جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے بولا۔

''تو کہاں ہیں میں وہاں آ جاتی ہوں۔'' وہ ملنے کے لیے بے تاب تھی یہ دل کی کہانی بھی کتنی عجیب ہوتی ہے آپ جس کے پیچھے بھاگتے ہیں وہ آپ سے دور بھاگتے ہیں کسی ایک کو تو رکنا ہو گا۔

''میں آپ کو پک کرنے آ رہا ہوں، آپ ریڈی ہو جائیں۔'' اس نے اپنی ہار تسلیم کر لی۔

''ٹھیک کہتی ہے کشف! ماما اسے کبھی قبول نہیں کریں گی۔ ماما اور بابا جیسی ایک اور کہانی دن رات اس کے گھر میں دہرائی جائے گی۔'' ایسا وہ مر کر بھی نہیں چاہ سکتا تھا۔

☆☆☆

موحد سامنے کمپیوٹر پر آئی میل کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھے جا رہا تھا۔ اس سارے کے دوران اس نے ایک بار بھی یہ بات نہیں سوچی تھی اس کا تبادلہ بھی ہو سکتا ہے۔ اسے کہیں بھیجا بھی جا سکتا ہے۔ اب جبکہ وہ یہاں سے ایک پل کے لیے بھی دور نہیں جانا چاہ رہا تھا اسے اتنے دور افتادہ علاقے میں بھیجا جا رہا تھا۔

دروازہ ہولے سے کسی نے بجایا تھا۔

''یس!'' اس نے گہرا سانس لے کر دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کے پپوٹوں کو سہلایا تھا۔

وہ خاموشی سے اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

وہ بھی اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے صبح سے اس کا منتظر تھا۔

''لنچ کر لیا تم نے؟'' پہلا جملہ بھی کس قدر اپنائیت بھرا تھا مگر کشف نے سوچ لیا تھا اب وہ کسی بہلاوے میں نہیں آئے گی۔

''مجھے آپ سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی تھی وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

''باتیں......'' اس نے زیر لب دہرایا'' وہ تو مجھے بھی تم سے کرنی ہیں۔''

وہ چونک کر بھی خاموشی سے ہونٹ بھینچ کر بیٹھی رہی۔

''تو چلو کہیں جا کر لنچ کرتے ہیں، ساتھ میں باتیں بھی ہو جائیں گی۔'' وہ دوستانہ انداز میں سب کچھ سمیٹتے ہوئے اٹھنے لگا۔

''موحد! میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہے۔ مجھے گھر بھی واپس جانا ہے۔'' وہ جتا کر رہ گئی۔
''تو میں ڈراپ کر دوں گا ناں، گھر کیا مسئلہ ہے۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں یوں بولا جیسے روز وہی اسے ڈراپ کرتا تھا۔
''مسئلے تو اتنے ہیں مگر شاید آپ کو کسی بھی مسئلے کی پرواہ ہے نہ فکر۔'' وہ تلخی سے بولی۔
''جب میں تمہارے ساتھ ہوں تو تمہیں کیا ٹینشن ہے یار؟'' وہ سیل فون اور چابیاں اٹھا کر جانے کو تیار تھا۔
''نفرت ہے مجھے آپ کے اس فلمی ڈائیلاگ سے، مت دہرایا کریں اسے میرے سامنے، کوئی ایک لمحہ بتا دیں جب آپ میرے سامنے میرے ساتھ آ، کر کھڑے ہوئے ہوں۔'' وہ غصے میں جیسے پھٹ پڑی۔
جواب میں وہ ہنسنے لگا۔
''پاگل نہیں ہوں میں۔'' اسے اور غصہ آ گیا۔
''وہ تو میں ہوں یار۔'' وہ اسی طرح شوخ ہو رہا تھا۔
''ہاتھ مت لگائیں مجھے۔'' وہ اس کا کندھے پر آیا ہاتھ جھٹک کر غصے میں بولی۔
''تمہیں ہاتھ لگانے بلکہ ساتھ لگانے کا بھی شرعی حق محفوظ ہے میرے پاس۔'' وہ پورے استحقاق سے کہہ رہا تھا۔
''اور میں یہ حق ختم کرنے کا پورا حق رکھتی ہوں۔'' وہ چیلنج کرنے والے انداز میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
''اچھا کیسے؟'' وہ دل چسپی سے پیچھے میز پر کہنیاں ٹکا کر اسے دیکھ رہا تھا۔
''میں نے سوچ لیا ہے۔'' وہ زور دے کر بولی۔
''میں بھی تو سنوں۔'' وہ مسکراہٹ دبا رہا تھا۔
''میں خلع لے رہی ہوں۔'' وہ تیزی سے بولی۔ ''اس کا حق تو ہے نا مجھے۔'' وہ اسے دھمکا رہی تھی شاید۔
''آف کورس یہ تمہارا حق ہے۔ لائر کے پاس تم جاؤ گی یا میں تمہارے ساتھ چلوں۔''
''شٹ اپ۔'' اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں یہ شخص کتنا ظالم ہے کاش اس نے اس کے جال میں پھنسنے سے پہلے یہ سب سوچا ہوتا اور جس طرح آج کل وہ خود کو لعن طعن کر رہی تھی اس نکاح کی جلد بازی کے آگے کاش اس وقت بھی کچھ سوچ لیا ہوتا۔
''افوہ اتنا غصہ یار احد ہے۔'' اس نے زور سے پیچھے سے اس کا بازو کھینچا تھا۔
وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جھونک میں اس کے سینے سے آ لگی تھی مگر یہ سب لمحاتی تھا۔
دوسرے لمحے وہ اسے پرے دھکیل کر روتی ہوئی باہر بھاگ گئی۔
موحد لمحہ بھر کو اس لمحاتی طلسم میں جکڑا دوسرے لمحے وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔

☆☆☆

سونیا زینب کے سامنے ہاتھ باندھے بس روئے جا رہی تھی۔ زینب بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
اس کے آنسوؤں نے زینب کی زبان بھی گنگ کر دی تھی۔
''پلیز، بس کرو مت رو تمہاری طبیعت پھر نہ بگڑ جائے۔ بس کرو خدا کے لیے سونیا!'' زینب کو بالآخر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولنا پڑا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں، بہت زیادہ، میں کمزور ہوں۔ پتا نہیں کیوں نہیں میں کچھ نہیں کر سکی۔ شاید میرے اللہ نے مجھے اس کی سزا دی ہے، میری ردا مجھ سے لے لی۔ میں بیٹی کی ماں بننے کے لائق ہی نہیں ہوں۔'' وہ قطرہ قطرہ پگھلتی جارہی تھی۔

''ایسی باتیں نہیں کرو، وہ اتنی ہی عمر لکھوا کر لائی تھی تم اب رمشا کی طرف دیکھو، حمزہ کا خیال کرو۔ وہ دونوں بچے تمہاری وجہ سے اپنی بہن کی ناگہانی موت کی وجہ سے کتنے ڈسٹرب ہیں سونیا! اب ان کا سوچو۔''

''ان ہی کی وجہ سے تو شاید زندہ ہوں ورنہ شاید میں بھی ردا کے ساتھ ہی مر جاتی یا اس رات جب کشف کے ساتھ برا ہوا۔''

وہ پھر سسکی لے کر رونے لگی۔

زینب کے چہرے پر پھر تناؤ سا آ گیا۔ دونوں کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھی رہیں۔

''اب تو تم مجھ سے ناراض نہیں ہو زینب! میں کشف سے بھی معافی مانگ چکی ہوں، پھر مانگ لوں گی۔'' سونیا بے بسی کی انتہا پر تھی۔

''نا معلوم میرا ناراض رب کب مجھ سے راضی ہوگا زینب میں تو سب سے معافیاں مانگ مانگ کر تھک گئی ہوں۔''

وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''مت کرو ایسی باتیں! اللہ توبہ کو قبول کرتا ہے وہ تمہاری معافی قبول کر چکا ہے۔'' زینب نرمی سے بولی اور اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

''میں اس دن تمہاری طرف کسی کام سے آئی تھی۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زینب نے پھر اسے متوجہ کیا۔

''زینب! مجھے لگتا ہے میرا دماغ پاگل ہوتا جا رہا ہے مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔'' وہ اس طرح مایوس اور دکھی تھی۔

''وقت لگے گا اس زخم کو بھرنے میں اتنی جلدی تو نہیں بھر سکتا ناں ٹائم دو تھوڑا خود کو۔''

وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

''تم کیا کہہ رہی تھیں تم کس لیے آئی تھیں میری طرف۔'' اسے کچھ دیر بعد یاد آیا۔

''اپنے بھائی سے کہو، یہاں سے چلا جائے۔'' زینب تلخی سے التجا کرتے ہوئے بولی تھی۔ ''مجھے اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

سونیا لمحہ بھر کو سمجھ ہی نہ سکی۔

''منصور نے کچھ کہا ہے تم سے؟'' وہ کافی دیر بعد بولنے کے قابل ہوئی۔

''وہ یہ گھر بیچنے کے لیے آیا ہے یہاں۔'' وہ غصہ دبا کر بولی۔

''کیا واقعی؟'' وہ حیرت زدہ سی رہ گئی۔

پھر جیسے دماغ پر زور دینے لگی۔

''شاید منصور نے مجھ سے بھی یہ بات کی تھی۔ کب مجھے یاد نہیں آ رہا۔'' وہ دماغ پر زور دے کر سوچنے لگی۔

''بیچ دے بے شک لیکن ابھی نہیں۔'' زینب نے کچھ دیر بعد کہا۔

''مجھے کشف کی شادی کرنی ہے پھر میں بھلے دارالامان میں چلی جاؤں۔ وہ بیچ لے یہ گھر۔''

''اللہ نہ کرے تم ایسی کسی جگہ جاؤ۔ میں کرتی ہوں منصور سے بات، یوں بھی اس گھر میں جتنا میرا اور منصور کا حصہ ہے۔ اتنا ہی تمہارا بھی حصہ ہے ظاہر ہے گھر بکے گا تو ہم تینوں کی رضا مندی سے ہی بکے گا۔''

''اب مجھے تم دونوں کی رضا مندی لینے کے لیے کیا کورٹ کا سہارا لینا ہوگا۔''

منصور نہ معلوم کب ان دونوں کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا تھا۔

''اگر تمہیں کورٹ میں جانے کا شوق ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تم لے جاؤ اس معاملے کو کورٹ میں۔'' زینب تلخی سے کہہ کر اس کی آنکھوں میں دیکھتی اٹھ کر اندر چلی گئی۔

''بھائی! آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا اب کیا گھر کے معاملے عدالت میں لے جائیں گے۔'' وہ تپ کر رہ گئی۔

''جب گھر والوں کو احساس نہیں ہوگا تو پھر یہی ہوگا۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا۔

''کیا مطلب کیسا احساس اور معاف کیجئے گا آپ کے منہ سے یہ احساس کی بات اچھی نہیں لگتی۔'' سونیا کو بھی لگا یہی وقت حساب برابر کرنے کا۔

''کبھی بھی تم لوگوں نے مجھے میرے حالات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کس لیے گیا تھا اپنا گھر ملک چھوڑ کر تم لوگوں کے لیے۔ اس گھر کے لیے اپنی خوشی کے لیے نہیں جبکہ میں جانا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔'' وہ اونچا اونچا تیز بولتا چلا گیا۔

''تو وہاں جا کر سب بھول گئے کہ اپنے پیچھے ایک گھر چھوڑ کر گئے ہیں ہم یہاں کس حال میں جیتے ہیں کبھی پلٹ کر جاننے کی کوشش کی آپ نے؟'' وہ بھی دوبدو بولی۔

''کیسے جانتا، وہاں جاتے ہی جو مصیبتیں مجھ پر ٹوٹیں جیل تک میں رہا میں کسی نے پتا کرنے کی کوشش کی۔''

''تم جیل کس لیے گئے بتاؤ گے تم یا وہ موحد ٹھیک کہتا ہے کہ تم نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ جس کی بدلے جیل بھگتی۔''

زینب تیز تیز بولتی کمرے سے پھر نکل آئی۔

''بکواس کرتا ہے وہ، جھوٹ بولتا ہے۔ بہروپیا ہے۔ وہ ایک نمبر کا۔ اپنے منحوس باپ کی طرح۔ اس نے مجھے اس جال میں پھنسایا اور جیل پہنچایا۔ پورے ڈھائی سال اس سیلن زدہ کال کوٹھری میں رہا میں شاید مر کر ہی نکلتا وہاں سے۔''

''ہاں اگر زریں جیسا فرشتہ جس کے شوہر کو رستے سے ہٹانے میں شاید تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تھے تمہاری مدد نہ کرتی۔''

''زینب! میں تم سے بات نہیں کر رہا۔'' ■ غصے میں چیخا۔

''میں کرنا چاہتی ہوں بات منصور! میری زندگی تو تم تباہ کر ہی چکے ہو میں۔ تمہیں اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گی۔ یہ بات تم اپنے دماغ میں بٹھالو۔''

''میں نے کسی کی زندگی تباہ نہیں کی۔ دھوکا تم نے دیا تھا مجھے شادی بے وفائی تم نے کی تھی اور اب یہ کسی اور کی اولاد کو میرے متھے مار کر تم کس بربادی اور تباہی کی بات کرتی ہو۔ کون سی وفا نبھائی تم نے جو مجھے بے وفا، دھوکے باز ہونے کا طعنہ دیتی ہو۔''

اور باہر کھڑی کشف غم اور شاک سے پتھر کی ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

''ہم دونوں کے بیچ کچھ بھی مشترک نہیں ہے ایمان۔'' کافی کا تلخ گھونٹ نگلتے ہوئے بلال نے کہا۔

''مگر مجھے لگتا ہے ہم دونوں میں بہت کچھ سیم (ایک جیسا) ہے۔'' وہ ذرا جوش سے بولی۔

بلال اسے دیکھ کر رہ گیا۔

''میں لو ان فرسٹ سائٹ کی قائل نہیں ہوں بلال! لیکن مجھے ابھی بھی وہ لمحہ یاد ہے جب میں نے پہلی بار تمہیں شدید بخار کی حالت میں دیکھا تو جانے میرے اندر کیسے گھنٹیاں بجنے لگیں کہ یو آر مائی رائٹ مین۔'' وہ بچوں کے سے جوش سے بولتی گئی۔

وہ بس سر ہلا کر رہ گیا۔

''مام کہتی ہیں، وہ جلد سے جلد ہم دونوں کی شادی کر کے ہمارے ساتھ کینیڈا سیٹل ہو جائیں گی۔ آپ چلیں گے ناں ہمارے ساتھ؟'' وہ بے اختیار اس کا ٹیبل پر رکھا ہاتھ تھام کر پوچھنے لگی۔

اور وہ تو جیسے دنگ رہ گیا۔

''یہ پلاننگ صرف آپ کی ماما کی اور آپ کی ہے یا اس میں کوئی اور بھی شامل ہے۔'' وہ کچھ بے چینی سے پوچھنے لگا۔

''آئی تھنک ابھی صرف ماما نے مجھ سے بات کی ہے بلکہ انہوں نے پاپا سے بھی یہی کہا تھا۔ پاپا کو کوئی اعتراض نہیں۔''

وہ چھوٹے بچوں کی طرح گھر کی ساری بات اسے بتا رہی تھی اور بلال کے دماغ میں کوئی چیز کلک ہوئی تھی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرا کر بے تابی سے پوچھ رہی تھی۔

''یہی کہ اگر ہمیں باہر ابروڈ جا کر سیٹل ہونا ہے تو پھر مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' وہ بہت سوچ سوچ کر بولا تھا۔

''کیا واقعی تم سچ کہہ رہے ہو تمہیں کوئی بھی اعتراض نہیں؟'' وہ بے یقینی سے چیخ پڑی۔

بلال نے اثبات میں سر ہلاتے اردگرد ٹیبلز پر لوگوں کو دیکھا۔

وہ بچوں کی طرح منہ کے آگے ہاتھ رکھے ہنس رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔

''اچھا ہے اگر میں یہاں سے دور بہت دور چلا جاؤں جہاں کشف کی یاد ہو ناں اس کا وجود۔''

''اور ماما...... ہاں ماما کے لیے اس سے بڑی خوشی کی خبر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ میں ایمان سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ ان کے لیے اس سے بڑی سزا بھی کوئی نہیں ہو سکتی کہ میں انہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلا جاؤں۔''

وہ سنگ دلی کی انتہا پر سوچتے ہوئے دل ہی دل میں مطمئن ہوتا جا رہا تھا اسے صرف اور صرف ثمینہ کو سزا دینا تھی جن کی وجہ سے کشف اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

''بلال! کیا سوچ رہے ہو۔''

''ایما ول یو میری می۔'' وہ مسکراتے ہوئے میز کے گلدان میں سے ہی پھول اس کی طرف بڑھا کر بظاہر بڑے رومانٹک انداز میں پوچھ رہا تھا۔

اور ایما کو لگ رہا تھا جیسے خوشی سے اس کا ہارٹ فیل ہی ہو جائے گا۔

☆☆☆

موحد نے بک شیلف سے ایک ایک کر کے ساری کتابیں اٹھا کر بیڈ پر رکھے کارٹن کے اندر رکھنی شروع کر دیں۔

ایک فائل کتابیں رکھتے ہوئے نیچے گر پڑی۔

اس نے جھک کر فائل اٹھائی۔

اس میں نکاح نامہ تھا۔

وہ کچھ دیر ساکت سا اسے دیکھتا رہا۔

"تو تم مجھ سے خلع لو گی کشف؟" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا۔

"چلو یہ بھی کر دیکھو تمہیں دنیا کی کوئی عدالت مجھ سے رہائی نہیں دلا سکتی چاہو تو میں یہ تمہیں لکھ کر دے سکتا ہوں۔"

وہ اونچی آواز میں بولتا نکاح نامے کے پیپرز کو بڑی احتیاط سے فائل میں رکھتے ہوئے کتابوں کے نیچے کر کے کارٹن میں رکھنے لگا۔

اس نے ٹرانسفر کی میل او کے کر دی تھی۔

☆☆☆

"جوں جوں لگتا تھا وقت گزرے گا یہ زخم مندمل ہو جائے گا۔ یا اس کی اذیت کچھ کم ہو جائے گی۔"

طاہرہ بیگم نے رندھی آواز میں کہہ کر ٹشو سے اپنی ناک سکوڑی۔

"مگر یہ غم تو اب مجھے قبر میں لے کر ہی جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے خالہ! ایسی باتیں نہیں کریں جس رب نے یہ غم دیا ہے وہ اسے سہارنے کی ہمت بھی دے گا۔" شائستہ صوفے سے اٹھ کر ان کے پاس بیڈ پر آ کر بیٹھ گئیں۔

آزر ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"دو ماہ سے اوپر ہو گئے دل سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہا، میری نازوں پلی پھولوں کی ڈال کیسے مٹی میں ہو گئی۔" وہ سسکنے لگیں۔

رمشا اچھی طرح سے دوپٹہ لیے ٹرالی میں چائے اور اسنیکس لا کر میز پر سجانے لگی۔

سلیمان ایک طرف سر جھکائے بے حس بیٹھا تھا۔

"اللہ اس کی ساری منزلیں آسان کر دے گا ان شاء اللہ جنتی وہ سعادت مند بیٹی تھی میرا تو واپس جانے کا دل بھی نہیں چاہ رہا، جانا بھی ضروری ہے کتنے ارمان لے کر آئے تھے اب اس طرح خالی ہاتھ جانا جیسے دل کٹ رہا ہو میرا بچہ سہرے کے پھول کھلے نہیں کہ یہ غم آ گیا۔

"خالہ! ہمیں خالی ہاتھ نہیں لوٹائیے۔ ہماری جھولی ایک بار پھر بھر دیں۔ رمشا میرے سلیمان کے نام کر دیں۔"

رمشا کے ہاتھ سے چائے کا بھرا کپ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نورِ نظر



یوں تو اس گھر میں بہت سے لوگ تھے جتنا بڑا گھر اس سے بڑا خاندان دادا، دادی سے لے کر چاچو پھپھو تک ہر رشتہ موجود تھا مگر اس گھر کی سب سے اہم فرد تھیں گڑیا پھپھو، پڑھی لکھی خوب صورت سلجھی و سنجیدہ طبیعت کی مالک، ویسے تو وہ بس ضرورت کے تحت ہی بولتیں مگر جب بولتیں تو یوں لگتا جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ پاؤں یوں زمین پر رکھتیں جیسے پانی پر چل رہی ہوں۔ ہر فن مولا ہر کام میں طاق، ہر بھابھی کے مسئلے کا حل گڑیا کے پاس، اماں کی تنہائی کا ساتھی گڑیا، کچن کی رونق گڑیا، ابا کا بہترین سامع گڑیا۔ بھائیوں کی بے وقت فرمائشیں گڑیا جانے اور تو اور بچے بھی ماؤں سے زیادہ گڑیا کے پاس پائے جاتے، ہر کام بس گڑیا کے ابرو کے اشارے کا منتظر، اگر یوں کہا جائے کہ گھر ایک سلطنت ہے تو گڑیا وہاں کی غیر اعلانیہ ملکہ۔

گھر میں ہر وقت میلہ سا لگا رہتا۔ ہلچل، گہما گہمی کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے، قہقہے، ٹھٹھے، اشتہا انگیز کھانوں کی مہک ہر وقت یوں گھومتی جیسے آوارہ مزاج ہوا۔ یہ تو تھی عام روٹین مگر آج کل رونق میں مزید اضافہ ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ تھا اس گھر کا چھوٹا بیٹا جو اپنی فیملی کے ساتھ دو دن پہلے لندن سے آیا تھا۔ کھانے کے بعد سب ایک کمرے میں موجود تھے۔ پورا خاندان اس کے اعزاز میں آج اپنی مصروفیات ترک کر چکا تھا۔ بچپن کی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ چائے، کافی کے دور چل رہے تھے۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ ہر ایک کے پاس باتوں کا ایک انبار تھا جسے وہ اپنے اندر سے نکالنا چاہتا تھا۔ پھر بات یوں چلی کہ چلتے چلتے گڑیا پر آرکی پھر تو جیسے باتیں ایک دم ختم ہو گئیں۔ سب ہنسی، مذاق، ٹھٹھے پرندوں کی طرح پھر کر کے اڑ گئے۔ اس کی جگہ خاموشی نے لے لی۔ خاموشی بھی ایسی جسے توڑنے کی کسی میں ہمت نہ تھی سب کے دماغوں میں بس ایک ہی سوال تھا۔ اب گڑیا کا کیا ہوگا؟ مگر جواب شاید کسی کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

سب ہی ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ خاص طور پر اماں، ابا اور بڑے بھیا جیسے اس سارے جرم میں ان کا ہاتھ سب سے زیادہ ہو۔ آخر چھوٹے نے ہمت کی اور بولا۔

''گڑیا! تم میرے ساتھ لندن چلو، کچھ عرصہ ماحول تبدیل کرلو۔''

''نہیں بھائی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔''

امی، ابو کے پاس پھر وہی خاموشی بن بلائے مہمان کی طرح براجمان ہو گئی۔ مگر کیا نہیں تھا اس خاموشی میں ڈر، خوف، اندیشہ، ناامیدی۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہے گڑیا!'' بڑے بھیا بولے۔

''ہاں جب تک ہم زندہ ہیں گڑیا کو ہمارے پاس ہی رہنے دو۔'' ابا نے گڑیا کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنے میں گڑیا کے فون کی گھنٹی بجی اور وہ سیل کان سے لگائے کمرے سے نکل گئی۔ چند لمحے خاموشی کی نظر ہوئے۔

''ویسے آپ سب نے اچھا نہیں کیا گڑیا کے ساتھ۔'' باہر سے آنے والی طرح دار چھوٹی بہو نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' منجھلے بھیا بولے۔

''یہی کہ اس کی ٹائم پر شادی نہیں کی۔ اتنی پڑھی لکھی، خوب صورت لڑکی کو گھر میں بٹھائے بوڑھا کر دیا۔'' باہر سے آنے والی بہو کچھ زیادہ ہی منہ پھٹ تھی۔ سب کے چہروں پر ناگواری کی لہر ابھری مگر خاموش رہے۔

''بس بہو! جو اس کے نصیب میں تھا۔ ہونا ہی تھا۔''

اماں نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''اپنے کرنے کو آپ سب نصیب کا نام نہیں دے سکتے۔'' چھوٹا تو جیسے بھرا بیٹھا تھا ایک دم پھٹ پڑا۔

''تمہارا کیا خیال ہے جو ہوا ہے اس سب میں



ہمارا قصور ہے۔" بڑے بھیا ذرا تلخی سے بولے۔
"جی ہاں! بالکل آپ سب کا قصور ہے۔ آپ سب مجرم ہیں۔ آپ سب کی وجہ سے اس کی زندگی کے اتنے قیمتی سال ضائع ہوگئے۔ اماں ابا آپ لوگ تو ماں باپ تھے۔ آپ لوگوں نے بھی اس کے لیے کچھ نہ سوچا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"
"بتاؤ کیا کرتے ہم۔ کسی فقیر کے ساتھ رخصت کردیتے یا کسی بھیک منگے کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ دے دیتے۔" ابا کا لہجہ کڑواہٹ لیتے ہوئے تھا۔

"جو کیا ہے ناں اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ کسی فقیر کے ساتھ ہی رخصت کردیتے، کم از کم وہ اتنی ویران نہ ہوتی۔ دوسری بات اچھے خاصے رشتوں کو آپ سب نے یوں ٹھکرا دیا جیسے وہ واقعی فقیر ہوں۔"
"تم جانتے ہوئے سب کچھ آنے والے رشتے کیسے تھے؟ کچھ تو اس کی عمر پڑھائی کی نظر ہوگئی باقی سب تمہارے سامنے ہے۔ خاندان میں سارے لڑکے معمولی کلرک، فوجی، دوکاندار یا پھر چند ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ جو رشتے باہر سے آئے نہ ان کا کوئی خاندان نہ ذات نہ برادری۔ ہم نے جس طرح گڑیا کی پیار و محبت اور آسائشوں میں پرورش کی تھی، وہ کہاں گزارا کرسکتی تھی۔ ان معمولی گھروں اور معمولی لوگوں میں۔" منجھلے بھیا نے خاصا تفصیلی جواب دیا۔
"بس کریں بھیا! کیا مل گیا ہمیں اس خاندانی ہونے کے لیبل سے۔ کم از کم اب تو ہمیں یہ بات مان لینی چاہیے کہ سب انسان برابر ہیں۔ دوسری بات خاندان کے اچھے خاصے رشتوں کو آپ لوگوں نے اتنا حقیر سمجھ لیا جیسے وہ دو وقت کی روٹی بھی آپ لوگوں سے مانگ کر کھاتے ہیں۔ بتائیں مجھے شمسہ خالہ کے بیٹے میں کیا کمی تھی۔ اس کی آڑھت کو آپ لوگوں نے دوکانداری کہہ دیا۔ لاکھوں نہ سہی ہزاروں تو کما ہی لیتا ہے۔ زبیدہ پھوپھو کے سفیان کو آپ لوگوں نے کلرک بنا دیا جو سولہویں گریڈ کا آفیسر ہے۔ آپ لوگ گڑیا سے حد سے زیادہ محبت کرتے تھے اتنی محبت کرتے تھے کہ اس کے لیے کسی عام شخص کا انتخاب نہ کرسکے۔" چھوٹے کا لہجہ آخر میں خاصا دھیما ہوا تھا۔

"ہاں تو کیوں نہ کرتے محبت اس خاندان میں تیسری نسل میں منتوں مرادوں اور دعاؤں سے بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ یہ ہماری محبت ہی تھی۔ جو ہم نے سارے خاندان سے ٹکر لے کر اسے وہاں تک پڑھایا جہاں تک اس علاقے کے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسے وہ چیز مہیا کی جو اس خاندان کے لڑکوں نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔" بڑے بھیا فخر سے بولے۔

"یہی تو بات ہے آپ سب سمجھتے ہیں کہ آسائشوں بھری زندگی ہی سب کچھ ہے۔ خوشیاں صرف عالی مرتبہ اور دولت کی محتاج ہوتی ہیں۔ کبھی غور سے دیکھیں کتنی تھکن ہے گڑیا کے چہرے پر۔ یہ کیوں ہے؟ یہ بے معنی مسافت کی تھکن ہے، ایسی مسافت جس کا کوئی انت نہیں۔ جس کی کوئی منزل نہیں۔ آپ سب کی محبتیں اس کے لیے بوجھ بن گئیں، ایسا بوجھ جسے اسے اکیلے ہی ساری زندگی اٹھائے پھرنا ہے۔ یہ محبت اس کے لیے بیڑیوں جیسی ہے۔ جنہیں نہ وہ کھول سکتی ہے اور نہ توڑ کر اپنی من پسند زندگی گزار سکتی ہے اور اس میں ہم سب نے مقدور بھر حصہ ڈالا ہے۔" آخر میں چھوٹے کا لہجہ گلوگیر ہوگیا۔
"ہاں کہتے تو تم ٹھیک ہو۔"
اماں جواب اکثر ہی خاموش رہتی تھیں۔ بات کرتے کرتے کسی نامعلوم نقطے کو تلاش کرنے لگتیں۔ آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔
پچھتاوا بھری خاموشی نے سب کے ہونٹ مقفل کردیے۔ تقریباً سب ہی اس بات پر متفق تھے۔ سب اس بات کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ ذہنوں میں اکثر پچھتاوے کے بادل بھی منڈلاتے تھے مگر زبان سے اس کا اظہار کرنا بہت مشکل تھا۔

☆☆☆

سب ہی اس سے محبت کرتے تھے۔ اسے گڑیا کہتے تھے اور شاید حقیقت میں بھی اسے گڑیا سمجھ لیا تھا جس کے نہ جذبات تھے نہ احساسات، بس جب جس نے چاہا اپنی محبت سے موڑ لیا اور وہ مڑتی چلی گئی۔

☆☆☆

باہر کھڑی گڑیا سوچ رہی تھی کاش اس کے حصے میں اتنی محبتیں نہ آتیں مگر کیسے نہ آتیں تین نسلوں بعد اس خاندان میں بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

تین بھائیوں کی اکلوتی بہن جہاں وہ پاؤں رکھتی بھائی پہلے ہاتھ رکھتے۔ اکلوتی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بلا کی خوب صورت اور معصوم تھی۔ جو ایک بار دیکھ لیتا مڑ کے ضرور دیکھتا۔ باپ تو گڑیا کو دیکھ دیکھ کر جیتا، ماں تمغے کی طرح سینے پر سجائے پھرتی۔ وہ آدھی رات کو سوتے میں ذرا اونچی آواز میں سانس لیتی تو دادا دادی سمیت سارا گھر رات اس کے سرہانے بیٹھ کر گزار دیتا۔

بھائی اپنا جیب خرچ اپنے بجائے اس پر خرچ کرتے، بات ابھی آدھی منہ میں ہوتی سارا گھر اسے پورا کرنے کی تگ ودو میں لگ جاتا۔ باپ بیٹوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں منصوبے بناتے ہیں اس ادارے میں تعلیم دلوائیں گے اس شہر میں بھیجیں گے مگر گڑیا کا باپ نرالا تھا اس کی ساری منصوبہ بندی گڑیا سے شروع ہو کر اس پر ہی ختم ہو جاتی۔

پنجاب یونیورسٹی میں پڑھنے والی نا صرف گاؤں کی بلکہ پورے علاقے کی پہلی لڑکی تھی۔ ہاسٹل میں رہنے میں مسئلہ ہوگا۔ اس لیے باقاعدہ لاہور میں گھر لیا گیا۔ جہاں ماں اور ایک بھائی مستقل رہتے تاکہ گڑیا کو کوئی مسئلہ نہ ہو۔ وہ چیز جو ابھی مارکیٹ میں آئی نہ ہو وہ گڑیا استعمال کرتی۔

وہ اس گھر میں رحمت بن کر آئی تھی پہلے بھی پیسے کی ریل پیل تھی مگر گڑیا کے بعد تو جیسے پیسہ بارش کی طرح برسنے لگا۔ زمین سونا اگلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اپنا گاؤں چھوڑ آس پاس کے گاؤں میں کوئی ان کا ہم پلہ نہ رہا۔ گھر کے ہر فرد کا اس بات پر یقین پختہ ہو گیا کہ یہ گڑیا کی ہی مرہون منت ہے۔

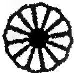
وقت بدلا بھابیاں آئیں مگر وہ بھی گڑیا کے سامنے رعایا کی حیثیت سے ہی رہیں۔ کیونکہ انہیں گڑیا کی اہمیت کا بخوبی اندازہ تھا۔

جتنی گڑیا خوب صورت تھی اس سے بڑھ کر ذہین وہ مسئلہ جس کا حل کوئی نہ ڈھونڈ سکتا۔ گڑیا یوں حل کرتی جیسے جادو کی چھڑی ہو اس کے پاس بس گھمائی اور سب ٹھیک۔ یوں تو گڑیا پہلے دن سے ہی سب کے لیے خاص تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کی اہمیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اتنی خاص ہوتی گئی کہ باقی ساری دنیا اس کے مقابلے میں عام بلکہ کمتر ہو گئی۔ حتیٰ کہ ماں باپ اور بھائیوں کو کوئی ایسا شخص نہ ملا جس کے ساتھ انہیں لگتا کہ وہ خوش رہے گی۔

آج اس مقام پر جب وہ اپنی زندگی کی چار دہائیاں گزار چکی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ کاش وہ ایک عام انسان ہوتی اپنی مرضی کرتی لڑتی جھگڑتی اپنی بات منوانے کے لیے ضد کرتی مگر اس کی نوبت تو کبھی اس کی زندگی میں آئی ہی نہیں ہر چیز اس کی دسترس میں ہوتی تھی۔ وہ جس چیز کو آنکھ بھر کے دیکھ لیتی وہ اس کی ہو جاتی۔ بھائی بن کہے اپنا حصہ اس کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔

آج وہ سوچ رہی تھی کاش وہ بھی حد سے زیادہ پیار و محبت میں بگڑ جاتی مگر نہیں وہ تو اور سلجھتی چلی گئی۔ وہ تو ان کی محبت کی قرض دار تھی اور یہ قرض ہی نہ اتر سکا اس سے ان سب کی محبتوں کا خمیازہ اسے ہی بھگتنا تھا اور تاعمر بھگتنا تھا۔

دشت تنہائی کی شکل میں ایسی تنہائی جہاں سب کا ساتھ تھا مگر وہ پھر بھی تنہا تھی کیونکہ اس کی روح کا ساتھی نہیں تھا۔ وہ ساتھی جو اگلے جہاں میں بھی اس کے ساتھ رہتا۔



کتابیں جھانکتی ہیں بند الماریوں کے شیشوں سے
بڑی حسرت سے تکتی ہیں
مہینوں اب ان سے ملاقاتیں نہیں ہوتیں
جو شامیں اُن کی صحبت میں کٹا کرتی تھیں
اب گزر جاتی ہیں اکثر کمپیوٹر کے پردوں پر
بڑی بے تاب رہتی ہیں کتابیں
انہیں اب نیند میں چلنے کی عادت ہو گئی ہے
بہت حسرت سے تکتی ہیں کہ جو قدریں جو سناتی تھیں
کہ جن کے سِن مرتے نہیں تھے
وہ قدریں اب نظر آتی نہیں گھر میں
جو رشتے وہ سناتی تھیں وہ رستے اُدھڑے
اُدھڑے ہیں
کوئی صفحہ پلٹتا ہوں تو اک سسکی نکلتی ہے
کئی لفظوں کے معنی گر پڑے ہیں
بنا پتوں کے سب ٹُنڈ لگتے ہیں وہ الفاظ
جن کے اب کوئی معنی نہیں اُگتے
بہت سی اصطلاحیں ہیں جو مٹی کی طرح بکھری
پڑی ہیں
گلاسوں نے انہیں متروک کر ڈالا
زباں پر ذائقہ جو آتا تھا صفحہ پلٹنے کا
اب انگلی کلک کرنے سے اک جھپکی گزرتی ہے
بہت تہہ تہہ کھلتا جاتا ہے پردے پر
کتابوں سے جو ذاتی رابطہ تھا کٹ گیا ہے
کبھی سینے پہ رکھ کر لیٹ جاتے تھے
کبھی گودی میں لیتے تھے
کبھی گھٹنوں کو اپنے رحل کی صورت بنا کر
نیم سجدے میں پڑھا کرتے تھے
چھوتے تھے جبیں سے
خدا نے چاہا تو وہ سارا علم ملتا رہے گا
بعد میں بھی
مگر وہ کتابوں میں ملا کرتے تھے سوکھے پھول
کتابیں مانگنے، گرنے، اُٹھانے سے یا بھی
رشتے بنتے تھے
اُن کا کیا ہوگا؟ وہ شاید اب نہیں ہوں گے
کتابیں جھانکتی ہیں بند الماریوں کے شیشوں سے

گلزار

خواب دیکھے ہے سماعت میری
اب ہمیں کون صدا دیتا ہے

سامنے کچھ ہے، دکھاتا کچھ ہے
دل تو اندھا ہی بنا دیتا ہے

حسن سے بحث نہیں ہو سکتی
بات باتوں میں گھما دیتا ہے

ہار جاتا ہے دلیلوں سے جہاں
شعر میرے ہی سنا دیتا ہے

کچھ جنوں پیشہ ہے دیوانہ ترا
کچھ زمانہ بھی ہوا دیتا ہے

جانے کیا روگ لگا ہے ہم کو
بندہ بندہ ہی دعا دیتا ہے

چار ہی دن کا تعلق ابرک
سب کی اوقات بتا دیتا ہے

اتباف ابرک



فاصلے جو محیطِ جاں تھے کبھی
چند لمحوں میں کٹ گئے آخر

میرے قدموں سے پھر سے وقتِ وداع
تیرے وعدے لپٹ گئے آخر

تو مکمل ملا نہ ہم کو کبھی
ہم بھی لوگوں میں بٹ گئے آخر

جتنے موسم تھے خواب بُننے کے
رتجگوں میں ہی کٹ گئے آخر

میری آنکھوں تک آتے سب رستے
زرد پتوں سے اَٹ گئے آخر

منیبہ قاضی

وہ شب کے سائے میں فصلِ نشاط کاٹتے ہیں
ہم اپنی ذات کے حجرے میں رات کاٹتے ہیں

عجیب لوگ ہیں اس عہدِ بے مروت کے
زبان کاٹ نہ پائیں تو بات کاٹتے ہیں

یہ لمحہ اہلِ محبت پہ بہت بھاری ہے
یہ لمحہ اہلِ محبت کے ساتھ کاٹتے ہیں

تھکن سے پورا بدن چُور چُور ہوتا ہے
پہاڑ کاٹتے ہیں ہم کہ رات کاٹتے ہیں

یہ رنگ سلے کے کہاں آ گئے ہو تم اظہر
یہاں تو لوگ مصور کے ہاتھ کاٹتے ہیں

اظہر ادیب

اُدگولی

اسماء کی مسکراہٹیں

سوا سیر

ٹرین میں ایک خاتون اپنے کتے کو ساتھ لے جا رہی تھیں۔ انہوں نے گارڈ سے کہا۔ ''میں نے اس کا ٹکٹ بھی خریدا ہے لہٰذا اسے بھی دوسرے مسافروں کی طرح سیٹ پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے۔''

''آپ نے بجا فرمایا۔'' گارڈ تحمل سے بولا۔ ''مگر دوسرے مسافروں کی طرح اسے بھی سیٹ پر پاؤں رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔''

کیفیت

ایک صاحب کے دوست نے محبت کی شادی کی تھی۔ ایک دن ان صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا۔ ''اپنی بیوی کو سامنے دیکھ کر تمہارے دل پر اب بھی کیا وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو شادی سے پہلے ہوتی تھی یا معاملہ کچھ بدل گیا ہے۔''

دوست نے جواب دیا۔ ''پہلے میں گھر کے سامنے دیر تک کھڑا کھڑکی کے پردے پر اس کے سائے کو دیکھتا رہتا تھا اور اندر جاتے ہوئے ڈرتا تھا اور اب بھی میری یہی کیفیت ہوتی ہے۔''

نتیجہ

ایک صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ان کی بیوی کا انتقال ہو جاتا تھا۔ جب ان کی چوتھی بیوی کا انتقال ہوا تو انہوں نے پانچویں شادی کا ارادہ کیا مگر کوئی بھی ان کو اپنی بیٹی نہیں دے رہا تھا۔ ان کے گھر والوں نے سوچا کہ کیوں نہ ان کی شادی ان کے مقابلے کی کسی بیوہ خاتون سے کر دی جائے۔ کافی تلاش کے بعد ان کی شادی ایسی خاتون سے کر دی گئی جس کی چار شادیاں ہو چکی تھیں اور چاروں شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا۔

لوگوں کو تجسس تھا کہ اس شادی کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ شادی کے تیسرے دن لوگوں کو معلوم ہوا کہ بے چارے نکاح خواں کا انتقال ہو گیا ہے۔

وقت گزاری

ایک ریٹائرڈ افسر کریانہ کی دکان پر گیا اور کہا۔ ''مجھے دال مسور کے 742 دانے دے دو؟''

دکان دار لڑکے نے بغیر کچھ کہے دو سو گرام مسور کی دال تول دی۔''

ریٹائرڈ افسر نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیا یہ واقعی 742 دانے ہیں؟''

لڑکے نے کہا۔ ''گھر جا کر گنتی کر لیں۔ میرے والد صاحب نے اس کی گنتی 3710 دانے فی کلوگرام کی ہے۔ یہ 200 گرام پورے 742 دانے ہوں گے۔

ریٹائرڈ افسر نے پوچھا۔ ''بہت خوب! ویسے تمہارے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟''

لڑکے نے جواب دیا۔ ''آپ کی طرح ریٹائر ہو گئے ہیں بس اسی طرح وقت گزارتے ہیں۔''

تاخیر سے شادی کا سبب

بیوی شوہر سے۔ ''میری شادی تو پڑھائی کی وجہ سے لیٹ ہوئی، آپ کی شادی کیوں لیٹ ہوئی؟''

شوہر: ''میں صدقے بہت کثرت سے دیا کرتا تھا۔''

بیوی۔ ''صدقہ سے شادی کا کیا تعلق؟''

''شوہر۔'' صدقہ بہت سی بلائیں ٹال دیتا ہے۔ بس اس سال مصروفیت کی وجہ سے صدقہ نہیں دیا تو — میری شادی ہو گئی۔

فرق

ایک خاتون ہر روز اپنے بچوں کو اسکول لاتی، لے جاتی تھیں۔ ایک دن وہ بیمار ہو گئیں تو ڈیوٹی بچوں کے باپ پر آ گئی۔ شام کو خاتون نے بچوں سے پوچھا۔

"آج باپ کے ساتھ ڈرائیو کیسی رہی؟"

بچوں نے کہا۔ "بہت اعلا، آج تو ایک بھی ایڈیٹ نہیں ملا نہ کوئی اندھا، بہرہ، گدھا، نہ کوئی نان سینس، نہ کوئی الو کا پٹھا بلکہ ہر کوئی بیوٹی فل، آہا، واؤ، آئے ہائے مرجاواں، صدقے جاواں جیسا ماحول تھا۔"

نہلے پہ دہلا

ایک شخص کی بیوی کو علم ہوا کہ اس کا شوہر دوسری شادی کا ارادہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک دن بڑے اہتمام سے رات کا کھانا بنایا اور چار انڈے ابال کر ہر ایک کو الگ الگ رنگ سے رنگا اور شوہر کو پیش کر دیا۔ شوہر نے پہلے حیرانی سے رنگ برنگے انڈوں کو اور پھر استفہامیہ نظروں سے بیوی کی جانب دیکھا۔

بیوی نے کہا۔ "آپ کھائیں اور پھر بتائیں کہ آپ کو یہ رنگ برنگے انڈے کیسے لگے؟"

شوہر نے تین انڈے کھائے اور تعجب سے بولا۔ "ان میں تو کوئی فرق نہیں، سب کا ذائقہ یکساں ہے، رنگوں کا کیا فائدہ؟"

بیوی مسکرائی اور گویا ہوئی۔ "سرتاج! عورتیں بھی سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ بس رنگوں کا فرق ہے۔"

شوہر نے چوتھا انڈا منہ میں ٹھونسا، اطمینان سے نگل کر ڈکار لی اور بولا۔

"ہاں سچ کہتی ہو۔"

وقت

"ارے تم تو اپنی بیوی کے ساتھ شاپنگ کرنے جا رہے تھے، اچانک فٹ بال کا میچ دیکھنے کیوں چلے آئے؟"

ایک شخص نے اپنے دوست کو اسٹیڈیم میں آتے دیکھ کر کہا۔

"یار دراصل ہم دونوں گھر سے شاپنگ کے لیے ہی نکلے تھے کہ راستے میں میری بیوی کو اس کی پرانی سہیلی مل گئی۔ میں نے سوچا کہ جب تک دونوں سلام دعا کرتی ہیں، کیوں نہ میں فٹ بال کا میچ ہی دیکھ لوں۔"

دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

نالائق

غائب دماغ پروفیسر نے ایک دن بھنگ پی لی اور نشے میں ٹوٹی ہوئی قبر پر جا گرے۔ صبح آنکھ کھلی، نشہ اترا تو زور سے بڑبڑائے۔

"غضب خدا کا، یوم حشر آ گیا۔ میں واحد مردہ ہوں جو اپنی قبر سے نکل آیا۔ باقی نالائق سب ڈھیٹ بنے سو رہے ہیں۔"

وعدہ

احمد صاحب کی بیوی انہیں ہمیشہ دھمکی دیتی تھیں کہ میں تو بچوں کی وجہ سے تمہارے ساتھ رہ رہی ہوں، ورنہ کب کی تمہیں چھوڑ چکی ہوتی۔ احمد صاحب ہمیشہ مسکرا کر چپ ہو جاتے تھے۔

شادی کو پچیس سال گزر گئے۔ کسی بات پر بحث ہوئی تو انہوں نے پھر یہی دھمکی دی، اس پر احمد صاحب مسکرا کر بولے۔

"اب تو تینوں بچوں کی شادی ہو گئی ہے، اب تم مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہو۔"

"اب اپنے پوتے کو چھوڑ کر کیسے جاؤں۔ ذرا میرے پوتے کی شادی ہو جائے پھر دیکھیں میں آپ کو کیسے چھوڑ کر جاتی ہوں۔"



شگفتہ جاہ

آسمان سے جنت کی خبر لانے والے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ان میں سے ایک کہتا ہے "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (بہترین) بدلہ عطا فرما۔" دوسرا کہتا ہے۔ "اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصے میں ہلاکت کر۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

1۔ جس خرچ پر دعائے خیر کی نوید ہے اس سے مراد صدقات کے علاوہ اہل و عیال اور مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا اور جس امساک (ہاتھ روک رکھنے) پر بددعا ہے وہ زکوٰۃ، صدقات اور مستحبات پر خرچ کرنا ہے۔ ہلاکت سے مراد مال کی ہلاکت یا بخیل کی اپنی ہلاکت بھی ہو سکتی ہے واللہ اعلم۔

2۔ فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاک مخلوق ہیں جو کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ایسے فرمانبرداروں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے۔ اس لیے فرشتوں کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں۔ جو بغیر کسی مفاد کے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

قطع رحمی کرنے والا

حضرت عثمان بن عفان کے آزاد کردہ غلام حضرت ابو ایوب سلیمانؒ کہتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، شب جمعہ میں جمعرات کی شام کو ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا۔ "ہماری اس مجلس میں جو بھی قطع رحمی کرنے والا بیٹھا ہے۔ میں اسے پوری تاکید سے کہتا ہوں کہ وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا جائے۔

اس پر کوئی کھڑا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ بات تین دفعہ کہی تو اس پر ایک نوجوان اپنی پھوپھی کے پاس گیا، جس سے اس نے دو سال سے تعلقات ختم کر رکھے تھے اور اسے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ جب اپنی پھوپھی کے پاس پہنچا تو پھوپھی نے اس سے پوچھا۔
"میاں تم کیسے آگئے؟"
اس نے کہا۔ "میں نے ابھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایسے اور ایسے فرماتے ہوئے سنا ہے (اس وجہ سے آیا ہوں)"
پھوپھی نے کہا "ان کے پاس واپس جاؤ اور ان سے پوچھو کہ انہوں نے ایسے کیوں فرمایا ہے؟"
اس نوجوان نے واپس جا کر ان سے پوچھا تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔
"میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ شب جمعہ میں ہر جمعرات کی شام بنی آدم کے اعمال اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں (اور تمام انسانوں کے اعمال تو قبول ہو جاتے ہیں لیکن) قطع رحمی کرنے والے کا کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔"
(حیاۃ الصحابہؓ)

والد کا اکرام

حضرت ابو غسان رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ (مدینہ منورہ کے) پتھریلے میدان میں چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے کہا یہ میرے والد ہیں۔ انہوں نے فرمایا ان کے آگے مت چلا کرو بلکہ ان کے پیچھے یا ان کے ساتھ پہلو میں چلا کرو اور کسی کو ان

کے اور اپنے درمیان نہ آنے دو اور اپنے والد کے مکان کی ایسی چھت پر نہ چلو جس کی منڈیر نہ ہو کیونکہ اس سے ان کے دل میں (چھت سے تمہارے نیچے گر جانے کا) خطرہ پیدا ہوگا (اور وہ اس سے پریشان ہوں گے) اور گوشت والی ہڈی پر تمہارے والد کی نگاہ پڑ چکی ہو تم اسے نہ کھاؤ ہوسکتا ہے وہ اسے کھانا چاہتے ہوں۔"

(حیاۃ الصحابہؓ)

بندوں کی مدد

حضرت شیخ علاؤالدین السمنانی ۔ بہت بڑے ولی اللہ ہیں ۔اپنی جوانی کے ایام میں وزیر رہ چکے تھے۔ جب ان پر جذبہ الٰہی طاری ہوا تو انہوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی اور چالیس سال تک خدا کی عبادت و ریاضت میں، کہ شاید ہی کسی انسان کی طاقت ایسی ریاضت کی متحمل ہوسکتی ہو۔ مشغول رہے۔ آخری وقت خواب میں دیکھا کہ میدان حشر گرم ہے اور خلق خدا کے اعمال کی جانچ پڑتال ہورہی ہے۔ اسی دوران یہ حکم سنائی دیا کہ علاؤ الدین کے تمام نیک و صالح اعمال اور اس کی چالیس سالہ ریاضت و عبادت کو ایک پلڑے میں اور جو اس نے اپنی وزارت کے درمیان ایک بڑھیا کی دل جوئی اور دل دہی کی تھی، اسے دوسرے پلڑے میں رکھا نتیجے میں موخرالذکر پلڑا جھک گیا۔

جب شیخ اس عبرت آموز خواب سے بے دار ہوئے تو انہیں بے حد افسوس اور ملال ہوا کہ اگر میں اس کی قدر پہلے جانتا تو کبھی درویشی کی طرف مائل نہ ہوتا اور نہ کبھی ترک ملازمت کرتا۔

انسان کے بارے میں فیصلہ

ایک شخص کے چار بیٹے تھے۔ وہ اپنے بیٹوں کو زندگی میں کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیٹے اپنی زندگی کے فیصلے خود اور جلد بازی میں نہ کریں۔ اس نے فرداً فرداً ان کو دور دراز ایک مہم پر بھیجا۔

مطلوبہ مقام پر ایک خوب صورت ناشپاتی کا درخت تھا۔ جس پر پورے علاقے میں سب سے شیریں رس بھری ناشپاتیاں آتی تھیں۔

سب سے بڑا بیٹا سردیوں ، دوسرا بہار، تیسرا گرمیوں اور چوتھا بیٹا خزاں سے پہلے وہاں بھیجا گیا۔

جب سب ایک ایک بار وہاں سے ہو کر لوٹ آئے اور ایک برس گزر گیا تو باپ نے سب بیٹوں کو اکٹھا کیا۔ اس نے باری باری سب سے پوچھا انہوں نے درخت کو کیسا پایا؟

بڑا بیٹا بولا" بابا وہ ایک ٹیڑھا میڑھا بدنما درخت تھا۔"

دوسرے نے کہا۔ "نہیں بابا، وہ سرسبز و شاداب درخت تھا۔"

تیسرا گویا ہوا وہ درخت، شگوفوں، سبزے اور کیف آگیں مہک سے بھرا تھا۔ بابا! میں نے اس سے زیادہ خوب صورت درخت آج تک نہیں دیکھا۔"

چوتھے، سب سے چھوٹے بیٹے نے سب کی رائے سے اختلاف کیا۔ "بابا! وہ لذیذ رس سے بھری ناشپاتیوں سے لدا ہوا درخت تھا اور زندگی سے بھرپور۔"

باپ نے جب سب کی رائے سن لی تو بولا۔ "تم سب سچ کہہ رہے ہو۔ تم سب نے درخت کو صرف ایک موسم میں دیکھا اسے درست طور پر تب ہی جان سکتے ہو، جب تم اسے سب موسموں میں دیکھ لو۔ انسان بھی اسی طرح ہوتے ہیں۔ کبھی غصے میں، کبھی خوشی میں، کبھی دانائی کے فیصلے کرتے ہوئے اور کبھی نادانی کے دور میں حماقتیں کرتے ہوئے ، سو تم کسی انسان کے بارے میں اس کی زندگی کے ایک موسم کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کرسکتے۔"

یقین کی طاقت

پاولو کوئیلہو، مشہور معروف دانش ور اور ادیب ہے۔ اس نے ایک سادہ دل بندے کے یقین اور راست فہمی پر ایک حکایت لکھی ہے۔

ایک شام منڈی سے واپسی پر ایک کسان نے

دیکھا کہ وہ اپنی دعائیہ کتاب گھر بھول آیا تھا۔ اس کے چھکڑے کا پہیہ بیچ جنگل کے نکل گیا اور اسے خدشہ لاحق ہو گیا کہ وہ ہر شام پڑھی جانے والی اپنی دعا نہ پڑھ پائے گا۔ وہ نیم خواندہ سادیہاتی آدمی تھا اور دعائیں زبانی یاد بھی نہ تھیں خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے یہ دعا مانگی۔

"اے میرے رب! آج میں نے بہت ہی احمقانہ حرکت کی ہے۔ میں اپنی دعائیہ کتاب گھر بھول آیا ہوں، مجھے زبانی ایک بھی دعا یاد نہیں ہے۔ اے میرے پیارے رب! میرے پاس ایک ہی راستہ بچتا ہے۔ مجھے حرف تہجی زبانی یاد ہیں۔ میں الف سے لے کر ے تک پانچ بار آہستہ آہستہ ترتیب میں پڑھ دوں گا۔ اے رب! تو سب علم رکھنے والا ہے اور سب دعائیں جاننے والا ہے۔ ان حروف کو خود ہی ان دعاؤں کی شکل میں ترتیب دے لے۔ جو میں پڑھتا ہوں۔"

رب نے فرشتوں سے کہا۔ "آج کے روز مجھ تک جتنی دعائیں پہنچیں یہ ان میں سب سے بہترین دعا تھی کیوں کہ یہ اس کے دل سے نکلی تھی جو پاک اور مخلص ترین تھا۔"

ترکہ

جس وقت حضرت شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانیؒ کا وصال ہوا تو آپ نے چار کروڑ روپے ترکہ میں چھوڑے۔ آپ کے چار بیٹے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد بڑے بیٹے حضرت صدرالدینؒ مسند پر بیٹھے تو انہوں نے حکم دیا۔

"میرے حصے کے ایک کروڑ روپے فقراء میں تقسیم کر دیے جائیں۔"

لوگوں نے عرض کی۔ "آپ کے والد نے باوجود یادِ خداوندی کے چار کروڑ روپے جمع کیے اور آپ اس طرح اتنی بڑی رقم ختم کیے ڈالتے ہیں۔"

فرمایا۔ "میرے والد بڑے عالی ظرف تھے۔ ان کے پاس چار کروڑ تھے۔ پھر بھی یاد خدا کیا کرتے تھے لیکن میرا یہ حال ہے کہ جب سے سنا ہے کہ میرے حصے میں ایک کروڑ روپے آئے ہیں۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے ان روپوں کی وجہ سے میں خدا سے غافل نہ ہو جاؤں۔ اس لیے ان کو تقسیم کر دینا ہی بہتر ہے۔"

تقدس گیلانی، شیخوشریف

دو باتیں

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا۔ آخر پہچان کر بولا۔

"تم وہی آدمی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے؟"

"ہاں میں وہی شخص ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا۔"

حکیم لقمان نے فرمایا۔ "دو باتوں سے۔ ایک سچ بولنا۔ دوسرے بلا ضرورت بات نہ کرنا۔"

مریم صدیقہ...... حیدر آباد

دعا

دعا کے بارے میں مجھے کامل یقین ہے کہ خلوصِ دل سے نکلی ہوئی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے یہ الگ بات ہے کہ قبولیت انسان کی مرضی کے مطابق ہو یا اللہ کی رضا کے مطابق ہو، خوش قسمت لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کی رضا کے تابع رکھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی دعا اپنی مرضی کے مطابق پوری ہو یا نہ ہو، ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں۔

عبدیت کی یہ شان اگر مستحکم ہو کر ترقی پاتی رہے تو رفتہ رفتہ انسان کی رسائی کسی حد تک مقام مرادیت تک بھی ممکن ہو سکتی ہے۔"

(قدرت اللہ شہاب کے "شہاب نامہ" سے اقتباس)

سارہ بتول راولپنڈی



خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

روبینہ عارف ____ دہلی کالونی کراچی

تو میرے دل کی تباہی کا کوئی رنج نہ کر
میں نے دانستہ اسے عشق میں برباد کیا
یہ جدائی تو مقدر بھی میرے دل کے مکیں
میں نے خود اپنی خوشی سے تجھے آزاد کیا

رخسانہ جمیل ____ لیاری

کشکول میں ہر شخص کے صرف اپنی انا ہے
خیرات میں بھی لوگ محبت نہیں دیتے

سائرہ علی ____ فلوریڈا

بے چین کیے رکھتی ہے ہر آن پہ دل کو
کم بخت محبت کے بھی آزار بہت ہیں
خادرا سے پالینے میں کھو دینے کا ڈر ہے
اندیشۂ حسرت کے میاں خار بہت ہیں

فرح علی ____ نرسری

میں بتاؤں وہ داستاں، میرے دل سے وہ کیوں اتر گیا
میرے سامنے کوئی بات کی، میرے سامنے ہی مکر گیا

عصمت اکرم ____ لاہور

کسی نے دھول کیا آنکھوں میں ڈالی
میں اب پہلے سے بہتر دیکھتا ہوں

فاکہہ سہیل ____ کراچی

حاصل عمر ہے جو ایک کسک باقی ہے
میری سانسوں میں ابھی اس کی مہک باقی ہے
پھر تجھے اور مجھے اور کہیں جانا ہے
ہم سفر ساتھ تو چل جتنی سڑک باقی ہے

رومان احمد ____ گلشن معمار

گلاب چہروں سے دل لگانا وہ چپکے چپکے نظر ملانا
وہ آرزوؤں کے خواب بننا وہ قصۂ ناتمام لکھنا
مرے نگر کی حسین فضاؤ کہیں جو ان کا نشان پاؤ
تو پوچھنا یہ کہاں بسے وہ کہاں ہے ان کا قیام لکھنا

ارم کمال ____ فیصل آباد

رلا دیتی ہے ہر سچی کہانی
میں اک جھوٹا فسانہ چاہتا ہوں

نوال افضل کھمن ____ گجرات

میں آج زد پہ اگر ہوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

نادیہ یاسر ____ گوجرخان

لفظوں کی دسترس میں مکمل نہیں ہوں میں
لکھی ہوئی کتاب کے باہر بھی سن مجھے

نمرہ، اقرا ____ کراچی

میں قصۂ مختصر نہ تھا
ورق کو جلدی پلٹ گئے تم

اقصیٰ ناصر ____ گلستان جوہر

اے گریۂ زار زندگی کچھ دیر معذرت
میرا بھی دل کیا ہے ذرا مسکراؤں میں

آسیہ جاوید ____ علی پور چٹھہ

عاشقی سب سے بڑا ہے زندگی کا حادثہ
اب کسی خطرے کو خاطر میں کہاں لاتا ہوں میں
بے وفائی بھی مجھے بےزار کر سکتی نہیں
اب بھی دانستہ فریب دوستی کھاتا ہوں میں

عائشہ ____ گوجرہ

اُبھر رہا ہے جو فتنے مری زمینوں میں
وہ سانپ ہم نے ہی پالا ہے آستینوں میں
قصور وار سمجھتا نہیں کوئی خود کو
چھڑی ہوئی ہے لڑائی منافقوں میں

صائمہ سلیم شہزادہ ____ کے ڈی اے

پتھر کا شہر اور تکلم کی آرزو
میں کس سے کروں بات کوئی بولتا نہیں

بقیہ خط آپ کے

لکھنے سے آپ کو قطعاً کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ ڈاک ہمارے پاس آتی ہے اور ہم اس سلسلے میں بے حد احتیاط کرتے ہیں۔ بہت سی بہنیں لفافے پر اپنا ایڈریس لکھ دیتی ہیں، ہم ان خالی لفافوں کو بھی جن پر ایڈریس ہوتا ہے، ضائع کر دیتے ہیں کہ کسی اور کے پاس ایڈریس نہ جائے۔
افسانہ قابل اشاعت ہے تو ضرور شائع ہوگا۔

گڑیا راجپوت نے جاتری شریف سے لکھا ہے

ماڈل پسند نہیں آئی۔ چہرہ میک اپ نے خراب کیا ہوا تھا۔ ''پہلی شعاع'' پڑھ کر دل دکھا۔ ''بندھن'' اچھا نہیں لگا۔

■ ائزہ بھٹی افسانے کی اشاعت پر ڈھیروں مبارک باد۔ ڈاکٹر فریال کے بالوں کا پڑھا تھا، بے اختیار ہنسی آئی۔ میرے بال بھی گھنگھریالے ہیں لیکن اللہ کا شکر لمبے ہیں، کمر تک آتے ہیں۔

عربی کہانیاں پڑھ کے اچھا لگا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر کہانیوں کے نام کے ساتھ رائٹرز کے نام بھی لکھ دیتیں۔

☆ پیاری گڑیا! پرچے کی تعریف و تنقید کے ساتھ آپ نے تحریروں پر تبصرہ کیا، بہت شکریہ۔ ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں اور کوشش کریں گے کہ پرچے کو مزید بہتر بنا سکیں۔

فوزیہ ثمر بٹ، ہانیہ عمران، آمنہ رئیس، حریم فاطمہ
گجرات سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

اکتوبر کا شعاع مجھے دو تاریخ کو ملا۔ ماڈل میرے پسندیدہ کلر ڈریس میں تھی اور پنک بیک گراؤنڈ یہ دونوں میرے فیورٹ ہیں۔

''پہلی شعاع'' میں باتیں غور سے سنیں۔

حمد باری تعالیٰ، نعت رسول مقبول ﷺ پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ پیاری باتیں ہمیشہ سے پیاری لگتی ہیں۔

''بندھن'' اسماء آصف الیاس سے ملاقات اچھی رہی۔ یہ موصوف ارطغرل سیزن دوم میں کہیں نظر نہیں آئے، کسی کردار میں۔

ناول ''سفر'' کی دوسری اور آخری قسط لاجواب رہی۔ اینڈ خاصا رومانٹک سا لگا۔ ایک اچھی بات عائشہ کا اپنی ماں کے ساتھ اچھا برتاؤ تھا۔ ابن آدم کی اولاد ہیں، غلطیاں وراثت میں ملی ہیں، مگر معاف کرنا اعلا اوصاف ہیں۔

اس ماہ کی بیسٹ تحریر ''زرتاشہ'' لگی۔

''یار دل دار'' شامل تھا اور مزے دار بھی۔ تھوڑے صفحات بڑھا دیں۔ ''میراں کی کمائی'' نے بھی اچھا سبق دیا۔

پیاری فوزیہ! آپ ہماری مستقل قاری ہیں اور باقاعدگی سے خط لکھتی ہیں۔ آپ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ آپ اچھا خط نہیں لکھ سکتیں۔ آپ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ ہر سلسلہ، ہر کہانی پڑھتی ہیں اور بڑی بے ساختگی اور روانی سے بے لاگ تبصرہ کرتی ہیں۔ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی۔ ■ نازنین اور شہر تمنا اس ماہ اختتام کو پہنچے۔ پڑھیے اور دیکھیے کہ آپ کے اندازے کس حد تک درست ثابت ہوئے۔

آصف الیاس ڈرامے میں نظر نہیں آئے، ان کی آواز ہے۔ ارطغرل پر ان کی آواز ڈب کی گئی ہے۔

صدف ناصر...... سرفراز کالونی گوجرانوالہ

ٹائٹل بہت اچھا بہت سادہ تھا۔ دنیا اور اپنے ملک کے جو حالات ہیں یہ ''سادگی دل و نظر کو بہت بھا رہی تھی''۔

''پہلی شعاع میں رضیہ آنٹی'' فکر کے ہزاروں در وا کر گئیں۔ ''حمد و نعت سبحان اللہ دل کو چھو گئیں۔ بچے کی زبان پر ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' ہے۔''
پیارے نبی کی باتیں'' اس مرتبہ من پسند ٹاپک ہے۔ بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا واقعی میں ہم جیسے گھریلو لوگوں کو'' آمنہ بیٹھ کر مفت کی سیر کرواتی ہیں مزے مزے کی۔ ''شاہین رشید'' نے حسن خان سے ملاقات اچھی کروائی۔ ''جب تجھ سے ناتا'' بہن رخ۔ ش کے حالات پر دل افسردہ ہو گیا۔ مگر شکر کہ آپ ''پازیٹو'' رہیں۔ آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ بہن۔

ق۔ ع نے بے ساختہ، بے حد ہنسایا اور اینڈ پر

چھے پیغام دیے۔ ''خط آپ کے'' کیا ہے۔ ایک جادو نگری ہے۔ دوستی ''پیار'' خلوص سب ہی کچھ ہے یہاں۔
پیاری صدف تفصیلی تبصرہ پڑھ کر بہت لطف آیا۔
اپنے دیور کی شادی کا مختصر احوال کیوں، تفصیلی احوال لکھیں۔ قارئین کی شمولیت کے لیے ہی ہم نے یہ سلسلے شروع کیے ہیں۔
ام حماد نے گاؤں ڈوگراں والی سے لکھا ہے
''ماریہ نواز کے ''سفر'' ناول کے الفاظ دل کو لگے۔
''کوئی کسی سے کچھ نہیں چھینتا، ہر انسان اپنے حصے کا سکھ دیکھتا ہے بہانہ کوئی بھی بن جاتا ہے۔'' اللہ تعالیٰ سے دعا ہے آپ کی پوری ٹیم کو خوشیاں دیکھنی نصیب فرمائے۔
آج سے بیس سال پہلے ایک کہانی پڑھی تھی کوئی خواہش روتی رہی ہے لبنیٰ غزل کی جو آج تک یاد ہے۔ یہ رسالے دکھ سکھ میں ساتھ رہے۔ میرے شوہر سر کے تاج کومے میں چلے گئے۔ ہسپتال میں اخبار والا بھائی آیا اور میرے بھائی نے رسالہ لے دیا جس میں ام الیقین نے اتنی تسلی دی کہ دل کو سکون مل گیا۔ میں دو جامعہ میں پڑھاتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں آپ کب پڑھتی ہیں۔ اس کے لیے ٹائم نکل آتا ہے۔
جب میری شادی ہوئی تو میرے شوہر بازار گئے تو دوسرے رسالے اٹھا لائے تو میں بہت مسکرائی میں نے کہا میں خواتین اور شعاع پڑھتی ہوں، کہتے ہیں اس میں بھی تو تصویر ہیں۔ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔
ام حماد! بہت خوشی ہوئی آپ نے ہمیں خط لکھا، شعاع اور خواتین کی کہانی پڑھ کر آپ کو ہمت اور حوصلہ ملا۔ یہ جان کر ہماری محنت وصول ہوگئی۔ ہم آپ کی دعاؤں میں شامل ہیں۔ بہت شکریہ اس سے بڑا تحفہ کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دین و دنیا کی نعمتیں اور خوشیاں عطا فرمائے۔ آمین۔
حفصہ صفدر، شگفتہ صفدر، اذان صفدر کراچی سے شریک محفل ہیں
پہلی نظر سرورق پر ڈالی۔ اونہوں بالکل پسند نہیں آیا۔ البتہ پچھلے مہینے خواتین اور شعاع دونوں کے ٹائٹلز بہت اچھے تھے۔ ہماری بھی بڑی خواہش ہے کہ آپ سے پوری نہ سہی آدھی ملاقات ہی کر لیں کبھی۔ امثل جی کے بھی بہت بڑے فین ہیں۔ ہمارے ذہن میں ان کا بڑا خوب صورت تصور ہے۔ دھیما سا بولنے والی اور نرم مزاج سی۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے دیرینہ دوست سے ملاقات ہو رہی ہے۔ پورا ستمبر ہم نے جس کہانی کے انتظار میں گزارا وہ ''سفر'' تھی ماریہ نواز کے قلم سے شاہ زین کا کریکٹر ونڈر فل اینڈ اسٹوری گریٹ، نیا نام، اچھی کاوش،
''شام کی حویلی'' یہ کیا غضب ڈھایا۔ ردا کو مار ہی دیا۔ پھر فرحان کی موت چاہیے کیسے بھی ہو، کوئی فائدہ نہیں۔ ہماری امی کو ردا کے مرنے کا بہت دکھ ہے۔ جس رات کہانی پڑھی اس رات سو بھی نہیں سکیں۔
تاریخ کے جھروکے پڑھے ہوئے تھے۔ اوور آل اس ماہ کا شعاع بورنگ تھا۔
حفصہ! شگفتہ اور اذان! شعاع آپ کو بورنگ لگا۔ یہ آپ تینوں بہنوں کی مشترکہ رائے ہے یا جس بہن نے خط لکھا ہے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے؟
بہرحال ہمیں افسوس ہے کہ اس ماہ شعاع آپ کو پسند نہیں آیا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔
رضوانہ وقاص نے ہری پور کرلاں سے لکھا ہے
شعاع ہفتے والے دن ملا۔ 20 تاریخ سے پتا کرنے لگ جاتی ہوں۔ کبھی کبھی شوہر کہتے ہیں، اتنی جلدی نہیں آتا لیکن تم روز ضرور پتا کرواتا۔ اس دفعہ میرے شوہر کچھ ناراض تھے مجھ سے۔ لیکن پرچا لے آئے۔ اس بات کے لیے میرے شوہر کا شکریہ کہ کبھی پڑھنے سے منع نہیں کیا۔ اور اب تو خط بھی لکھنے لگی ہوں، کچھ نہیں بولتے۔ ماڈل پسند آئی۔
☆ پیاری رضوانہ! شعاع پورے پاکستان میں پہلی تاریخ کو دستیاب ہوتا ہے آپ اپنے شوہر کو ہر ماہ یکم کو بازار بھیجیں تاکہ انہیں خالی ہاتھ نہ لوٹنا پڑے۔
''ناتا جوڑا ہے'' کے سلسلے میں بہنیں اپنا نام لکھتی ہیں۔ ہم نام اس لیے نہیں لکھتے کہ یہ لکھنے والی بہن کی زندگی کے تجربات ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کو ان کے

متعلقین بھی پڑھ سکتے ہیں شوہر یا سسرال والوں کو اعتراض ہوسکتا ہے، وہ ناراض ہوسکتے ہیں۔

ریحانہ چوہدری نے مدو کے رندھیر سے لکھا ہے

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے پڑھا بہن رخ ش کے حالات پڑھے، پھر ق ع کے...... زندگی کے دو رخ سامنے آئے۔ یہ حقیقت ہے جس بہن کے ساتھ جو کچھ بیتا ہوتا ہے وہ وہی بتائے گی اور مقام شکر یہ ہے کہ ڈائجسٹ نے ایک کندھا مہیا کردیا ہے جس پر اپنے الفاظ کا بوجھ ڈال کر بہنیں اپنا دل ہلکا کرلیتی ہیں اور کچھ بہنیں ان کے خیالات جان کر اپنے دلوں کو تسلی دے لیتی ہیں کہ حالات کی چکی میں پسنے والی وہ اکیلی نہیں بہت سے لوگ ایسے ہی حالات کا شکار ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر قاری کے لیے ڈائجسٹ بیک وقت بہن، دوست، ماں، باپ، استاد ڈاکٹر حتیٰ کہ ماہر نفسیات کا کام بھی دیتا ہے ایک مکمل پیکیج کے ساتھ۔

خطوط کی محفل کی رابعہ جی آپ کے ذوق مطالعہ کی داد دینے کو ہی خط لکھ رہی ہوں۔ آپ نے بہت باریک بینی سے مطالعہ کیا اور ایک حقیقت کی نشاندہی کی۔ ہر لکھنے والے کو واقعی الفاظ کے چناؤ میں بہت احتیاط کرنی چاہیے۔ آپا جی اکلوتے بیٹے سکندر کی شادی میں خوب انجوائے کیا مگر تھکاوٹ حد سے سوا تھی۔ پھر اسکول ری اوپن ہوگئے ہیں تو مصروفیت کا گراف بہت بلند ہوگیا ہے۔ اور سرما کی سبزیاں بھی لگانی ہیں لان میں، لہٰذا اس وقت اسکول فری پیریڈ میں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں۔

ریحانہ! محفل میں شرکت کے لیے بہت شکریہ۔ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہم پورا خط شائع نہ کرسکے۔ حسب روایت آپ کا خط اور تبصرہ شان دار ہے۔ آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں گیا۔

کراچی سے تسنیم کوثر لکھتی ہیں

اس بار شعاع کے افسانوں اور ناولز کی بات کی جائے تو جناب گل ارباب کے پیارے سے ناول زرتاشہ نے دل خوش کردیا۔ مکمل جامع تحریر جس میں کوئی جھول نہیں تھا۔ بے جا نہ ہوگا۔ اور ماریہ نواز کے ناول سفر کی بات کی جائے تو معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اس دفعہ اسٹوری کوئی خاص نہیں لگی۔

سب سے پیاری محفل تو خط آپ کے میں بجتی ہے اتنے اچھے اچھے خطوط اور آپ کے ٹھنڈے میٹھے جوابات مزاد یتے ہیں۔ ڈاکٹر فریال مزیدار لکھتی ہیں ڈاکٹر ہونے کے باوجود شعاع پڑھنے میں مشکل ہونا حیرت ہوتی ہے۔ بہرحال ان کا انداز تحریر معصومانہ اور دلچسپ لگتا ہے۔

☆ پیاری تسنیم حیرت تو ہمیں بھی ہوتی ہے۔ ایک سمجھ دار، تعلیم یافتہ، پروفیشنل ڈاکٹر پر اتنی پابندیاں کیوں ہیں؟ یہ سوال ہماری دیگر قارئین نے کیا ہے۔ اب اس سوال کا جواب تو ڈاکٹر فریال خود دے سکتی ہیں۔

آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح جان دار اور شان دار ہے بہت شکریہ۔

زینب نور...... جہانیاں سے لکھتی ہیں

سب سے پہلے ”شام کی حویلی“ پڑھی۔ اس قسط نے بھی مزہ دیا۔ کشف دراصل کس کی اولاد ہے؟

”نازنین“ ہر قاری کی طرح یہ ناچیز بھی اس تحریر کو بے حد پسند کرتی ہے۔ بھئی اپنے گاؤں کی نہر کے علاوہ ہم نے دیکھا ہی کیا ہے؟؟ اور فرح جی نے ہمیں پہاڑی علاقہ دکھایا ”دریائے ژوب سمیت۔

افسانوں میں ”تربیت“ بہترین لگا...... راؤ سمیرا کے اک اک لفظ سے متفق ہوں، میری امی ایک کہاوت کہتی ہیں۔ ”دیکھے باپ گھر برتے آپ گھر“ تو لگتا ہے یہ افسانہ اسی کہاوت کو سامنے رکھ کے لکھا گیا ہے۔

جویریہ مریم...... لڑکا مخلص ہے یا نہیں...... رابطے رکھنا سراسر غیر شرعی حرکت ہے۔ محض لمحے بھر کا التفات دیکھ کر یوں کھڑے کھڑے کون اپنی زندگی کا فیصلہ کرتا ہے......؟؟

زرقا سکندر اور شازیہ الطاف کا لکھا بھی پسند آیا۔ ”خط آپ کے“ پہلا خط (سلمیٰ مسرت) ہی بے حد پسند آیا۔ عاصمہ یاسین...... ہم بھی آپ کی طرح ہیں...... ہم بھی ساون کی بھاگتی دوڑتی دھوپ کی طرح کبھی لمحے بھر میں ہنس رہے ہوتے ہیں اور اگلے لمحے آنکھیں پانیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ پیاری فہمیدہ...... مکھن لگانا تو اسے کہتے ہیں جب ہم بغیر سوچے سمجھے رسالوں کی تعریف میں زمین آسمان کے

قلابے ملادیں...... جو تحریر ہمیں پسند نہیں آتی، اس پر تنقید بھی کرتے ہیں...... مگر دل توڑنا (رائٹرز کا) ہمیں اچھا نہیں لگتا اس لیے تنقید کریں بھی تو اک طریقے سے کرتے ہیں جس کو آپ کی لینگویج میں شاید مکھن لگانا کہتے ہیں...... اتنی پابندیوں کے باوجود پڑھنا اور پھر خط بھیجنا کیا مکھن لگانا ہے؟ اگر ہے تو...... یوں ہے تو یونہی سہی......

پیاری زینب! پرچا آپ تک تاخیر سے پہنچتا ہے اس لیے آپ کا پچھلے ماہ کا خط شامل اشاعت ہے۔ اپنے بھائی سے کہہ دیں۔ آپ کی دو کہانیوں میں سے ایک کہانی ضرور شائع ہوگی، ان شاء اللہ۔ ایک ضروری بات آپ ایک ہی لفافے میں دو یا دو سے زیادہ کہانیاں بھجوا سکتی ہیں اس سے آپ کا ڈاک خرچ کم ہوجائے گا۔ آپ نے علیحدہ علیحدہ لفافوں میں کہانیاں بھجوائی ہیں۔

فرحانہ مہناز اسلام آباد سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

جناب پورا مہینہ بہت مصروفیت میں گزرا بالآخر آٹھ ماہ بعد میرے بچوں کے ایڈمیشن ہوئے۔ ارحم کا ساتویں میں اور ایپا کا تیسری کلاس کے لیے ٹیسٹ دلوایا۔ دونوں اللہ کے فضل سے ٹیسٹ میں فرسٹ آئیں۔ دراصل ان آٹھ ماہ میں ہم نے بچوں کو گھر پہ دو گھنٹے پڑھایا۔ بیٹے کا بہت ہائی فائی اسکول میں ٹیسٹ دلوایا۔

لیکن اس کا نمبر میرٹ پر نہیں آسکا۔

اسمارٹ سٹی میں مہنگائی اتنی ہے کہ ریٹ پوچھ کر میرے چہرے کی ایکسرسائز ہوتی رہتی ہے۔ کبھی آنکھیں پوری کھل جاتی ہیں تو کبھی بند کبھی ہونٹ سیٹی کی طرح تو کبھی پھیل جاتے ہیں۔

پہلا خط رابعہ خان نے بالکل ٹھیک لکھا۔ ہم نے تو پچھلے شمارے میں معذرت کے ساتھ افسانے کو ناپسند کرلیا تھا ان پر ہی وجاہت کی بار ڈاکٹر فریال کا خط بہت دلچسپ اور اچھا تھا۔

نعیمہ ناز آپ نے کرداروں کو تفصیل کے ساتھ لکھنے کے لیے کہانی آگے بڑھائی شکریہ۔

''شام کی حویلی'' ردا کی موت کا منظر بہت دل ہلا دینے والا تھا۔ آزر کو پشیمان دکھایئے۔

☆ پیاری فرحانہ! مہنگائی کا تو کچھ نہ پوچھیے، دنوں کے حساب سے نہیں گھنٹوں کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، کیا ہو رہا ہے۔

آپ کے بچوں کا اسکول میں ایڈمیشن ہو گیا۔ اب آپ اسلام آباد میں آسانی سے سیٹ ہو سکیں گی۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی بلکہ یوں کہیے کہ ہماری محنت وصول ہوگئی۔

ایک ضروری بات۔ آپ نے خط صفحے کے دونوں جانب لکھا ہے اور سطر بھی نہیں چھوڑی ہے آئندہ خط لکھیں تو خیال رکھیے گا۔

اقرا عزیز جلبانی نے گاؤں دریا خان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

تبصرہ سے پہلے آپ کو ایک بات بتاتی ہوں، وہ یہ کہ مدرسہ کی ایک طالبہ کے توسط سے پتا چلا کہ ڈائجسٹ آئے ہیں پھر کیا تھا، زمین آسمان ایک کردیا۔ کزن کراچی میں جاب کرتا ہے اسے فون کھڑکایا ساتھ میں ناول بھی منگوائے۔

میری بہنوں کے بقول لاک ڈاؤن ملک میں تھا رائیٹروں کے ذہنوں پہ تھوڑی جو کوئی بھی کہانی ڈھنگ کی نہیں لکھی۔ اور ہر دوسرے تیسرے ماہ کسی نہ کسی شمارے میں شاہ چوہدری ملک کی کہانی لگی ہوتی ہے، کیا خوب صورتی، ذہانت، پیسہ، غیرت بس ان ہی ہیرو میں ہوتا ہے جو شاہ، ملک ہو؟ جب سے شمارے پڑھنے لگے ہیں۔ شاہوں، ملکوں کی کہانیاں پڑھتے آئے ہیں۔ اب کسی اور کو موقع دیں۔ کیا کوئی ہیرو جلبانی، نظامانی، پروچ، رند نہیں ہوسکتا؟

خیر میں نے تبصرہ کرنا تھا ستمبر کے شمارے پر۔ خط لکھ کے رکھا کہ صبح بابا سائیں کو دوں گی پھر ایک کیا۔ دوسری، تیسری صبح گزر گئی۔ خط کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔ روہانسی ہو کر بابا کو بتایا کہ ابو میرا خط گم ہو گیا ہے۔ لفافے بھی نہیں ہیں تو بابا نے ہنس کر کہا۔ پتر پھر پرچہ کٹوائیں۔ میں چپ ہوگئی، آپ کو تو میں یاد بھی نہیں ہوں گی پر آپ ہو یا سب بہنیں مجھے یاد تھیں۔ بھئی ام انعام نے یاد نہیں کیا ہوگا بر دعوت دی وہ بھی قبول نہیں کی حالانکہ نوشہرہ اور دریا خان جلبانی۔

اتنا دور نہیں سیدہ بخاری آپ کے والد کا پتا چلا بہت دکھ ہوا۔ اللہ آپ کے بابا کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ماں بھائی اپنی جگہ پر جو باپ ہے نا۔ اس جیسا کوئی نہیں بن سکتا۔ ہمارے بابا ہمارا عشق ہیں ہمارے دوست ہیں۔ پورے خاندان میں ہمیں ہمارے بابا نے پڑھایا۔ گرمی ہو یا سردی ڈائجسٹ لا کر دیے پھر میرا خط پوسٹ کروانے جاتے ہیں سب کی مخالفت اور سخت ماحول کی وجہ سے ہمیں ہمارے بابا کی سپورٹ ہمیشہ ساتھ رہی۔

''سفر'' میں عائشہ کی جدوجہد اچھی لگی۔ ''چھاؤں جیسے لوگ'' بھی اچھی کہانی تھی۔ باقی یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ جو گند ٹک ٹاک نے پھیلایا اس نے تہذیب اور اخلاق کو تباہ کر دیا ہے، زہر لگتے ہیں مجھے ایک ٹک ٹاک بنانے والے دوسرے جو خود کو کتے بلیاں بنا کے اپنی سیلفیاں لیتے ہیں۔ فالج میں اور مکھی کے کاٹنے سے بھی منہ کا زاویہ ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔ جیسے سیلفی والے سیلفی لے کر منہ کا سیٹ ہی بگاڑ دیتے ہیں باچھیں کانوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ شازیہ الطاف مہربانی کریں کچھ چینج لکھیں۔ لاک ڈاؤن میں دو کام کیے ایک سلائی، دوسرا مطالعہ۔ جن میں صلاح الدین ایوبی، تاریخ افغانستان، تاریخ زوال امت اور جلال الدین خوارزم شاہ کتابیں پڑھیں۔ ایک مزے کی بات بتاؤں۔ اب میں جلال الدین خوارزم شاہ کتاب پڑھ رہی تھی تو میری بہن بار بار کام سے کمرے میں آ رہی تھی۔ میں ڈسٹرب ہو رہی تھی جب تیسری دفعہ بہن آئی تو اسے کہا اب کی بار آئی نا ایک کے میں سانس نکالوں گی میں پہلے ہی تاتاریوں کو پڑھ رہی ہوں منگولوں والی فیلنگ آ رہی ہے۔ بہرحال یہ تو میرا اپنی بہن کے ساتھ جوگ تھا۔ پر سچ یہ ہے کہ زندگی وہ تھی، جو نمازیوں شہیدوں کی جہاد میں گزری۔

ج: پیاری اقراء! آپ نے یہ کیسے سوچا، آپ ہمیں یاد نہیں ہوں گی۔ ہم اپنی قارئین کو کیسے بھول سکتے ہیں، بھلا پیار کرنے والے بھی کبھی بھلائے جاتے ہیں ضروری نہیں کہ ہم کسی کو یاد کریں تو اس کا اظہار بھی کیا جائے۔ آپ کے والد واقعی بہت اچھے ہیں، انہوں نے آپ کو تعلیم دلوائی اور آپ کو کبھی لکھنے پڑھنے سے نہیں روکا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ آپ کے سر پر سلامت رکھے۔

ماں، باپ کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ آپ کی شکایت ہم اپنی مصنفین تک پہنچا رہے ہیں، یہ واقعی ناانصافی ہے۔ ہم اپنی مصنفین سے درخواست کریں گے کہ شاہوں، ملکوں کی کہانیوں کے بجائے جلبانی، نظامانی، بروچ اور رند پر کہانیاں لکھیں۔

ٹک ٹاک اور سیلفی کے بارے میں آپ کی رائے سے ہم بھی متفق ہیں، شکلیں بگاڑ کر تصویریں بنانا اور پھر اس کو دوسروں کو دکھا کر ڈرانا ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا۔ منگول اور تاتاری تو بدنام ہیں۔ آج کی مہذب دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس نے منگولوں کی بربریت کو پیچھے چھوڑ دیا۔

☆

واصفہ سہیل

آپ سے جانیے



عبور

رمشا خان کو آپ آج کل کھٹی میٹھی محبت میں دیکھ رہے ہیں اپنے بچپن کے متعلق وہ کہتی ہیں کہ میں آٹھ برس کی تھی جب میرے والد نے میری امی کو طلاق دے دی تھی۔ ہماری والدہ نے جس طرح میری اور میری چھوٹی بہن کی پرورش کی وہ قابل تحسین ہے۔ انہوں نے ہمیں کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ ہمارے والد موجود نہیں۔ ابو سے کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے۔ میری والدہ نے بہت محنت کی ہم بگڑ سکتے تھے لیکن ماں نے بچپن سے ہمارا بہت خیال رکھا۔

شادی کے متعلق رمشا خان کا کہنا ہے کہ وہ شادی کے بعد شوبز چھوڑ دیں گی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے انڈسٹری میں بہترین پانچ سال گزارے لیکن شادی کے بعد میرے لیے کیریئر کو جاری رکھنا مشکل ہوگا (ویسے کہتے تو سب یہ ہی ہیں لیکن پھر کم بیک......)

رمشا خان کو گھریلو کام کاج سے دلچسپی نہیں لیکن اب وہ مزے مزے کی چیزیں بنانا سیکھ رہی ہیں (چیزیں یا کھانا؟) تاکہ شادی کے بعد انہیں ان سب چیزوں پر عبور حاصل ہو۔

افواہ

معروف ایوارڈ یافتہ اداکارہ ریشم کے حوالے سے خبریں سننے میں آرہی تھیں کہ انہوں نے اپنا جیون ساتھی ڈھونڈ لیا ہے اور وہ بہت جلد شادی کرنے والی ہیں۔ تاہم ریشم نے ان سب خبروں کی تردید کردی ہے اور اسے اپنے خلاف پراپیگنڈہ قرار دیا ہے۔ ریشم کا کہنا ہے کہ بعض عناصر ان کی شادی کی خبریں پھیلا کر ان کی شہرت اور عزت کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں (ہائیں! شادی سے عزت کو نقصان...... کچھ سمجھ میں نہیں آیا)

انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے بہت محنت سے انڈسٹری میں مقام بنایا ہے اور وہ ابھی تک انڈسٹری میں محنت کر رہی ہیں۔ اور ان کا پورا کیریئر ان کے مداحوں کے سامنے ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ اس طرح کے فضول بیانات نہیں دیتیں۔

ریشم نے واضح کیا کہ انہوں نے شادی کا اعلان نہیں کیا (تو کیا ہوا؟) اور نہ ہی وہ آئندہ سال میں شادی کرنے جا رہی ہیں یہ صرف افواہیں ہیں (تو آپ اتنا پریشان کیوں؟)

ٹھہراؤ

بڑھتی ہوئی مہنگائی ہوشربا بل۔ پھر نوکریوں کا نہ

ملنا یہ سب ایسے عوامل ہیں کہ انسان میں قوت برداشت کی کمی ہوگئی ہے ذرا سی بات پر لوگ فوراً ری ایکٹ کرتے ہیں۔ اداکار نعمان اعجاز کا اس بارے میں کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے میں صبر و تحمل کا عنصر ختم ہوگیا ہے ایسا لگتا ہے کہ ہمارے ہاں ہر کوئی دوسرے کو کچل کر پہلے پہنچنا چاہتا ہے۔ اگر میڈیا میں تخلیقی لوگ ہوں تو اس کا بہت اہم کردار ہے۔ فلم، ٹی وی، اسٹیج میڈیا کی ہی ایک صورت ہے۔ اس کے ذریعے آپ اپنا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ والد بننے کے بعد میرے اندر ٹھہراؤ آگیا ہے۔



اثاثہ

ماہرہ خان کا شمار پاکستان کی کامیاب ترین اداکاراؤں میں ہوتا ہے وہ سوشل میڈیا سمیت دیگر پلیٹ فارم پر بھی کافی متحرک نظر آتی ہیں اور گاہے بگاہے اپنی تصاویر اور روزمرہ کی سرگرمیاں سوشل میڈیا پر بھی شیئر کرتی رہتی ہیں۔ سعودی عرب کے اخبار گلف نیوز نے دعویٰ کیا ہے کہ اداکارہ ماہرہ خان کے اثاثے 60 لاکھ ڈالرز کے قریب ہیں (ہائیں! یعنی ایک ارب روپے؟)

پاکستان سمیت دنیا بھر میں کافی مشہور ہیں، شائقین کی بڑی تعداد ان کے ڈراموں کو پسند کرتی ہے۔ وہ پاکستان سمیت بولی وڈ فلموں میں بھی کام کرچکی ہیں۔

پہچان

ہمارے ملک میں ایسے اداکاروں کی کمی نہیں جنہوں نے ایک کردار سے زبردست مقبولیت حاصل کی۔ ایسے فنکاروں پر ایک ہی کردار کی چھاپ لگ جاتی ہے۔ جسے خود پر سے اتارنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔

اداکارہ حنا دل پذیر جو اپنے کردار ''مومو'' کے نام سے جانی جاتی ہیں۔ بتایا کہ بلبلے میں مومو کا کردار ایک ہی قسط کے لیے لکھا گیا تھا اور وہ بطور مہمان اداکارہ اس میں بلائی گئی تھیں۔ حنا دل پذیر نے اس کردار کو اپنی بہترین اداکاری سے امر کردیا اور آج ملک کے بچے، بڑے سب اس سے واقف ہیں۔

دس سال پہلے جب حنا دل پذیر کو مومو کے کردار کے لیے منتخب کیا گیا تو کسے پتا تھا کہ یہ کردار اتنا مقبول ہوگا کہ پہچان بن جائے گا۔ حنا دل پذیر اس بارے میں کہتی ہیں کہ مومو کے کردار کو یہاں تک پہنچانے میں پچانوے فیصد حصہ میرا ہے۔ میں نے سیٹ پر جانے سے پہلے نبیل سے کہا تھا کہ مجھے موٹے شیشوں والا چشمہ چاہیے۔ اس وقت میں نے نہیں سوچا تھا کہ اگلے دس سال تک مجھے یہ چشمہ پہننا پڑے گا''

ادھر ادھر سے

مزار پر نعرے لگانا قانوناً جرم ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک ٹک ٹاکر نے مزار قائد پر ہوش ربا رقص کیا تھا جس کی ویڈیو عوام میں خوب وائرل ہوئی۔ اس کے خلاف کارروائی ہوئی یا نہیں، علم نہیں۔

(عبداللہ طارق سہیل، وغیرہ وغیرہ)

امت الصبور



والٹیر

والٹیر کا اصل نام ''فرانسو ماری اروبہ'' ہے۔ ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ رجسٹرار تھا اور ماں ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ والٹیر نے اپنی غصہ والی طبیعت اپنے باپ سے ورثے میں پائی تھی اور ذہانت ماں سے۔

والٹیر کے پیدا ہونے میں اس کی ماں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ وہ جانبر نہ ہوسکی۔ وہ خود بھی ازحد کمزور تھا حتیٰ کہ اس کی دائی نے گود میں لیتے ہی کہہ دیا تھا۔ ''بچہ ایک دن سے زیادہ نہ جیئے گا۔'' لیکن اس کا یہ اندازہ غلط تھا۔ وہ ۸۶ء سال تک زندہ رہا۔ البتہ بیماریوں اور جسمانی تکلیفوں میں ہمیشہ بتلا رہا۔

والٹیر کا ایک بھائی ''ارمان'' بھی تھا جسے آزاد خیالی کے جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ والٹیر کا باپ دونوں لڑکوں کو ''پاگل'' کہا کرتا تھا اسے یقین تھا کہ والٹیر بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ایک دن یہی ''ناکارہ'' پورے یورپ میں سب سے بڑا اہل قلم تسلیم کیا جائے گا۔ والٹیر کی ماں کے انتقال کے بعد اس کا خاندان پیرس چھوڑ کر دیہات میں جا بسا۔ یہاں ایک دولت مند فاحشہ نے والٹیر کو دیکھا اور اس میں آثار ذہانت و نجابت پائے چنانچہ مرنے سے پہلے وہ یہ نیک کام کر گئی کہ دو ہزار فرانک والٹیر کو دے گئی تاکہ اس رقم سے وہ کتابیں خرید سکے۔

والٹیر کو ان کتابوں سے بڑا فائدہ حاصل ہوا اور وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسان مند رہا۔ اس کے علاوہ پادریوں کے پاس دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا۔ یہاں اس نے فن مناظرہ اور علم کلام سیکھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے باپ کی ناراضی کے باوجود اس نے شعر و ادب کا پیشہ منتخب کیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس پیشے کے متعلق خود اس کی (والٹیر) رائے یہ تھی۔

''شعر و ادب کا مشغلہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے بے فائدہ بننا ہو اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سر پر بوجھ بننا چاہتے ہوں، یہ ان لوگوں کا پیشہ ہے جو بھوکا مرجانا پسند کرتے ہیں۔''

۱۷۲۵ء میں والٹیر نے اپنے والد سے علیحدہ ہو کر پیرس میں رہائش اختیار کی۔ اسی زمانہ میں لوئی چہاردہم نے انتقال کیا اور لوئی پانزدہم تخت نشین ہوا۔

بادشاہ کمسن تھا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ والٹیر شورش پسندوں میں داخل ہوگیا اور اپنی بے باکی اور جرأت کی بدولت جلد ممتاز ہوگیا۔ اس کی جرأت کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ نائب سلطنت نے کفایت شعاری کے خیال سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچ ڈالنے کا حکم دیا۔ اس پر والٹیر نے ایک مضمون لکھا۔

''کاش نائب سلطنت آدھے گدھوں کی فروخت کا حکم بھی صادر کردیتے جو حکومت کی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔''

حکام کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو سخت برہم ہوئے۔ ایک دن نائب سلطنت نے والٹیر کو کسی تفریح گاہ میں دیکھا تو اس سے کہا۔

''میں تم سے شرط باندھتا ہوں کہ عنقریب تمہیں ایسی جگہ بھیجوں گا جسے تمہاری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

والٹیر نے تمسخر سے سوال کیا۔ ''وہ کون سی جگہ ہوسکتی ہے؟''

نائب نے کہا۔ ''باسٹل کی تاریک کوٹھریاں۔''

اس گفتگو کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ والٹیر کو قید خانے میں بند کردیا گیا۔ کاش اس وقت کی حکومت کو معلوم ہوتا کہ ایک دن یہی ''باسٹل'' والٹیر کے

پیدا کردہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو کر رہے گا۔ اس وقت تک والٹیر اپنے اصلی نام "فرانسو ماری اروبہ" سے مشہور تھا۔ قید ہونے کے بعد اس نے ایک فرضی نام اختیار کیا جو "والٹیر" تھا۔ فرضی نام اس قدر مشہور ہوا کہ آج کی تاریخ کے سوا کہیں بھی اس کا اصلی نام نہیں مل سکا۔

قید خانے میں ہی اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ہنریاڈ" تصنیف کی۔ یہ دراصل ہنری چہارم کا قصہ تھا جو پہلے پروٹسٹنٹ ہوا تھا پھر دوبارہ کیتھولک ہو گیا اور آخر کار قتل کیا گیا۔ قید خانے میں وہ گیارہ مہینے رہا۔ اس اثناء میں اسے سخت جسمانی تکلیفیں دی گئیں لیکن بعد میں خود نائب سلطنت کو اس پر رحم آ گیا اور اسے عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔

باسٹل سے نجات پانے کے بعد والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما "اوڈیپ" لکھا۔ یہ ایک نہایت ہی درد انگیز قصہ ہے، یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا اور مسلسل پینتالیس دن پیرس کے تھیٹروں میں دکھایا گیا۔ اسی ڈرامے میں اس نے اپنے یہ انقلاب انگیز خیالات ظاہر کیے تھے۔

"ہمارے کاہن (حکام) ویسے نہیں ہیں جیسے سادہ لوح عوام انہیں سمجھتے ہیں۔ ہمیں اپنی قوت پر یقین کرنا اور ایمان لانا چاہیے۔ ہر چیز خود اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہیے، درحقیقت ہماری عقل ہی ہمارا معبود، ہمارا عبادت خانہ اور ہماری کاہن (حاکم) ہے۔"

اسی ڈرامے سے والٹیر نے چار ہزار فرانک حاصل کیے۔ والٹیر کے تمام دشمنوں خصوصاً کلیسائی حریفوں نے بیک زبان کہا کہ......

"شیطان اس کے اندر حلول کیے ہوا ہے۔" چنانچہ سینٹ بوف کا قول ہے کہ "ابلیس اس کے جسم میں ہے۔"

رومیسٹر کہتا ہے کہ "یہ شخص جہنم کی تمام قوتوں اور ہولناکیوں کا مالک تھا۔"

دراصل والٹیر اپنے وقت کا پورا آدمی تھا۔ یورپ کی اٹھارویں صدی کی ادبیات کی سچی تصویر ہم اس فلسفی شاعر میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کی تصانیف میں اس کی جملہ بھلائیاں اور برائیاں دونوں جمع ہو گئی ہیں۔ کبھی وہ نہایت کج خلق، بداطوار، فحاش اور بے اصول نظر آتا ہے۔ والٹیر ایسی ہی متناقص صفات و اخلاق کا مجموعہ ہے۔

والٹیر غضب کا محنتی تھا۔ کام سے کبھی نہیں تھکتا تھا۔ اس کی غیر معمولی چستی کے ثبوت میں خود اس کے اقوال پیش کیے جا سکتے ہیں، وہ کہتا ہے۔

"سستی اور عدم ایک چیز ہے۔" ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

"تمام آدمی اچھے ہیں سوائے ان کے جن کے پاس کرنے کے لیے کوئی کام نہیں۔"

والٹیر اور روسو ان ہی دونوں نے نئے فرانس کی تخم ریزی کی اور وہ سب کچھ مہیا کیا جس کی اس انقلاب میں ضرورت تھی۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا۔

"بوربون (فرانس کا شاہی خاندان) اپنا تخت و تاج محفوظ رکھ سکتا تھا، اگر والٹیر اور روسو کا منہ بند کر دیتا۔"

ایک موقع پر والٹیر نے کہا۔ "جب قوم سوچنے لگ جائے تو منزل مقصود تک پہنچنے سے اسے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے۔"

والٹیر کے ظہور کے ساتھ ہی فرانس نے سوچنا شروع کیا اور دنیا کی کوئی طاقت بھی اسے آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔

کسی مصنف کو کبھی اپنے عہد میں اتنا اقتدار حاصل نہیں ہوا جتنا والٹیر نے حاصل کیا تھا۔ تمام جہاں اس کا مخالف تھا۔ کلیسا جو اس وقت کی سب سے بڑی

قوت تھی۔ والٹیئر کی دشمن تھی۔ حکومت خون کی پیاسی تھی۔ اسے قید کیا۔ جلاوطن کیا گیا۔ اس کی کتابیں روکی گئیں، جلائی گئیں حتیٰ کہ چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے والوں تک کو سزا دی گئی مگر والٹیئر کے عزم و ہمت میں فرق نہ آیا۔ وہ تمام دشمنوں پر غالب آیا۔ تمام مشکلات پر فتح مند ہوا۔ اس نے ہمیشہ حق و حقیقت کا اظہار کیا اور دنیا کی گردنیں اس کے علمی و عقلی جبروت کے آگے جھک گئیں۔ کہاں تو اسے ذلیل سمجھا جاتا تھا اور کہاں پھر یہ ہوا کہ بادشاہ، شہنشاہ اور روم کے پوپ تک اس کی خوشامدیں کرنے لگے۔ اس کی ہیبت سے لرز اٹھے۔ پاپاؤں کی روحانی گدی اور بادشاہوں کے زریں تخت ہلنے لگے۔ آدھی دنیا نے اس ساحر کے لیے اپنے کان کھول لیے اور اس کی زبان و قلم کا ہر لفظ باشندگان یورپ کے دلوں میں اتر گیا۔ قدرت نے اس کی عمر میں برکت دی۔ وہ چھیاسی سال زندہ رہا۔ قدیم نظام کی خرابیاں معلوم کیں اور ان کے خلاف جہاد کیا اور جب مرا تو فتح مند تھا۔

(مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''تاریخی شخصیتیں'' سے انتخاب)

زین آبادی

ایک دن اورنگ زیب برہان پور کے باغ آہو خانہ میں چہل قدمی کر رہا تھا اور خان زمان کی بیوی یعنی اس کی خالہ بھی اپنی خواصوں کے ساتھ سیر کے لیے آئی ہوئی تھی۔ خواصوں میں ایک خواص زین آبادی تھی جو نغمہ سنجی میں سحر کار اور شیوہ دل ربائی و رعنائی میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی۔

سیر و تفریح کرتے ہوئے یہ پورا مجمع ایک درخت کے سائے میں سے گزرا جس کی شاخوں میں آم لٹک رہے تھے۔ جوں ہی مجمع درخت کے نیچے پہنچا زین آبادی نے نہ تو شہزادے کی موجودگی کا کچھ پاس لحاظ کیا نہ اس کی خالہ کا، بے باکانہ اچھلی اور ایک شاخ بلند سے ایک پھل توڑ لیا۔

خان زمان کی بیوی پر یہ شوخی گراں گزری اور اس نے ملامت کی تو زین آبادی نے ایک غلط نظر شہزادے پر ڈالی اور پشواز سنبھالتے ہوئے آگے نکل گئی۔

یہ ایک غلط انداز نظر کچھ ایسی قیامت کی تھی کہ اس نے شہزادے کا کام تمام کر دیا اور صبر و قرار نے خدا حافظ کیا۔ بڑی منت و الحاح کر کے اپنی خالہ سے زین آبادی کو حاصل کیا اور باوجود اس زہد خشک اور خالص تقشف کے جس کے لیے اس عہد میں بھی مشہور ہو چکا تھا۔

اس کے عشق و شگفتگی میں اس درجہ بے قابو ہو گیا کہ اپنے ہاتھ سے شراب کا پیالہ بھر بھر کر پیش کرتا اور عالم نشہ و سرور کی رعنائیاں دیکھتا۔ کہتے ہیں کہ ایک دن زین آبادی نے اپنے ہاتھ سے جام لبریز کر کے اورنگ زیب کو دیا اور اصرار کیا کہ لبوں سے لگا لے۔

شہزادے نے ہر چند عجز و نیاز کے ساتھ التجائیں کیں کہ میرے عشق و دل باختگی کا امتحان اس جام کے پینے پر موقوف نہ رکھو لیکن اس کو رحم نہ آیا۔ ناچار شہزادے نے ارادہ کیا کہ پیالہ منہ سے لگا لے لیکن جوں ہی اس فسوں ساز نے دیکھا کہ شہزادہ بے بس ہو کر پینے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

فوراً پیالہ اس کے لبوں سے کھینچ لیا اور کہا۔ غرض امتحان عشق بود نہ کہ تلخ کامئ شما۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ شاہ جہان تک خبریں پہنچنے لگیں اور وقائع نویسوں کی فردوں میں اس کی تفصیلات آنے لگیں۔

داراشکوہ نے اس حکایت کو اپنی سعایت و غمازی کا دست مایہ بنایا۔ وہ باپ کو بار بار توجہ دلاتا۔ نہیں معلوم قضیے کا غنچہ کیونکر کھلتا لیکن قضا و قدر نے خود ہی فیصلہ کر دیا۔ یعنی عین عروج شباب میں زین آبادی کا انتقال ہو گیا۔ اورنگ آباد میں بڑے تالاب کے کنارے اس کا مقبرہ آج تک موجود ہے۔

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

میتھی آلو

اجزاء:

آلو	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
لہسن	تین جوئے
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
ثابت سرخ مرچ	آٹھ سے دس عدد
نمک	حسب ضرورت
پسی ہلدی	ایک چٹکی
میتھی	ایک کپ
ٹماٹر	دو عدد

ترکیب:

میتھی آلو بنانے کے لیے سب سے پہلے کڑاہی گرم کریں، اس میں تیل یا گھی ڈالیں، جب وہ گرم ہوجائے تو اس میں لہسن، زیرہ، ثابت لال مرچ، میتھی کے پتے، ٹماٹر، نمک اور پسی ہلدی ڈال کر اچھی طرح پکائیں۔

جب تمام چیزیں یک جان ہوجائیں تو پھر اس میں ایک ہی سائز کے کٹے ہوئے آلو شامل کردیں اور اسے ڈھکن ڈھک کے ہلکی آنچ پر آلو گلنے تک پکائیں۔ جب تیل مسالے سے الگ ہوجائے اور آلو بھی اچھی طرح گل جائیں تو چولہا بند کردیں۔ مزیدار آلو میتھی تیار ہے۔

کوئلہ دم قیمہ

اجزاء:

چکن کا قیمہ	آدھا کلو
نمک	حسب ضرورت
ادرک لہسن کا پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی سرخ مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بھنا کٹا زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
گرم مسالہ پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
باربی کیو ساس	دو کھانے کے چمچے
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

قیمے کو اچھی طرح دھو کر اس کا پانی نکلنے دیں۔ کسی برتن میں ڈال کر اس میں نمک، ادرک لہسن، لال مرچ، سرکہ اور چار کھانے کے چمچ تیل ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور اسے دس سے پندرہ منٹ کے لیے میرینیٹ کرنے کے لیے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں تھوڑا سا تیل ڈالیں اور اسے گرم کریں، پھر اس میں قیمہ ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہونے پر آجائے تو اس میں زیرہ اور گرم مسالا ڈال کر اسے مزید دو سے تین منٹ اچھی طرح پکائیں۔ پھر اس میں باربی کیو ساس یا مسالا ڈال کر اوپر ایک دہکتا ہوا کوئلے کا ٹکڑا رکھ دیں اور ساتھ ہی ایک کھانے کا چمچہ تیل ڈال کر پانچ سے سات منٹ تک ڈھکن ڈھک کر رکھ دیں۔ جب قیمے میں تمام مسالے رچ بس جائیں تو چولہا بند کردیں۔ چاہیں تو اسے ہرا دھنیا اور ہری مرچیں کاٹ کر گارنش کریں۔ کوئلہ دم قیمہ تیار ہے۔

ویجی ٹیبل فرائڈ رائس

اجزاء:

تیل	دو کھانے کے چمچے
لہسن ادرک	دو چائے کے چمچے
ہری پیاز	آدھا کپ
گاجر	آدھا کپ

بند گوبھی — آدھا کپ
شملہ مرچ — ایک عدد
سویا ساس — ایک کھانے کا چمچہ
سرکہ — ایک کھانے کا چمچہ
باسمتی چاول — ایک کپ

ترکیب:

کسی دیگچی میں تیل ڈالیں، اسے گرم کرلیں، جب تیل اچھی طرح گرم ہوجائے تو اس میں پسا لہسن ادرک ڈالیں، ان دونوں کو ہلکا سا فرائی کریں تاکہ ان کی رنگت تبدیل ہوجائے پھر اس میں ہری پیاز، گاجر، بند گوبھی اور شملہ مرچ ڈال دیں۔ ان تمام چیزوں کو چمچے کی مدد سے ہلاتی جائیں۔ تاکہ سب چیزیں یک جان ہوجائیں۔ جب یہ تمام سبزیاں نرم ہونے لگیں تو اس میں حسب ذائقہ نمک شامل کریں، اس کے بعد اس میں سویا سوس اور سرکہ شامل کریں۔ آنچ کو ہلکا کردیں اور تمام چیزوں کو اچھی طرح پکنے دیں۔ ابلے ہوئے چاولوں کو ابال لیں، اب سبزی والی دیگچی میں ایک کپ چاول شامل کریں اور اسے اچھی طرح سبزیوں کے ساتھ مکس کریں۔ تھوڑی دیر ڈھکن ڈھک کر دم دیں۔ دو منٹ بعد چولہا بند کردیں۔ مزے دار رائس تیار ہیں۔

چکن پائن ایپل

ضروری اشیاء:

چکن — ایک کپ
پائن ایپل کے ٹکڑے — ایک کپ
پائن ایپل جوس — آدھا کپ
شملہ مرچ — دو
پسی لال مرچ — چوتھائی چائے کا چمچہ
کیچپ — ایک کپ
کارن فلور — دو کھانے کے چمچے
یخنی یا پانی — ایک کپ

ترکیب:

چکن کو چوکور کاٹ لیں اس کے بعد اس میں آدھا چائے کا چمچہ ادرک لہسن پسا ہوا، سرکہ دو کھانے کے چمچے، سویا ساس دو کھانے کے چمچے، نمک حسب ذائقہ، کالی مرچ چوتھائی چائے کا چمچ ملا کر پندرہ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ تیل گرم کریں اس میں شملہ مرچ چوکور کاٹ کر فرائی کریں۔ دوسری پتیلی میں تیل گرم کریں۔ چکن فرائی کریں اور گرلڈ کرلیں اس میں تلی ہوئی شملہ مرچ، کیچپ، پائن ایپل سیرپ ڈال کر دو، تین منٹ پکائیں پھر اس میں کارن فلور گھول کر ڈال دیں اور گاڑھا کریں۔ آخر میں پائن ایپل ڈال دیں اور چولہے سے ہٹا کر سادے چاول یا چائنیز رائس کے ساتھ سرو کریں۔

میکرونی فروٹ ویجی ٹیبل

میکرونی — ایک کپ
پائن ایپل — آدھا کپ
کینو — ایک کپ
اسٹار فروٹ — دو عدد
تیل — دو کھانے کے چمچے
گاجر — ایک عدد
مکھن — ایک چائے کا چمچہ
شملہ مرچ — ایک عدد
نمک — حسب ذائقہ
پسی سیاہ مرچ — آدھا چائے کا چمچہ
لہسن — ایک چائے کا چمچہ
سرکہ — ایک کھانے کا چمچہ
کیچپ — دو کھانے کے چمچے
ہری پیاز — آدھا کپ

میکرونی کو ابال لیں، پائن ایپل، کینو، اسٹار فروٹ کو کاٹ لیں۔

ایک ساس پین میں تیل اور مکھن گرم کرکے اس میں لہسن ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں گاجر، شملہ مرچ، نمک، پسی سیاہ مرچ، سرکہ اور میکرونی ڈال کر مکس کریں۔ پائن ایپل، اورنج، اسٹار فروٹ، ہری پیاز، کیچپ بھی شامل کردیں اور سرونگ پلیٹ میں نکال کر پیش کریں۔

☆

ادارہ



خشک موسم میں جلد کو تر و تازہ رکھیں

موسم سرما میں خشک ، پژمردہ جلد کو تر و تازہ رکھنے کے لیے موئسچرائزر کا استعمال کریں۔ موئسچرائزر استعمال کرنے کا بہترین وقت گرم پانی سے غسل یا اسٹیم باتھ لینے کے بعد کا ہے کیونکہ اس وقت جلد کے مسامات اپنی آخری حد تک کشادہ ہوتے ہیں۔ موئسچرائزر میں موجود حسن افزاء اجزا انتہائی سرعت کے ساتھ ان کھلے ہوئے مسامات کے ذریعے جلد میں اتر کر جذب ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا موسم سرما میں غسل لینے یا منہ دھونے کے بعد اس کے مکمل طور پر خشک ہونے سے پہلے ہی موئسچرائزر لگائیں۔

جلد کو تر و تازہ و خشکی سے پاک رکھنے کے قدیم نسخے

دودھ کی بالائی خشک و پپڑی زدہ جلد کو نرم و ملائم بنانے میں جادوئی اثرات رکھتی ہے۔ بالائی میں چند قطرے گلیسرین، چند قطرے کیسٹر آئل اور چند قطرے عرق گلاب کے ملا کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پہ لگائیں۔ اس سادہ اور آسان سی سنگھاری حکمت عملی کے شاندار نتائج آپ کو حیران کر دیں گے۔ خالص دودھ کی بالائی لگا کر تقریباً تیس چالیس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد کسی اچھے بیوٹی سوپ سے چہرہ دھولیں جس سے آپ کی جلد کے خشک حصے — نم آلود اور چکنے چکنے محسوس ہونے لگیں گے ہلکے جلد کی چمک و خوب صورتی بھی نمایاں ہو جائے گی۔

سردیوں میں اکثر خشک جلد خارش و سوزش زدہ ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال پہ قابو پانے کے لیے کسی نرم سوتی کپڑے کو کچے دودھ میں ڈبو کر فریج میں رکھ دیں اور ہلکا سا نچوڑنے کے بعد اس کپڑے کو متاثرہ جلد پہ رکھ کر چند منٹوں تک آرام سے بیٹھیں، اس کے بعد دوبارہ یہ عمل دہرائیں۔

کیلے کا فیس پیک

سردیوں میں خشک و تڑختی ہوئی جلد کو چمک دار و شگفتہ بنانے کے لیے کیلے کی مدد سے تیار شدہ فیس پیک کریمز کے جادوئی اثرات پر دنیا کے تمام ہربل بیوٹی ایکسپرٹس من و عن یقین رکھتے ہیں۔ خوب اچھی طرح پکے ہوئے کیلوں کو میش کر کے اس میں خالص بالائی شامل کر کے اس فیس پیک کو جلد پر بیس سے پچیس منٹ کے لیے لگائیں۔ اس کے علاوہ میش کیے ہوئے کیلوں کے مکسچر میں اگر شہد شامل کر لیا جائے اور اسے پھٹی ہوئی ایڑیوں اور کہنیوں پہ لگایا جائے تو یہاں کی جلد نرم و ملائم اور چمک دار و لچک دار ہو جائے گی۔

روغن بادام

روغن بادام سردیوں کے موسم میں سرد و خشک ہواؤں سے جلد کو تحفظ فراہم کرنے والے ایک کلیدی محرک کی حیثیت رکھتا ہے۔ جلد کی نمی محفوظ رکھنے کے لیے ایسا فیس ماسک جو بادام، ملائی اور شہد کو ملا کر تیار کیا گیا ہو اسے ہفتے میں دو مرتبہ استعمال کریں۔ یہ ماسک جلد پر تقریباً آدھے گھنٹے تک لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد دھو کر جلد کو صاف کر لیں۔ آپ کی جلد پوری سردیوں کے موسم میں نرم و ملائم اور تر و تازہ دکھائی دے گی۔

روغن زیتون

اسی طرح روغن زیتون بھی خشک جلد کی پژمردگی دور کرنے میں ایک کرشماتی جز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خالص زیتون کے تیل کی مدد سے خشک جلد پہ ملاحت کے ساتھ مساج کریں اس کی اینٹی آکسیڈنٹ خوبیوں سے بھرپور صحت بخش چکنائی خلیات کی کھوئی ہوئی لچک وتازگی بحال کرنے کے ساتھ ساتھ سرد و خشک موسم میں جلد کی نمی ختم ہونے کے عمل پر بھی فل اسٹاپ لگادے گی۔

ایلوویرا

خشک جلد کو نم آلود و تر وتازہ بنانے کی غرض سے ایلوویرا جیسی حسن افزاء قدرتی پروڈکٹ کے کمالات سے ایک جہان واقف ہے۔ یہ جلد کے خشک و مردہ خلیات صاف کرنے اور زندگی سے بھرپور نئے خلیات میں اضافے کے عمل کو تیز تر بنانے میں معاونت کرتا ہے۔

اس کا استعمال نہایت سادہ اور آسان ہے۔ ایلوویرا کے پتوں کو لیں، اسے چھری کی مدد سے دولخت کریں اور پتوں کے درمیان موجود جیل کو چمچے کی مدد سے نکال کر جلد پہ لگائیں۔ اس انمول قدرتی ہربل پروڈکٹ کے کرشمے آپ کی توقع سے بڑھ کر ثابت ہوں گے۔ ایلوویرا پہ مشتمل بیوٹی پروڈکٹس مارکیٹ میں بھی باآسانی دستیاب ہیں۔

انڈا اور شہد

انڈے کی زردی میں شہد ملا کر تیار کیا جانے والا ماسک بھی جلد کی خشکی دور بھگانے کے سلسلے میں آپ کا معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ جلد کو موئسچرائز کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی نگہداشت کے حوالے سے سنگھاری ماہرین کے مطابق ایک بہترین ہربل پروڈکٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔

موسم سرما میں حفاظت جلد کے نسخے

شاور کے نیچے زیادہ دیر کھڑے رہنے سے گریز کریں اور تیز گرم پانی کے بجائے ہلکے نیم گرم پانی کا استعمال بہترین ہے کیونکہ تیز گرم پانی جلد کی قدرتی نمی و چکنائی تیزی سے اڑا کر اسے انتہائی خشک، پژمردہ اور خارش زدہ بنا دیتا ہے۔

خشکی سے لڑنے کا بنیادی اصول یہ ہے کہ آپ موئسچرائزر کو اسی وقت فوری طور پر اپنی جلد پر لگالیں جبکہ ابھی وہ نم حالت میں ہی ہو۔

دھوپ جلد کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتی ہے لہٰذا اگر سخت سردیوں کی گلابی دھوپ آپ کو اچھی لگتی ہے تو اس میں دن بارہ بجے سے پہلے ہی بیٹھیں۔

ہمیشہ صحت بخش، تازہ اور بہترین غذائیں کھانے پہ توجہ دیں۔ ایسی غذائیں جو وٹامنز، منرلز، پروٹین، کاربوہائیڈریٹس اور اینٹی آکسیڈنٹس جیسی خصوصیات سے بھرپور ہوں، ضرور استعمال کریں۔

وٹامن، اے، بی، بی ٹو، ای اور وٹامن ڈی کے ساتھ اومیگا تھری فیٹی ایسڈز پہ مشتمل غذائیں بھی جلد کی خشکی و پژمردگی کا خاتمہ کرکے اسے جواں، لچکدار، تر وتازہ و گداز بنانے میں آپ کی معاونت کرتے ہیں۔

سرد موسم میں چونکہ ہمیں گرمیوں کی نسبت پیاس کی شدت شاذ ہی ستاتی ہے لیکن اس کے باوجود یومیہ کم از کم آٹھ گلاس پانی کا استعمال آپ اپنی روٹین کا ناگزیر حصہ بنالیں۔

☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... ثناء امجد

میک اپ ---- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ---- موسیٰ رضا